نوادراتِ ادب

معین الدین عقیل

ہدیۂ علمی بخدمت:
اقبال مجددی صاحب
منجانب: ڈاکٹر معین الدین عقیل
لاہور
اگست ۱۹۹۷

نوادراتِ ادب

ڈاکٹر معین الدین عقیل

بار اوّل : ۱۹۹۷ء
ناشر : سیّد وقار معین
طابع : زاہد بشیر پرنٹرز
قیمت : ۲۹۵/ روپے
اعلیٰ قسم :

مندرجات:

انتساب :

سلیم الدین قریشی

(لندن)

کے نام :

ہر باد کہ از سوے بخارا بہ من آید
زو بوے گل و مشک و نسیم سمن آید

معروضہ :

یہ مجموعہ میرے ان مقالات پر مشتمل ہے، جو گزشتہ ربع صدی کے عرصے میں ملک و بیرونِ ملک کے مختلف مجلوں میں شائع ہوئے۔ اب یہ کسی ترمیم کے بغیر شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے متعدد مقالات اور موضوعات اس عرصے میں منظرِ عام پر آنے والی تحقیقات اور معلومات کی روشنی میں متعدد مقامات پر اضافوں یا تبدیلیوں کے متقاضی تھے، لیکن آج جب تحقیق اس قابل ہو چکی ہو کہ ــــ کتاب ابھی پریس میں ہوتی ہے کہ اپنی تحقیق و معلومات کے لحاظ سے پرانی ہو جاتی ہے، چنانچہ ایسے مقامات معلومات کی آئے دن کی فراوانی کے لحاظ سے ہمیشہ ہی تشنگی کا احساس دلاتے رہیں گے۔ لہٰذا یہ مقالات ــــ بصد عجز و نارسائی ــــ بعینہٖ پیشِ خدمت ہیں۔

اس مجموعے کو پیش کرنے میں میرے دیرینہ کرم فرماؤں پروفیسر سوزو کی تاکیشی (پروفیسر ایمریطس، جامعہ ٹوکیو برائے مطالعات خارجی، جاپان) ــــ اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (پروفیسر، صدر شعبۂ اُردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، گورنمنٹ کالج، لاہور)

کا تعاون اور محبتیں مختلف صورتوں میں حاصل رہی ہیں ــــ اور میری جانب سے شکر گزاری کی مستوجب ہیں۔

ٹوکیو : ۲۳ر مارچ ۱۹۹۷ء

دیوانِ ولی پر اب تک خاصہ موقر کام ہو چکا ہے اور خصوصاً" متعدد قلمی نسخے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ یہ تعداد اُردو کے کسی بھی شاعر کے دیوان کے قلمی نسخوں سے زیادہ ہے[۱]۔ ان میں سے بعض نسخے اپنی خاص اہمیت کے حامل ہیں؛ لیکن جس قلمی نسخے کا ہم اس وقت تعارف کرا رہے ہیں وہ اپنی بعض خصوصیات کے سبب اپنی ایک علیحدہ حیثیت رکھتا ہے۔

دیوانِ ولی کا یہ قلمی نسخہ راقم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ امتیاز گڑھ (ادونی) میں لکھا گیا تھا۔ ترقیمہ میں کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ ترقیمہ کی عبارت یہ ہے -:

"درماہ ربیع الاول بتاریخ بست و یکم ماہ مذکورہ بروز چہار شنبہ بکونیم پاس روز بر آمد۔ در قلعہ ادھونی عرف امتیاز گڑھ۔ در ۱۱۵۹ھ تمام سنۂ ہجری۔"[۲]

نسخہ جگہ جگہ سے کرم خوردہ ہے اور بعض مقامات پر بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ ترقیمہ کے سنہ میں دہائی کا عدد کرم خوردگی کا شکار ہے اور اب اس سنہ کے باقیماندہ اعداد اس ترتیب سے پڑھنے میں آتے ہیں۔ ۱۱۹ھ۔ راقم کو پہلے پہل یہ گمان گزرا تھا کہ کسی نے "مصلحتہ" دہائی کے عدد کو مٹانے کی خاطر ایسا کیا ہے' لیکن

واقعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرم خوردگی ہی کا نتیجہ ہے۔ قمری جنتری کے مطابق بارہویں صدی میں اکیس ربیع الاول چہار شنبہ کے دن ۱۱۱۹ھ اور ۱۱۵۹ھ میں پڑتی ہے۔[۳] ۱۱۱۹ھ اس وجہ سے اس کی کتابت کا سنہ نہیں ہو سکتا کہ اس نسخہ کے آخر میں ایک مثنوی بعنوان "مثنوی درد" تحریر ہے' جو فی الحقیقت محمد فقیہہ دردمند کا ساقی نامہ ہے۔ یہ ساقی نامہ' جس کا ذکر مناسب موقع پر آگے آتا ہے' ۱۱۳۶ھ اور ۱۱۵۹ھ کے درمیان کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ مخطوطہ میں الفاظ کی بعض تبدیل شدہ صورتیں موجود ہیں جو ۱۱۵۹ھ کے آس پاس کے رقم شدہ نسخوں میں ملتی ہیں۔ اس بناء پر راقم کا یہ خیال حقیقت سے قریب ہے کہ یہ مخطوطہ ۱۱۵۹ھ کا مرقومہ ہے۔

تقطیع ۴٫۳ ۵x۷ انچ ہے۔ کاغذ انتہائی قدیم دولت آبادی ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں دبیز کاغذ استعمال کیا گیا ہے' جو اب زردی مائل ہو چکا ہے۔ فی صفحہ ۱۳ سطریں ہیں۔ اوراق کی تعداد ۱۳۵+۶ ہے۔ ورق ۱۳۵' ب پر دیوان ولی ختم کر دیا گیا تھا لیکن ترقیمہ کے نیچے ایک مثنوی' جو دراصل "ساقی نامہ دردمند" ہے' بعنوان "مثنوی درد" شروع کی گئی ہے۔ جو بعد کے ۶ اوراق پر' جن پر نمبر شمار درج نہیں ہیں' تحریر ہے۔ اگر اوراق کی مجموعی تعداد شمار کی جائے تو یہ نسخہ ۱۴۱' الف اوراق پر مشتمل ہے۔ سارا نسخہ ایک خط میں سیاہ روشنائی سے صاف اور واضح لکھا گیا ہے۔ خط نستعلیق ہے جو کہیں کہیں شکست آمیز ہے۔

غزلیات کے حصہ میں "ولہ" اور دیگر اصناف کے عنوانات اور ان کے درمیان "ایضاً" شنگرفی روشنائی سے تحریر کیے گئے ہیں۔ غزلوں کو شمار کیا گیا ہے اور ہر غزل کا نمبر شمار بھی شنگرفی ہے۔ کہیں کہیں کسی شعر میں اصلاح کی گئی ہے۔ یا تو الفاظ تبدیل کیے گئے ہیں یا املا کی صحت کی گئی ہے۔ اصلاح شدہ الفاظ حاشیوں میں لکھے گئے ہیں جن لفظوں کی اصلاح کی گئی ہے ان پر شنگرفی روشنائی سے خط کھینچا گیا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ غزلوں کے نمبر شمار اور اصلاح طلب الفاظ پر

شنگرفی خط بعد میں کسی اور نے اضافہ کئے ہیں۔ کیونکہ جو قلم استعمال کیا گیا ہے وہ دوسرا ہے اور روشنائی بھی اتنی قدیم نہیں جتنی کہ متن کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

آج کے مقابلہ میں املا کے تعلق سے اس نسخہ میں وہی فرق نظر آتا ہے جو دسویں، گیارہویں صدی سے چل کر بارہویں صدی تک برعظیم کے کاتبوں کے قلم سے رائج رہا ہے۔ اکثر الفاظ ایک دوسرے سے ملا کر لکھے گئے ہیں۔ الفاظ کو علیحدہ علیحدہ بھی لکھ دیا ہے۔ جیسے کہول نا (کھولنا)۔ عام طور پر یائے مجہول کو یائے معروف کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ جہاں یائے معروف کی ضرورت تھی، بعض اوقات وہاں یائے مجہول استعمال کی گئی ہے اور نیچے دو نقطے لگائے گئے ہیں۔ دو چشمی ھ کا استعمال کہیں نہیں کیا گیا۔ گ، کو ہمیشہ ک، لکھا گیا ہے۔ بعض جگہ، اصلاح کے باوجود، املا کی غلطیاں موجود ہیں۔ ان غلطیوں میں عام طور سے یہ غلطیاں نظر آتی ہیں۔ سہبا (صہبا)، حنسی (ہنسی)، مسنوی (مثنوی)، علم (الم)، وادہَ حقیقی (وادیِ حقیقی) وغیرہ۔

راقم نے کچھ ماہ قبل یہ نسخہ کراچی میں نادر کتابوں کے ایک تاجر سے خریدا ہے۔ نسخہ کے آخری مکتوبہ ورق (۱۴۱، الف) پر نیلی روشنائی سے شاید کسی مہر کو چھاپا گیا ہے، جو بیضوی شکل کی معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ کسی کتب خانہ کی ملکیت رہا ہو۔ دیوان ورق ۱، ب سے شروع ہوتا ہے۔ ورق ۱، الف کی پیشانی پر "دیوان ولی" اسی قلم سے لکھا گیا ہے، جو متن کے لئے استعمال ہوا ہے۔ پیشانی ہی پر "دیوان ولی" کے دونوں جانب سالنامے کے دو جدول بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سولہ سولہ خانے ہیں۔ دائیں جدول میں حروف تہجی - ح، د، ب کو ایک ایک خانہ میں مختلف ترتیب سے لکھا گیا ہے اور بائیں جانب کے جدول میں اعداد ۲، ۴، ۶، ۸ کو اسی طرح مختلف ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ لیکن موخر الذکر جدول کاغذ کے ٹھپے کی وجہ سے ترچھے رخ پر مثلث کی شکل میں آدھا ضائع ہو گیا ہے۔ اور اب اس میں صرف دس خانے موجود ہیں۔ اسی صفحہ کے وسط میں

بائیں جانب "سید محمد علی ملیح آبادی" کے دستخط ہیں۔ دستخط میں "سید محمد" صاف اور واضح نہیں ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں کچھ اور لکھا ہو۔ دستخط کے لئے جو روشنائی استعمال کی گئی ہے وہ سرخ ہے اور قدیم معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ جگہ جگہ سے اڑ گئی ہے۔ دیوان مکمل حالت میں ہے اور اسے قدرے کرم خوردگی کے علاوہ کوئی اور نقصان نہیں پہنچا ہے۔

دیوان کی ابتدا غزلیات سے ہوتی ہے۔ ان کو ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔ اس مخطوطہ میں شامل اصناف کی تعداد حسب ذیل ہے۔

غزلیات	۳۹۱	ورق ا' ب تا ۱۱۸' الف
قصیدہ	۱	ورق ۱۱۸' الف تا ۱۱۹' الف
مستزاد	۴	ورق ۱۱۹' ب تا ۱۲۱' الف
مخمسات	۱۱	ورق ۱۲۱' الف تا ۱۲۸' ب
مثنوی	۱	ورق ۱۲۸' ب تا ۱۳۱' الف
ترجیع بند	۱	ورق ۱۳۱' ب تا ۱۳۳' ب
رباعیات	۲۰	ورق ۱۳۳' ب تا ۱۳۵' الف
فردیات	۲	ورق ۱۳۵' الف تا ۱۳۵' ب

ردیف کے اعتبار سے غزلیات کی تعداد حسب ذیل ہے۔

ا=۸۱ ـ ب=۵ ـ ت=۹ = ث=۱ ـ ج=۵ ـ ح=۱ ـ خ=۲ ـ د=۷ ـ ذ=۱ ـ ر=۲۰ ـ ز=۲ ـ ش=۱ ـ ض=۳ ـ غ=۱ ـ ف=۳ ـ ل=۱۵ ـ م=۹ ـ ن=۱۷ـ و=۱۲ ـ ہ=۱ ـ ی=۱۲۹

ردیف ا' کے ذیل میں ۸۰ غزلیات ہیں۔ لیکن ایک غزل ردیف ن' کے ذیل میں ورق ۵۳' الف تا ۵۳' ب پر تحریر ہے۔ اس طرح مخطوطہ میں ردیف الف کی جملہ ۸۱ غزلیات ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

کہتا ہوں تری نام کون میں ورد زبان کا کہتا ہوں تری شکر کون عنوان بیان کا

(ورق ا' ب)

اور آخری غزل کا مطلع یہ ہے۔

دیکھا ہوں جسی وو مبتلاہیی
خوبانکی نگاہ نین بلا ہے

(ورق ۱۱۸، الف)

حصہ غزلیات کے بعد نعتیہ قصیدہ ہے۔[۵] اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

عشق میں لازم ہیی اول ذات کون فانیکری
ہو فنا فی اللہ دایم یاد یزدانی کری

(ورق ۱۱۸، الف)

پہلے مستزاد کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

کہتا ہوں[۶] نظر جب ستی اوس رشک پری پر گویا[۷] ہی چمن میں[۸]
باندیا[۹] ہی جو کوئی جیو کون تجہ سیم بری پر[۱۰] پہرتا ہی وو بن میں

(ورق ۱۱۹، ب)

اور چوتھے مستزاد کے آخری اشعار یہ ہیں۔

فرہاد کی آتی ہی سدا روح صبا مجہ شعر کون سنے[۱۱]
مذکور ہیی از بسکہ ولی میری سخن میں شیریں سخناں[۱۲] کا

(ورق ۱۲۱، الف)

پہلا مخمس۔

صنم میرا سخن سی آشنا ہیی مجیی فکر سخن کرنا بجا ہیی

سخنداں آشنا فضل خدا ہیی نہ تنہا حسن خوباں دلربا ہیی
ادا فہم[۱۳] و سخن دانی بلا ہیی[۱۴]

(ورق ۱۲۱، الف)

آخری مخمس۔

سدا دلمیں ہیکا ہوس سونے کہانیکا[۱۵]
پہری اس فکر میں نسان ہواندہا بیل کہانیکا
اری بہوش اکر کچہ اندیشہ نہاں جانیکا[۱۶]
عبث غافل ہوا ہی فکر کر کچہ ہو کے پانیکا
صفا کر آرسیں دلکیں سکندر ہوزمانیکا

(ورق ۱۲۸، الف)

مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

الٰہی عشقمیں عشاق کر مجہ
اپسکی[۱۷] شوق کا مشتاق کر مجہ

(ورق ۱۲۸، ب)

ترجیع بند اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

مرید لمین دو سروکل نام ہی
کہ جس شوخ کا خوش ادا نام ہیں

(ورق ۱۳۱، ب)

ترجیع بند کے بعد رباعیات شروع ہوتی ہیں۔ پہلی رباعی درج ذیل ہے۔

رکہ دہیان کون براں توں معبود ہر طرف
رکہ سیس کون ہر حالمین مسجود ہر طرف
معدوم کون موجود سون کیں[۱۸] نسبت ہیں
اول[۱۹] ہیں کہ مایل ہو تون موجود طرف

(ورق ۱۳۳، ب)

رباعیوں میں ایک رباعی "کلیات ولی" کی غزل (۳۹۰) کے پہلے دو اشعار پر مبنی ہے[۲۰] مخطوطہ میں دو فردیات ہیں، جو یہ ہیں ۔

دیکھا نہیں کسی نے دن راتمین ا.ہو تلک[۲۱] مہتاب کے اجالے میں آفتاب دیکھا

(ورق ۱۳۵، الف)

دونو بھوانکی میانی ٹیلا[۲۲] نہیں جر تیکا[۲۳] جوں قوس کے برج میں جمل کار مشتریکا

(ورق ۱۳۵، ب)

فردیات کے بعد ترقیمہ ہے اور پھر ترقیمہ کے بعد "مثنوی درد" کے عنوان سے "ساقی نامہ درد مند" شروع ہوتا ہے۔ عنوان شنگرفی روشنائی سے تحریر ہوا ہے۔ اس کے نیچے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے اور پھر ساقی نامہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے ۔

الٰہی بحق دل دردمند
اسیی دو عالم میں کر سربلند

اور آخری شعر یہ ہے ۔

نبی کے ہوں بسکی حرمت ضرور
اس امت پر آیا ہیی طوفان نور

(ورق ۱۴۱، الف)

اس ساقی نامہ کو مفصل تعارف کے ساتھ شیخ چاند نے مرتب کیا ہے[۲۴] یہ کل ۱۹۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن مخطوطہ ھذا میں یہ مطبوعہ ساقی نامہ کے صفحہ ۵۹۰ کے دوسرے شعر سے شروع ہوتا ہے۔ اسی صفحہ کا پندرھواں شعر، صفحہ ۵۹۱ کا چوتھا، سولھواں، صفحہ ۵۹۳ کا پندرہواں، سولہواں، سترہواں، صفحہ ۵۹۴ کا پانچواں، صفحہ ۵۹۵ کا تیرہواں، صفحہ ۵۹۶ کا تیرہواں شعر مخطوطہ میں نہیں ہے۔ بعد کے تمام اشعار اس میں موجود ہیں۔ اس ساقی نامہ کا تعلق خمریات سے ہے اور رندی و سرمستی کے مضامین کا حامل ہے۔ زبان دو سو سال قبل کی ہے لیکن اردو زبان میں

مذکورہ مضامین کو قادر الکلامی کے ساتھ قلم بند کرنے کے سبب اپنی انفرادیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ اردو میں ساقی نامہ کی صنف اور ایسی کوششیں عام نہیں تھیں۔ محمد تقیہہ دردمند پہلے شاعر تھے جنہوں نے بڑے اہتمام اور کامیابی کے ساتھ اسے نظم کیا ہے۔ اس کی مقبولیت کی روایتیں بڑی عام ہیں[۲۵] اس کی مقبولیت اور اس کے محاسن کا ثبوت ہے کہ مرزا مظہرؔ جان جاناں' جو اردو زبان و شاعری کے "نقاش اول" تھے' اس کی تعریف کرتے اور بار بار سنتے تھے[۲۶] اس کے سن تصنیف کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا۔ اس میں جو واقعات ہیں اور جن افراد کی اس میں مدح کی گئی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دردمند نے اسے عہد محمد شاہی میں نظم کیا تھا۔ دردمند صغر سنی میں اپنے وطن اودگیر سے شاہجہاں آباد ۱۱۳۶ھ میں پہنچے تھے[۲۷] محمد شاہ کا انتقال ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ کو ہوا تھا[۲۸] دردمند نے' ایک عام خیال کے مطابق' اسے عہد محمد شاہی (۱۱۶۱ھ تک) یا زیادہ سے زیادہ ۱۱۶۹ھ تک تصنیف کر لیا تھا' جب وہ شاہجہاں آباد سے بنگال گئے[۲۹] زیر نظر دیوان ولی کا سنہ کتابت ۱۱۵۹ھ ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دردمند نے یہ مثنوی ۱۱۵۹ھ سے قبل نظم کی تھی۔

زیر نظر نسخہ میں جا بجا اختلاف نسخ موجود ہے۔ بخوف طوالت اس کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ اس میں ولی کا غیر مطبوعہ کلام بھی ملتا ہے۔ راقم نے ایک علیحدہ مقالہ میں اس غیر مطبوعہ کلام کو پیش کیا ہے۔

(مطبوعہ ۔ "غالب" کراچی' جنوری ۱۹۷۶ء)

حواشی

۱۔ دیوان ولی کے قلمی نسخوں کی ایک مبسوط فہرست محمد اکرم چغتائی نے "اردو" جولائی ۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں پیش کی ہے۔ لیکن بعد میں کچھ اور نسخے جناب مشفق خواجہ کے علم میں آئے ہیں' جنہیں وہ اپنے زیر ترتیب جائزہ "اردو مخطوطات" کے ذریعہ متعارف

کرا رہے ہیں۔

۲۔ ورق ۱۳۵ ' ب

۳۔ اس سلسلہ میں یہ تقاویم بھی زیر نظر رہی ہیں۔ "تقویم ہجری و عیسوی" مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو' کراچی ۱۹۷۴ء "تقویم تاریخی" مرتبہ عبدالقدوس ہاشمی۔ مطبوعہ مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی' کراچی' ۱۹۶۵ء

۴۔ تانوں۔ "کلیات ولی" (مرتبہ نورالحسن ہاشمی' طبع سوم' کراچی' ۱۹۵۴ء) ص ۲۳

۵۔ یہ قصیدہ' ایضاً" ص ۳۰۹۔۳۱۱ میں ہے۔

۶۔ ہے۔ ایضاً" ص ۲۹۶

۷۔ کھویا۔ ایضاً"

۸۔ من۔ ایضاً"

۹۔ باندھا۔ ایضاً"

۱۰۔ مثنوی گری پر۔ ایضاً"

۱۱۔ سننے۔ ایضاً" ص ۲۹۴

۱۲۔ بچناں۔ ایضاً"

۱۳۔ فہی۔ ایضاً" ص ۲۹۱

۱۴۔ یہ مخمس "کلیات ولی" میں مصرعوں کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے۔ (ص ۲۹۱)

۱۵۔ ہوس دل میں سدا تیرے ہے سونے ہور کہانے کا۔ ایضاً" ص ۲۷۴

۱۶۔ ارے بے ہوش اگر کچھ ہے اندیشہ واں کے جانے کا۔ ایضاً"

۱۷۔ الیس کا۔ ایضاً" ص ۳۲۳

۱۸۔ کیا۔ ایضاً" ص ۳۴۹

۱۹۔ اولی۔ ایضاً"

۲۰۔ ورق ۱۳۵' الف

۲۱۔ اجھون لگ۔ "کلیات ولی" ص ۲۵۷

۲۲۔ نپکا۔ ایضاً" ص ۲۵۶

۲۳۔ زری کا۔ ایضاً"

۲۴۔ "اردو" اورنگ آباد دکن۔ جولائی ۱۹۳۴ء

۲۵۔ ان کا ایک سرسری تذکرہ شیخ چاند نے مذکورہ مضمون میں کیا ہے۔ ص

۵۸۷-۵۸۳

۲۶۔ قدرت اللہ قاسم "مجموعہ نغز" (پنجاب یونیورسٹی لاہور' ۱۹۳۳ء) جلد اول ص ۲۵۳
۲۷۔ آزاد بلگرامی "سرو آزاد" (حیدر آباد دکن' ۱۹۱۳ء) ص ۲۳۴
۲۸۔ سید غلام حسین خاں "سیر المتاخرین" انگریزی ترجمہ (لاہور' ۱۹۷۵ء) جلد سوم ص ۱۴۳
۲۹۔ آزاد بلگرامی ص ۲۳۵' سید فتح علی گردیزی "تذکرہ ریختہ گویاں" (اورنگ آباد دکن' ۱۳۳۳) ص ۶۱

ولی کا غیر مطبوعہ کلام

ولی کے کلام پر اب تک خاصہ تحقیق کام ہو چکا ہے۔ اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس کی ترتیب و تحقیق گارساں دتاسی کے مرتبہ "دیوان ولی"[۱] سے شروع ہوئی اور پھر ایک طویل عرصہ کے بعد مولانا احسن مارہروی نے یہ سلسلہ دوبارہ جاری کیا اور ۱۹۲۷ء میں جو کلام گارساں دتاسی کے مرتبہ نسخہ میں شامل نہیں تھا' اسے مرتب کر کے شائع کیا۔ بعد میں ولیؒ کے غیر مطبوعہ کلام کی تحقیق و تفتیش مختلف حضرات نے کی۔ نصیر الدین ہاشمی[۲] ڈاکٹر مختار الدین آرزو[۳] ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان[۴] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی[۵] ڈاکٹر علی جعفری[۶] اختر جونا گڑھی[۷] نے ولی کے بہت سے غیر مطبوعہ کلام کو پیش کیا۔ ان میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے دیگر محققین کی کاوشوں سے ضروری فائدہ اٹھایا تھا اور متعدد قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر ایک صحیح متن مرتب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے "کلیات ولی" کے ضمیمہ اول میں ولی کا ایسا کلام درج کیا ہے جو صرف کسی ایک قلمی نسخہ میں ملتا ہے۔ تاکہ بعد میں اگر اس کی کسی اور جگہ سے تصدیق ہو تو اسے کلیات کے متن میں شامل کر لیا جائے۔ بعد ازاں محمد اکرم چغتائی نے اس ضمن میں خاصی محنت سے کام لیا ہے۔ اور "کتاب خانہ دانشگاہ پنجاب" لاہور اور پنجاب پبلک لائبریری' لاہور میں محفوظ دیوان ولی کے سات قلمی نسخوں اور اول الذکر کتاب خانہ میں موجود متعدد ایسی قلمی بیاضوں سے' جن میں ولی کا کلام پایا جاتا ہے' ایک مبسوط مقالہ میں ولی کے غیر مطبوعہ کلام کو پیش کیا ہے[۸]

زیر نظر مقالہ میں ولی کے اس غیر مطبوعہ کلام کو پیش کیا جا رہا ہے، جو راقم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود "دیوان ولی" کے قلمی نسخہ میں ملتا ہے۔ یہاں اس قلمی نسخہ کی تفصیل غیر ضروری سمجھی گئی ہے کیونکہ ہم نے اس کی ضروری تفصیلات ایک علیحدہ مقالہ میں بعنوان "دیوان ولی کا ایک نادر قلمی نسخہ" میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہیں[9] پہلے ہم اپنے قلمی نسخہ سے ولی کا وہ غیر مطبوعہ کلام پیش کرتے ہیں جو "کلیات ولی" مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے ضمیمہ اول اور محمد اکرام چغتائی کے پیش کردہ غیر مطبوعہ کلام میں موجود ہے۔ اس طرح ان کے ولی کا کلام ہونے کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

قلمی نسخہ میں بعض غزلیں ایسی ہیں جو "کلیات ولی" کے متن میں موجود نہیں، لیکن اس کے ضمیمہ اول میں شامل ہیں۔ ان میں اشعار کی کمی بیشی اور ترتیب اشعار میں فرق نہیں ہے۔ محض کہیں کہیں اختلاف نسخ ملتا ہے۔ لہٰذا انہیں یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ذیل میں ان کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

کلیات، ضمیمہ اول غزل (۱) = قلمی نسخہ ورق ۱۹، الف۔ ب

کلیات، ضمیمہ اول غزل (۲۹) = قلمی نسخہ ورق ۴۰، الف۔

کلیات، ضمیمہ اول غزل (۲۷) = قلمی نسخہ ورق ۴۳، الف۔

کلیات، ضمیمہ اول غزل (۳۷) = قلمی نسخہ ورق ۱۱۷، ب۔

کلیات، ضمیمہ اول غزل (۳۸) = قلمی نسخہ ورق ۱۱۵، ب۔

اب قلمی نسخہ کا وہ کلام پیش کیا جاتا ہے جو "کلیات ولی" میں موجود نہیں لیکن محمد اکرام چغتائی کے پیش کردہ "غیر مطبوعہ کلام" میں شامل ہے۔[10]

۴۹۔ "۴" کے بعد۔

اگر تجھ حسن کامل کے کریں تعریف مہ رویاں
تمام اکر کریں اقرار اپنے نا تمامی کا[11]

(ورق ۳، ب)

۴۹-۶ کے بعد -

اگر تجہ حسن عالم پر کون دیکھیں سخن فہماں
نہ لاویں پہر زبان اوپر بیان خوبان نامی کا[۱۴]

(ورق ۳، ب)

۲۴-۱ کے بعد -

جنت حسن میں کیا حق نے
حوض کوثر مقام تجہ لب کا[۱۵]

(ورق ۸، الف)

۲۴-۴ کے بعد -

مثل یاقوت خط میں شاگرد
ساغری میں مدام تجہ لب کا[۱۶]

(ورق ۸، الف)

۸۵-۱ کے بعد -

تجہ قدنیں مجہ نگاہ کون عالیے نظر کیا
تجہ مکہ نے شوق بدر کون دل سوں بدر کیا[۱۷]

(ورق ۱۱، الف)

۳۶۴-۷ کے بعد -

بسکہ ہوں تری جدائیی سوں ضعیف
آرسی دیتی نہیں ہیی رو مجہیی[۱۸]

درج ذیل رباعی "کلیات ولی" میں شامل نہیں ہے -

جب وو رشک پری جلوہ کے ناز
دلکیی تسخیر کیں مظہر اعجاز ہوا
سبزہ خط نیے رخ یار کون کھیا ہے جلا

دیکھ یہ رنگ ۔ عجب آئینہ پرواز ہوا[۱۹]

(ورق ۱۳۵ ' الف)

"کلیات ولی" میں صفحہ ۳۲۳ تا ۳۲۶ پر جو مثنویات شامل ہیں ' وہ دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ جب کہ قلمی نسخہ میں یہ ایک مسلسل مثنوی کے طور پر تحریر ہوئی ہیں۔ کلیات کے لحاظ سے اس مثنوی کے حصہ اول میں قلمی نسخہ کا درج ذیل یہ شعر نہیں ہے۔

۲۲ کے بعد۔

یودو عالم میں وو ہیی شمع (تنویر)
کہ ہیی اس شمع کا سورج سو کلکیر[۲۰]

(ورق ۱۲۹ ' ب)

کلیات ' کی دوسری مثنوی بعنوان "در تعریف شہر سورت" میں قلمی نسخہ کا یہ شعر بھی نہیں ہے۔

۔۲۴ کے بجائے۔

دوجی انمین فرنکیی بیعاد ہین
کہ فعل و قول میں مکروہ بدہین[۲۱]

(ورق ۱۳۰ ' ب)

اب ولی کا ایسا غیر مطبوعہ کلام پیش کیا جاتا ہے جو کسی اور نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ محض راقم کے مملوکہ قلمی نسخہ میں ملتا ہے۔

قلمی نسخہ میں ردیف ن ' کی غزلوں کے درمیان ردیف الف ' کی ایک غزل تحریر ہے۔

ہیی نازنین صنم کے زلفاں دراز کرنا
فتینیے کا عاشقاں پر دروازہ باز کرنا
دل لیے کیا ہی میرا پھر مانگتا ہی جیو کون

برجاہی نازنین کون عاشق پوناز کرنا
ایقبلہ روہی روشن محراب تجہ بھوانکے
واجب ہو انکھیان سون اب جانماز کرنا
کیونکر چھپا سکونمین تجہ درد کی حقیقت
ہی کام آہ دل کا افشائی راز کرنا
ایسا بسیا ہی اکر ترا خیال جیو مین
مشکل ہی جیوسوں مجکوں اب امتیاز کرنا
ہی مختصر ایسے میں عاشقے سرخرو ہے
خدمت میں کلر خانکے جیو کو نیاز کرنا
میں عشق سون کیا ہون تجہ دلکون نرم آخر
ہر یک کا کام میں ہی آہن گداز کرنا
یک بارکیی رقیب بدخو کے بات سن کر
بیجا ہی پاک بین سون یوں احتراز کرنا
دروازۂ حقیقی جن نی قدم رکھیا ہے
اول قدم یہی ہی عشق مجاز کرنا
ہی پونچتنیی کا سلمان کعبیی کون بدعا کے
دریای عاشقیی مین دلکوں جہاز کرنا
شاید غزل ولیی کے لیجا الیی سلوبی
اس واسطے بجا ہی مطرب سون ساز کرنا

(ورق ۵۴ الف ۔ ب)

ہی ستمگر پہ خوش نظارا آج
دیکھنی دل ہوا ہمارا آج
کر ستم مجہ اوپر چلی جاناں
نین کا مار کنارا آج
جلد نکلیا سجن نے مکتب سون
شوق سون دل ہوا سپارہ آج
کیا وفادار ہیں دیکھو ساجن
نین دکھلا کئے دوبارہ آج
وصف کہنے میں اے سجن تیرا
رک جان کون کیا ستارا آج
دام میں زلف کے تری جاناں
آ پرا ہی بسر چسکارا آج
بیدرنگ سیس اتیت کر اپنا
پک پہ دلبر کے کر اوتارا آج

(ورق ۲۹' ب۔ ۳۰' الف)

قلمی نسخہ کی غزل مطابق "کلیات ولی" غزل (۱۴۳) میں دو مقطعے تحریر ہیں۔ ایک درج ذیل' اور دوسرا "کلیات" کی مذکورہ غزل کا درج ذیل مقطع غزل میں اپنے صحیح مقام پر موجود ہے' جب کہ مطبوعہ مقطع قلمی نسخہ کے حاشیہ پر تحریر کیا گیا ہے۔ روشنائی قلم اور خط میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اسے یقیناً" بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ کاتب نے شاید پہلے تحریر شدہ مقطع کاٹنا چاہا ہے اور اسے کاٹنے کے بجائے اس نشان (؎) کا استعمال کر کے مطبوعہ مقطع کو حاشیہ میں تحریر کر دیا ہے۔ غیر مطبوعہ مقطع یہ ہے ؎

اس صاحب دانش سوں ولیے ہی یو تعجب
یکبار کے کیون مجکوں کیا دل سوں بسر کر
(ورق ۳۸، الف)

دیکھی دل، کر حسین کوں تری جو سنبل کر
پار یکے نمن ولل کہ پری تن سوں نکل کر
کیا تاب ہی سور جمین جو تری طرف اوی
جون چاند نہیں ہی رہی او شرم سوں کل کر
قامت پونہا لانیکے قیامت ہوئی برپا
جاوپی تو اکر ٹکہ پیے کلستانمین چل کر
تجہ مکہ کے نزاکت سوں کلاں چاک قبا میں
جا جلمین چھپا ہی کنول اس رشک سو نجل کر
لالہ کے غن داغ پرلی دلمین ولیے کے
یو تازہ غزل سن نہ سکے پھر کہ غزل کر
(ورق ۳۹، الف)

۲۷۵۔۵ کے بعد۔

آرزو خوبرو کے ملنی کا
عاشقان صبح و شام کرتی ہیں
(ورق ۷۰، ب)

۴۲۹۔۱ کے بعد۔

تری انکھیاں اپر از بس بہار نیم خوابے ہے
گویا مضمون جامیی سین یو رنیکن انتخابیے ہے
(ورق ۹۴، الف)

۴۲۹۔۴ کے بعد۔

رہی کیون ہوش عاشق کا سلامت دیکہ یو آفت
تبسم ہے نکہ ہیی زلف ہیی پہرہ کلابی ہیی

(ورق ۹۴' الف)

بھی اس بیوفا کیی قول پر کیا اعتبار آو لی
کہ ظالم ہیی ستمکر ہی دورنگی ہے شرابی ہے
اٹھا ہی عشق کا شعلہ درس دیلی دلربا اپنا
دیکھانا آ کہ کون مصحف کہ یو مثلہ کتابی ہے

(ورق ۹۴' ب)

کلیات میں مخمس (۳) میں دوسرے بند کا پہلا مصرعہ شامل نہیں ہوا۔ یہ مصرعہ قلمی نسخہ میں موجود ہے۔

تجہ فطرت تصویر ہی فردوس تجل کون

(ورق ۱۴۷' ب)

قلمی نسخہ میں تین رباعیاں بھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک رباعی غزلوں کے درمیان ردیف یائی مجہول کی ایک غزل کے بعد تحریر ہے۔

تحصیل مکہ کے ہونی یہ مکہ کے تاب بس ہے
دانائی منتخب کون یو انتخاب بس ہے
مجہ حال کا کریی کر آ کر سوال دلبر
تو لاجواب ہونا مجکون جواب بس ہے

(ورق ۸۷' ب)

اور رباعیات کے حصہ میں یہ دو رباعیاں غیر مطبوعہ ہیں۔

نگاہ تیز و پلک تیز و غمز ہاتس پر تیز
کئیی ہیں دل سون میری مل کو بوسہ تیز پر تیز

رقیب پر جو جلی تس پہ خالہ کر کر سنیی
جو حشر لک وو پکاریں کہ ہاں لبریز بریز (کذا)
(ورق ۱۳۵ الف)

تاچند کہوں وصف تری خوش شکلے کے
اسیی شوخ تیری غمزنی جو بھی (سوبھلے) کے
رخسارۂ معشوق نہاں شدنہ بہ زلف
سورج نہیں دستا جو ہوا ہی بلیلے کے
(ورق ۱۳۵ الف)

قلمی نسخہ کی ایک اور انفرادیت ولی کا ایک فارسی زبان میں قطعہ ہے، جو پان کی تعریف میں ہے۔ راقم کی نظر سے تلاش بسیار کے باوجود اس سے قبل ولی کا فارسی کلام نہیں گزرا ہے۔ زیر نظر نسخہ میں یہ فارسی قطعہ ردیف ن، کی غزلوں کے درمیان شامل ہے۔ اس کے ولی کا کلام نہ ہونے کی کوئی قوی دلیل بھی ظاہر نہیں۔

زیور لعل نگار راحت جاں است پان
دافع بو ٹی دہان و تحفہ ہندوستان
چو نہ لوکلت سپاری چوں شود واصل آ پان
رونق گلزار را برہم زند دریک زبان
طبع شاہان را کہ حاجت نیست بر نعمت بسیے
میکند ہر دم طلب از عشق ہان تنبولدان
بین کہ مردان دلاوراز برائیی عشق پان
میکند جان نسار دمیز ند فوج کران
ایولیی بس کن کہ وصف پان آخر کن نکرد

آفرین بادا کہ باری اینقدر کر دی بیان

(ورق ۵۴' ب)

("اردو" کراچی' اپریل ۱۹۷۶ء)

حواشی

۱۔ مطبوعہ پیرس' ۱۸۳۳ء

۲۔ "ہندوستانی" الہ آباد' جنوری ۱۹۳۳ء

۳۔ "معاصر" پٹنہ' مئی ۱۹۴۳ء

۴۔ "معارف" اعظم گڑھ' اگست ۱۹۴۵ء

۵۔ "کلیات ولی" اشاعت دوم ۱۹۴۵ء و اشاعت سوم ۱۹۵۴ء مطبوعہ انجمن ترقی اردو' کراچی

۶۔ "نوائے ادب" بمبئی' جولائی ۱۹۵۲ء

۷۔ "اردو" کراچی' جولائی ۱۹۵۵ء

۸۔ "اردو" کراچی' جنوری ۱۹۶۷ء

۹۔ "غالب" کراچی' جنوری ۱۹۷۶ء

۱۰۔ محمد اکرام چغتائی نے درج ذیل قلمی نسخوں سے ولی کا غیر مطبوعہ کلام پیش کیا ہے۔

(۱) "دیوان ولی" مکتوبہ ۱۱۳۸ھ فخرویہ کتاب خانہ دانشگاہ پنجاب لاہور ۔ ذخیرہ حافظ محمود خاں خیرانی

(۲) "دیوان ولی" مکتوبہ ۱۱۴۹ھ فخرویہ کتاب خانہ دانشگاہ پنجاب لاہور' سراج الدین آذر

(۳) "دیوان ولی" مکتوبہ ۱۱۶۱ھ فخرویہ پنجاب پبلک لائبریری' لاہور

(۴) "دیوان ولی" مکتوبہ ۱۱۷۲ھ فخرویہ کتاب خانہ دانشگاہ پنجاب' لاہور' ذخیرہ پنڈت کیفی

(۵) "دیوان ولی" مکتوبہ ۱۱۹۴ھ فخرویہ کتاب خانہ دانشگاہ پنجاب' لاہور

(۶) "دیوان ولی" سن کتابت ندارد۔ فخرویہ کتاب خانہ دانشگاہ پنجاب' لاہور

(۷) "دیوان ولی" سن کتابت ندارد ۔ فخرویہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور

درج ذیل بیاضوں سے بھی ولی کا غیر مطبوعہ کلام پیش کیا گیا ہے۔

(۱) بیاض، ۵۲۱ مجموعہ شیرانی
(۲) بیاض، ۱۷۹۶ مجموعہ شیرانی
(۳) بیاض، ۲۱۳۵ مجموعہ شیرانی
(۴) بیاض، ۷۱۹ مجموعہ شیرانی
(۵) بیاض، ۵۳۲ ذخیرہ شیرانی
(۶) بیاض، ۱۴۷۹ ذخیرہ شیرانی
(۷) بیاض، ۲۰۹۱ ذخیرہ شیرانی
(۸) بیاض، مجموعہ کیفی
(۹) بیاض، مخزونہ کتاب خانہ دانشگاہ، پنجاب، لاہور
(۱۰) بیاض، مجموعہ کیفی

زیر نظر مقالہ میں ان قلمی نسخوں اور بیاضوں کا حوالہ ان کے نمبر شمار کے ذریعہ دیا جا رہا ہے۔

۱۱۔ یہ غزل کا نمبر ہے۔ غزلوں کے تمام نمبر "کلیات ولی" مرتبہ نورالحسن ہاشمی اشاعت سوم کے مطابق ہیں۔
۱۲۔ یہ شعر کا نمبر ہے۔
۱۳۔ قلمی نسخے (۳) ۳،ب (۴) ۳، الف (۶) ۴،ب (۷) ۲۱،ب ۔ بیاض (۶) ۳۴۹، الف
۱۴۔ قلمی نسخے (۱) ۱، الف (۳) ۳، ب (۴) ۲، الف (۶) ۴، ب (۷) ۲۱، ب۔ بیاض (۶) ۳۴۹، الف
۱۵۔ قلمی نسخے (۱) ۴، ب (۳) ۴، ب (۴) ۹، ب (۶) ۵، ب (۷) ۲۲، الف۔ بیاض (۶) ۳۷۰، الف
۱۶۔ قلمی نسخے (۱) ۴، ب (۴) ۹،ب (۶) ۵، ب (۷) ۲۲، الف۔ بیاض (۶) ۳۷۰، الف
۱۷۔ قلمی نسخہ (۱) ۱۷، ب
۱۸۔ قلمی نسخے (۱) ۶۰، الف (۳) ۸۷، الف (۶) ۹۷، الف
۱۹۔ قلمی نسخہ (۲) ۱۶، ب
۲۰۔ قلمی نسخہ (۳) ۱۰۸، الف
۲۱۔ قلمی نسخہ (۳) ۱۰۹، الف

"سحرالبیان" کا ایک قلمی نسخہ

(مرقومہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء)

مثنوی سحرالبیان اردو زبان و ادب کی ان شعری تخلیقات میں سے ہے جو نہ صرف اپنی شہرت و مقبولیت بلکہ اپنی مختلف النوع فنی خصوصیات کے لحاظ سے بھی بہترین ادبی شاہکار تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہ اردو زبان کی پہلی مکمل مثنوی ہے جس میں فارسی مثنوی کے شعری محاسن اور روایتی اسلوب کی فن کارانہ مہارت کا اظہار موجود ہے۔

یہ مثنوی میر حسن کے آخری زمانے کی تصنیف ہے۔ جو ان کی وفات ۱۲۰۱ھ سے دو سال پیشتر ۱۱۹۹ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ مثنوی کے آخر میں مرزا قتیل کی کہی ہوئی تاریخ ہے ۔

به تفتیش تاریخ ایں مثنوی
که گفتش حسن شاعر دہلوی
زدم غوطہ در بحر فکر رسا
که آرم بکف گوہر مدعا
به گوشم ز ہاتف رسید ایں ندا
بریں مثنوی باد ہر دل فدا

۱۱۹۹ھ

اپنی بے پناہ مقبولیت کے باعث سحر البیان کے کئی قلمی نسخے رقم ہوئے۔ اس کے بہت سے مخطوطات مختلف عام، خاص اور ذاتی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ۵۴ قلمی نسخوں کی نشاندہی کی ہے[1] لیکن راقم الحروف کو کچھ اور قلمی نسخوں کا علم ہے جو پاک و ہند کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ سحر البیان کے نسخوں سے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کی تحریریں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں موصوف نے "کتب خانہ آصفیہ" حیدر آباد دکن کے محض دو قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے[2] جب کہ کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی فہرست میں جسے نصیر الدین ہاشمی نے دو جلدوں میں مرتب کر کے حیدر آباد دکن سے ۱۹۶۱ء میں شائع کرایا ہے، سحر البیان کے درج ذیل آٹھ قلمی نسخوں کا توضیحی تذکرہ موجود ہے۔

۱۔ نمبر مثنوی ۱۶۱، سائز ۵x۸، صفحات ۱۶۰، سطر ۱۴، نستعلیق کتابت ۱۲۲۲ھ
۲۔ نمبر مثنوی ۲۸۰، سائز ۶x۹، صفحات ۱۷۴، سطر ۱۲ نستعلیق اس کے ساتھ میر حسن کا لکھا ہوا آٹھ صفحے کا نثری دیباچہ ہے۔
۳۔ نمبر مثنوی ۱۳۱۲، سائز ۸x۹، صفحات ۲۴۹، سطر ۹، نستعلیق کتابت ۱۲۵۸ھ لوح و جدول طلائی۔
۴۔ نمبر مثنوی ۵۲۵، سائز ۶x۱۲، صفحات ۲۲۴، سطر ۱۴، شکستہ کتابت ۱۲۶۲ھ
۵۔ نمبر مثنوی ۴۷۹، سائز ۶x۹، صفحات ۲۰۲، سطر ۱۲، نستعلیق۔ ناقص الاول
۶۔ نمبر مثنوی ۳۴۸۵ جدید، سائز ۳ ۱/۴ x ۷ ۱/۴، صفحات ۱۳۴، سطر ۱۷، نستعلیق کتابت ۱۲۳۴ھ
۷۔ نمبر مثنوی ۳۲۲۵ جدید، سائز ۴x۹، صفحات ۱۵۴، سطر ۱۴، شکستہ کتابت ۱۲۴۲ھ
۸۔ نمبر مثنوی ۳۵۲۷ جدید، سائز ۵.۵x۸.۵، صفحات ۱۷۸، سطر ۱۲، نستعلیق

کتابت ۱۲۵۰ھ [۳]

دو قلمی نسخے سینٹرل لائبریری، بنارس ہندو یونیورسٹی، لالہ سری رام کلیکشن میں ہیں۔

۹۔ نمبر شمار ۶۵، نمبر کتاب ۵۱ سنہ کتابت ندارد

۱۰۔ نمبر شمار ۶۶، نمبر کتاب ۵۲ سنہ کتابت ندارد [۴]

پانچ قلمی نسخے سندھ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں [۵] جن میں سے چار نسخے "کتب خانہ ضلع خیر پور" میں ہیں۔

۱۱۔ سائز ۹ ۲/۱ x ۶ ۲/۱، صفحات ۶۱، سطر ۱۶، کتابت ۱۲۴۲ھ، ناقص الاول

۱۲۔ سائز ۹x۴، صفحات ۵۴، سطر ۱۱، سنہ کتابت ندارد، ناقص الاول

۱۳۔ سائز ۱۰x۶، صفحات ۵۴، سطر ۱۴، سنہ کتابت ۱۲۴۷ھ ناقص الاول

۱۴۔ سائز ۸ ۲/۱ x ۵ ۲/۱، صفحات ۱۵۴، سطر ۱۵، سنہ کتابت ندارد، یہ نسخہ میر حسن کی دو اور مثنویوں کے ساتھ ایک جلد میں بندھا ہوا ہے۔

ایک قلمی نسخہ "ڈویژنل پبلک لائبریری، ضلع خیر پور" میں موجود ہے۔

۱۵۔ سائز ۶x۴، صفحات ۱۴۳، سطر ۱۳، شکستہ کتابت، تاریخ ندارد۔

یہاں جس قلمی نسخہ کا تعارف مقصود ہے وہ راقم الحروف کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے یہ کسی حد تک ناقص الاول ہے اور موجودہ حالت میں ۱۰۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ جس کا سائز ۵ x ۴/۳ ۷ ہے۔ اندازے کے مطابق اور اشعار کی ترتیب کے لحاظ سے خیال ہے کہ اس کا صرف پہلا ورق ضائع ہوا ہے۔ کاغذ بہت عمدہ استعمال کیا گیا ہے جو زیادہ دبیز بھی نہیں اور کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود کسی حد تک ہی زردی مائل ہو سکا ہے۔ نسخہ غیر مجلد ہے، معمولی سی سلائی کی گئی ہے اور دونوں جانب ایک ایک کاغذ گرد پوش کا کام دے رہا ہے۔ پہلے کاغذ پر نسخہ کا نام جلی حروف میں یوں لکھا ہے "داستان شہزادہ بے نظیر میگوید"۔ آخری ورق ۱۰۴ کے صفحہ الف پر ترقیمہ میں کاتب نے اپنا نام، پتہ و تاریخ، کتابت

تحریر کی ہے۔

"چند جزئیات مثنوی من تصنیف میر حسن صاحب سکنہ دہلوی
بقلم عبدالضعیف السہود الخطا اتما سید امیر علی عفی اللہ عنہ
ساکن تا بگنج بروز سہ شنبہ بتاریخ ہفتم صفرالمظفر ۱۲۵۸ ہجریے
صورت اختتام یافت۔"

اور آخر میں یہ شعر درج ہے ۔

قاریا بر من مکن چنداں عتاب
گر خطائے رفتہ باشد در کتاب

ورق ۱۰۴ کا صفحہ ب سادہ ہے جس پر ایک جانب اوپر عربی میں یہ جملہ لکھا ہے۔

"بفتح الباب کل شیی با"

پورا نسخہ سیاہ اور شنگرفی روشنائی اور ایک قلم سے خوبصورت نستعلیق میں تحریر ہوا ہے۔

تمام صفحات پر چاروں طرف سیاہ اور شنگرفی روشنائی سے تین دھاری حاشے کھنچے ہیں۔ اسی طرح مصرعوں کے درمیان دونوں جانب اور عنوانات کے اطراف شنگرفی روشنائی کی دوہری لکیریں کھینچی ہیں۔ سارے عنوانات شنگرفی روشنائی ہی سے کتابت ہوئے ہیں اور کہیں کہیں عنوانات کے بعد پہلا شعر اور آخری شعر بھی اسی روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ ایک صفحے پر گیارہ شعر تحریر ہیں اور ایسے صفحات جن پر عنوانات آئے ہیں نو شعر موجود ہیں۔

املا کے تعلق سے نسخے کے کسی بھی صفحے کو ایک نظر دیکھنے سے کچھ باتیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اکثر متعلقہ الفاظ ایک دوسرے سے ملا کر لکھے گئے ہیں۔ جیسے لپچل' طمانچونسی' مخلمیں وغیرہ۔ دوسرے عام طور پر یائے مجہول کو یائے معروف کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ جہاں یائے معروف کی ضرورت تھی

وہاں یا تو یائے معروف ہی استعمال کی گئی ہے یا پھر "ی" کے نیچے دو نقطے دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر مقامات پر دوچشمی ھ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں جہاں دو چشمی ھ کی ضرورت نہیں تھی دو چشمی ھ لکھی گئی ہے جہاں اس کا استعمال نہیں ہوا ہے وہاں اس طرح لکھا گیا ہے۔ بٹہا (بٹھا)' اٹہا (اٹھا)' جہوت (جھوٹ)' تہا (تھا)' کہلی (کھلی)' آ نکہہ (آنکھ) وغیرہ۔

پہلے ورق کے علاوہ اس کا ورق ۵ بھی ضائع ہو چکا ہے جس کی تفصیلات آگے آتی ہیں۔ نسخے کو اس کے علاوہ اور کہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا ہے۔ تمام اشعار کتابت کے لحاظ سے نہایت خوش خط' صاف اور نمایاں ہیں اور سارا نسخہ لفظ بہ لفظ پڑھا جا سکتا ہے۔

یہاں راقم الحروف کے پیش نظر اس نسخہ کا سحرالبیان کے کسی مستند مطبوعہ نسخے سے مقابلہ بھی مقصود ہے۔ اس قسم کے نسخوں کی صحت اور اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے' دوسرے نسخوں کے ساتھ' تین بنیادوں کو پیش نظر رکھ کر تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اول۔ اشعار کی کمی بیشی کے اعتبار سے کہ دوسرے نسخے کے مقابلے میں اس میں کون سے اشعار کم ہیں اور کون سے اضافی۔

دوم۔ الفاظ کی بندش کے لحاظ سے ایسے اشعار کی نشاندہی کی جن میں الفاظ کی ترکیب اور مصرعوں کی ترتیب کے اختلافات اور الفاظ کا فرق موجود ہے۔

سوم۔ مجموعی طور پر اشعار کی ترتیب کہ کس نسخے میں کون سا شعر پہلے یا بعد میں ہے۔

زیر نظر سطور میں محض ایسے اشعار کا جائزہ مقصود ہے' جو کسی ایک نسخے میں موجود ہیں اور دوسرے میں موجود نہیں۔ اس مقصد کے لئے "مثنویات حسن" مرتبہ سید اشرف حسین دہلوی' مطبوعہ مخزن پریس' دہلی ۱۹۰۸ء کا انتخاب کیا گیا

ہے۔ اس مطبوعہ نسخہ کو سحرالبیان کے متعدد مطبوعہ نسخوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ تسلیم شدہ ہے۔[۶]

سحرالبیان کا یہ قلمی نسخہ چونکہ ناقص الاول ہے اس لئے نسخہ مخزن کے ان اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

پر اس جوش میں آ کے بہنا نہیں
سمجھنے کی ہے بات کہنا نہیں
قلم گو زباں لائے اپنی ہزار
لکھے کس طرح حمد پروردگار

قلمی نسخے میں ان اشعار سے قبل کے تقریباً اٹھارہ شعر ضائع ہو چکے ہیں۔
سطور بالا میں ذکر آیا ہے کہ قلمی نسخہ کا ورق ۵ ضائع ہو چکا ہے۔ نسخہ مخزن صفحہ ۸ کے آخری شعر۔

رہے جب تلک داستان سخن
الٰہی رہیں قدر دان سخن

کے بعد کے چھ شعر قلمی نسخے میں موجود نہیں۔ ورق ۵ الف کا آخری شعر اس حد تک پڑھا جا سکتا ہے۔

جہاں عدل سی اوسکی آباد ہی
غریبوں فقیروں ——————

نسخہ مخزن میں صفحہ ۹ پر یہ ساتواں شعر ہے۔ قلمی نسخے کے ورق ۵ ب کے آخری شعر کا مصرعہ ثانی یہ ہے۔

کسی یاد ہی یہہ خدادا ہی

اسی طرح دس شعر، جو نسخہ مخزن میں صفحات ۹-۱۰ پر درج ہیں قلمی نسخے میں موجود نہیں۔ قلمی نسخہ کا ورق ۶ الف اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

ستم اوسکی باتونسی رویا کری
سدا فتنہ دہر سویا کری[7]

نسخہ مخزن اور قلمی نسخے میں متعدد اختلافات موجود ہیں۔ ایک تو قلمی نسخے میں ایسے اشعار موجود ہیں جو نسخہ مخزن میں نہیں اور اسی طرح نسخہ مخزن کے کئی اشعار قلمی نسخے میں موجود نہیں۔ دوسرے عنوانات کے مقامات بھی کہیں کہیں دونوں نسخوں میں مختلف ہیں۔ یا کسی میں عنوان دیا گیا ہے اور کسی میں نہیں دیا گیا۔ نسخہ مخزن میں عنوانات کا ترجمہ دیا گیا ہے' جو مختصر ہے۔ جب کہ قلمی نسخے میں عنوانات فارسی زبان میں تفصیلی دیئے گئے ہیں۔ نسخہ مخزن میں صفحات ۵' ۶' ۷' ۱۴' ۳۴ پر جو عنوانات ہیں وہ قلمی نسخے میں موجود نہیں۔ اسی طرح نسخہ مخزن کے درج ذیل اشعار کے بعد قلمی نسخے میں عنوانات دیئے گئے ہیں اور یہ نسخہ مخزن میں موجود نہیں ہیں۔ پہلے اشعار تحریر کئے جاتے ہیں پھر علی الترتیب عنوانات۔

۱۔ چلے تیغ گر اس کی روز مصاف
نظر آئے دشمن سے میدان صاف[8]

۲۔ سدا سیر پر اور تماشے پہ دل
کشادہ دلی اور خوشی متصل[9]

۳۔ غرض لوگ تھے یہ جو ہر کام کے
یہ سب واسطے اس کے آرام کے[10]

۴۔ نہ تھا وہ کنواں تھا ستون الم
نشان شب آفت درد و غم[11]

۵۔ سنا جب کہ نجم النساء نے یہ حال
ہوئی بے قراری تب اوسکو کمال[12]

۶۔ بنی جب کہ جوگن وہ اس رنگ سے
لگے پھوڑنے دوست سر سنگ سے[13]

۷۔ شب وصل کی جو سحر ہو گئی
تو سوتوں کو گویا خبر ہو گئی[۱۴]

۸۔ بحق حسین و بنام حسن
رہوں شاد میں بھی غلام حسن[۱۵]

۱۔ "دربیان توصیف خلق و علم نواب مذکور میگوید"[۱۶]
۲۔ "دربیان سیر و شکار نواب ممدوح میگوید"[۱۷]
۳۔ "دربیان رفتن شاہزادہ بمکتب برای خواندن علم و ہنر میگوید"[۱۸]
۴۔ "دربیان بیقرار شدن بدر منیر فراق بی نظیر و بہانہ سیر باغ و داغ چیدن از باغ ہجر میگوید"[۱۹]
۵۔ "دربیان جوگن شدن نجم النساء دخت وزیر در تلاش شاہزادہ بی نظیر میگوید"[۲۰]
۶۔ "دربیان رخصت شدن نجم النساء ازبدر منیر میگوید"[۲۱]
۷۔ "دربیان حمام و سنگار کردن بدر منیر و بی نظیر بار دویم میگوید"[۲۲]
۸۔ "دربیان ختم الکتاب میگوید"[۲۳]

قطعات تاریخ سے قبل قلمی نسخے میں یہ سرخی دی گئی ہے۔ "دربیان تاریخ مشفقان میگوید"[۲۴] جب کہ نسخہ مخزن میں ہر قطعہ تاریخ سے قبل علیحدہ علیحدہ عنوانات دیئے گئے ہیں۔[۲۵]

اب ایسے اشعار تحریر کیے جاتے ہیں جو نسخہ مخزن میں موجود ہیں لیکن قلمی نسخے میں موجود نہیں ۔

بجیرا پکھاوج گلے ڈال ڈھول
بجاتے تھے اس جا کھڑے باندھ غول[۲۶]
طلسمات کے سارے دیوار و در
نہ یاں کے سے کوٹھے نہ یاں کے سے در[۲۷]

کھنچی ڈوری ہر طرف زر تار کی
لڑی جوں کناری کے ہوں بار کی[۲۸]
نظر آئے اتنے جو اک بار چاند
زمانے کے منہ کو لگے چار چاند[۲۹]
وہ تکمے پہ چنپا کلی کی پھبن
کہ سورج کے آگے ہو جیسے کرن[۳۰]
دھریں کشتیاں اک طرف بے شمار
چنی اک طرف ڈالیوں کی قطار[۳۱]
اچار اور مربے دھرے خوشنما
وہ باہر کے دالان میں جا بجا[۳۲]
کہا خاصہ بر کو خبردار کر
کہ رکھیو تو خاصے کو تیار کر[۳۳]
اجازت نہ دیتا تھا لیکن حجاب
کہ دیتی کچھ اس بات کا وہ جواب[۳۴]
ولے ایک اس پر پڑا تھا جو پیچ
یہ سب اس کے آگے تھا گویا کہ ہیچ[۳۵]
لپیٹے ہوئے پوستوں پر تمام
رو پہلی سنہری ورق صبح و شام[۳۶]
بہانے سے ہر کام کے روز و شب
وہیں کاٹنی اس کو اوقات سب[۳۷]
تمہیں احتیاط اس کی اب ہے ضرور
سمجھیو اسے اپنی پتلی کا نور[۳۸]
کہا اس نے ہنس کر بھلا دیکھ لو

تو اس بات پر میرے صدقے نہ ہو[۳۹]
کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا
ارے دیو تو کیوں دوانا ہوا[۴۰]
نکلے کوئی صدقے کے لانے لگی
کوئی سر سے روٹی چھوانے لگی[۴۱]
کوئی آئی باہر سے گھر سے کوئی
ادھر سے کوئی اور ادھر سے کوئی[۴۲]
وہ گزرا ہوا یاد کر کر کے حال
لگے رونے آنکھوں پہ دھر کے و رومال[۴۳]
ادھر اور ادھر رکھے کاندھے پہ ہاتھ
چلی ناچتی آنا سنگت کے ساتھ[۴۴]
فتح چند کے ہاتھ کی مورت ایک
لجائی ہوئی چاند سی صورت ایک[۴۵]

آخر میں نسخہ مخزن میں فخرالدین ماہر کی کہی ہوئی تاریخ ہے جو قلمی نسخے میں موجود نہیں۔

اب ایسے اشعار درج کیے جاتے ہیں جو قلمی نسخے میں تو ہیں لیکن نسخہ مخزن میں موجود نہیں۔ اشعار کی ترتیب ظاہر کرنے کے لئے پہلے قلمی نسخے کے اشعار تحریر کیے جاتے ہیں۔ پھر نسخہ مخزن کے وہ اشعار لکھے جاتے ہیں جن کے بعد قلمی نسخے کے اشعار کو ہونا چاہئے۔ قلمی نسخے کے اشعار کے بعد جو نمبر دیئے گئے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس نمبر کے شعر کو اسی نمبر کے تحریر شدہ نسخہ مخزن کے شعر کے بعد ہونا چاہئے۔

عتاب عروسان در آمد بکوش
صراحی تہی گشت ساقی خموش (ا)[۴۶]

ہمہ ہا ہواؤ ہوس ساختی
دمی با مصالح نہ پر داختی (۲)[۴۷]
کوئی بھر کی گت اپنی پانوں تلی
کہڑی عاشقوں کی دلوں کو ملی (۳)[۴۸]
پڑی کہنی سی بہی کچونکی نمود
اوسی دیکھ نیلا ہو چرخ کبود (۴)[۴۹]
یہ جلوہ سراسر ہو جس پر عیاں
تو اس آگ سی بچکی جاوی کہاں (۵)[۵۰]
کہچی ابرو اور چشم مست غرور
بھری گال خورشید چہرکا نور (۶)[۵۱]
جھلک پاپجامہ کی، دامن سی یوں
کہ روشن ہو فانوس میں شمع جوں (۷)[۵۲]
جہاں بیٹھنا آہ کرنا اوسی
بہانا نزاکت پہ دھرنا اوسی (۸)[۵۳]
ڈھلی منہ پر آنسو ہوا بسکہ رنج
چھٹی چاندنی میں ستاروں کا گنج (۹)[۵۴]
ملی راکھ ساری بدن کی تئیں
کیا دندھا اپنی تن من کی تئیں (۱۰)[۵۵]
سمجھ بین کو اوسکی انسان سار
گریبان کرنی لگی تار تار (۱۱)[۵۶]
قدح بھر کی لاسا قیا باتمیز
کنویں سی نکلتا ہی یوسف عزیز (۱۲)[۵۷]
جو دیکھا کبھی تو لیا منہ کو موڑ

اسی طرح کرتی، رہی جوڑ توڑ (۱۳)[۵۸]
کھڑی تھی جو وہ دیو جیسے پہاڑ
اونھونی دیا اپنی سینہ کو گاڑ (۱۴)[۵۹]
تو اوسوقت میں دیکھتی ہو نمیں کیا
کہ ایک صاف میداں ہی دشت بلا (۱۵)[۶۰]

۱۔ دریغا کہ عہد جوانی گذشت
جوانی مگو زندگانی گزشت[۶۱]

۲۔ رہے بے تمیزی و بے حاصلی
کہ از فکر دنیا و دیں غافلی[۶۲]

۳۔ کوئی دائرے میں بجا کر پرن
کوئی دمدمے میں جتا اپنا فن[۶۳]

۴۔ لگے ہر طرف گوہر شب چراغ
وہی دن کو گوہر وہی شب چراغ[۶۴]

۵۔ یہ قدرت کا دیکھا جو اس نے خیال
کہا شاہزادے نے یا ذوالجلال[۶۵]

۶۔ وہ موتی کا لٹکن زمرد کی ہڑ
لٹک جس کی زیبندہ دستار پر[۶۶]

۷۔ ڈلک سرخ نیفے کی ابھری ہوئی
گلابی سی گرد ایک تہ دی ہوئی[۶۷]

۸۔ نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا[۶۸]

۹۔ مژہ وہ نوکیلی جو تھی تیز سی

ہوئیں اشک خونیں سے گلریز سی[۶۹]

۱۰۔ کئی سیر موتی جلا راکھ کر
بھبوت اپنے تن پر ملی سر بسر[۷۰]

۱۱۔ تماشا نہ دیکھا تھا جو یہ کبھی
ددو دام غش ہو پڑے تھے سبھی[۷۱]

۱۲۔ کوئی پھول سی دے شتابی شراب
کہ شہر مطالب کو پہنچوں شتاب[۷۲]

۱۳۔ کبھی منہ چھپایا دکھلایا کبھی
کبھی مار ڈالا جلایا کبھی[۷۳]

۱۴۔ کہ یہ سنگ اکھڑے یہاں سے چلے
کسی طرح چھاتی سے پتھر ٹلے[۷۴]

۱۵۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ صحرا ہے ایک
اور اس دشت و بریں کنواں سا ہے ایک[۷۵]

مزید یہ کہ فخرالدین ماہر کے کہے ہوئے تاریخی قطعے کے بعد نسخہ مخزن میں درج ذیل اشعار موجود نہیں جو قلمی نسخے کے آخر میں تحریر ہیں ۔

جو تعریف ہے مثنوی کی یہ حال
کہ ہے یہ تمام اور خواب و خیال
کہاں ایسی تھی بادشاہ و وزیر
یہ سب جھوٹ کہتا ہو نمیں بی نظیر
کہاں وہ ملک اور وہ بدر منیر
کہاں وہ پری اور کہاں بی نظیر
کہا ہے جو کچھ کہ دیکھا نہیں
ہوا ہی نہ ایسا نہ ہو گا کہیں

لکھا واسطی مینی اس کی تمام
کہ رہوی جہانمیں میرا اس سی نام"

ترتیب اشعار اور بندش الفاظ کے اعتبار سے بھی دونوں نسخوں میں خاصہ فرق ہے۔ لیکن اس انداز کا تقابلی مطالعہ طوالت کا متقاضی ہے۔ چنانچہ یہاں اس سے احتراز کیا گیا ہے۔

مطبوعہ۔ "اردو" کراچی' جنوری ۱۹۷۴ء

حواشی

۱۔ ان میں سے ۵۳ نسخوں کی تفصیلات کے لئے مقدمہ "مثنویات حسن" جلد اول (لاہور ۱۹۶۶ء)
اور ۵۴ ویں نسخے کے لئے سحرالبیان کا ایک نادر قلمی نسخہ "منقول" "نذر رحمٰن" (لاہور' ۱۹۶۶ء)

۲۔ ملاحظہ فرمایئے' مقدمہ' ص ۲۱' ۲۳

۳۔ نصیر الدین ہاشمی "کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات" جلد اول ص ۱۱۶۔۱۱۹ (حیدر آباد دکن' ۱۹۶۱ء)

۴۔ حکم چند نیر' "فہرست مخطوطات مخزونہ لالہ سری رام" مشمولہ "اردو ادب" علی گڑھ شمارہ ۲' ۱۹۶۲ء

۵۔ سید علی احمد زیدی "سندھ میں اردو مخطوطات" ص ۷۱۔۷۵ (لاہور' ۱۹۶۹ء)

۶۔ ڈاکٹر وحید قریشی' مقدمہ' "مثنویات حسن" جلد اول ص ۲۹

۷۔ ونیز "نسخہ مخزن" ص ۱۰

۸۔ نسخہ مخزن ص ۱۲

۹۔ ایضاً

۱۰۔ نسخہ مخزن ص ۲۹
۱۱۔ ایضاً" ص ۷۶
۱۲۔ ایضاً" ص ۹۲
۱۳۔ ایضاً" ص ۹۵
۱۴۔ ایضاً" ص ۱۲۰
۱۵۔ ایضاً" ص ۱۳۷
۱۶۔ ورق ۲۰ الف
۱۷۔ ایضاً"
۱۸۔ ورق ۲۰ الف
۱۹۔ ورق ۵۷ الف
۲۰۔ ورق ۶۸ ب
۲۱۔ ورق ۷۱ الف
۲۲۔ ورق ۹۰ الف
۲۳۔ ورق ۱۰۲ ب
۲۴۔ ورق ۱۰۳ الف
۲۵۔ نسخہ مخزن ص ۱۳۸
۲۶۔ نسخہ مخزن ص ۲۴
۲۷۔ ایضاً" ص ۴۴
۲۸۔ ایضاً" ص ۵۲
۲۹۔ ایضاً" ص ۵۴
۳۰۔ ایضاً" ص ۶۸
۳۱۔ ایضاً" ص ۶۹
۳۲۔ ایضاً" ص ۶۹
۳۳۔ ایضاً" ص ۶۹
۳۴۔ ایضاً" ص ۷۱
۳۵۔ ایضاً" ص ۸۰
۳۶۔ ایضاً" ص ۸۳
۳۷۔ ایضاً" ص ۱۰۳
۳۸۔ ایضاً" ص ۱۰۹
۳۹۔ ایضاً" ص ۱۱۱
۴۰۔ ایضاً" ص ۱۱۲
۴۱۔ ایضاً" ص ۱۱۴
۴۲۔ ایضاً"۔
۴۳۔ ایضاً" ص ۱۱۸
۴۴۔ ایضاً" ص ۱۲۹
۴۵۔ ایضاً" ص ۱۲۹
۴۶۔ ورق ۱۱ الف
۴۷۔ ایضاً"
۴۸۔ ورق ۱۶ ب
۴۹۔ ورق ۳۲ ب
۵۰۔ ورق ۴۱ ب
۵۱۔ ورق ۴۲ ب
۵۲۔ ورق ۵۰ الف
۵۳۔ ورق ۵۸ الف
۵۴۔ ورق ۶۸ الف
۵۵۔ ورق ۶۹ الف

۵۶۔ ورق ۷۲ ب
۵۷۔ ورق ۷۲ ب
۵۸۔ ورق ۷۸ ب
۵۹ ورق ۸۲ الف
۶۰۔ ورق ۸۹ ب
۶۱۔ نسخہ مخزن ص ۱۷
۶۲۔ نسخہ مخزن ص ۱۷
۶۳۔ نسخہ مخزن ص ۲۴
۶۴۔ ایضاً ص ۴۵
۶۵۔ ایضاً ص ۵۶
۶۶۔ ایضاً ص ۵۸
۶۷۔ ایضاً ص ۶۷
۶۸۔ ایضاً ص ۷۸
۶۹۔ ایضاً ص ۹۱
۷۰۔ ایضاً ص ۹۳
۷۱۔ ایضاً ص ۹۶
۷۲۔ ایضاً ص ۹۷
۷۳۔ ایضاً ص ۱۰۴
۷۴۔ ایضاً ص ۱۰۹
۷۵۔ ایضاً ص ۱۱۹
۷۶۔ قلمی نسخہ، ورق ۱۰۳ ب
۷۷۔ قلمی نسخہ، ورق ۱۰۴ الف

"سحرالبیان" کا ایک اور قلمی نسخہ

(مرقومہ ۹۸ - ۱۸۹۷ء)

راقم کے ذخیرۂ کتب میں موجود سحر البیان، مثنوی میر حسن دہلوی کا یہ دوسرا قلمی نسخہ ہے، جس کا تعارف ذیل میں مقصود ہے۔ یہ نسخہ متن کے ٦٧ اوراق اور ۱۳۲+۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخری صفحہ سادہ ہے، جب کہ پہلے صفحہ کی پیشانی پر صرف ڈیڑھ سطر پر مشتمل ایک عبارت ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب نے آغاز کتابت میں اسے لکھا ہے اور جس سے آغاز کتابت کی تاریخ اور سنہ کا تعین ہوتا ہے۔ عبارت اس حد تک پڑھی جاتی ہے:

"بندہ (کذا) علم الدین محرر .... رہنے والا
موضع گنج تحصیل ضلع لاہور واقعہ ۲۰ ر ماہ اگست ۱۸۹۷ء بقلم
خود"

مثنوی کے اختتام پر ترقیمہ کی عبارت یہ ہے۔

"تمام شد مثنوی سحر البیان تصنیف میر حسن ساکن لکھنؤ

تاریخ بست و ششم ماہ اکتوبر (کذا) ۱۸۹۸ء"

آغاز اور اختتام سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب نے مثنوی کو کم و بیش ایک سال کی مدت میں لکھا۔ خط نستعلیق، شکستہ اور پختہ ہے، لیکن متعدد مقامات پر الفاظ با آسانی یا بالکل پڑھنے میں نہیں آتے۔ ایک قلم اور روشنائی سیاہ استعمال کی گئی ہے۔ لیکن سرخیوں کے عنوانات معمولی سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں، جس کا رنگ قدرے پھیکا پڑ چکا ہے۔ نسخہ، گو پچھلی صدی کے آخر کا ہے، جب کہ املا کی موجودہ صورتیں وضع ہو چکی تھیں، لیکن کاتب نے اسی قدیم طرز املا کو اختیار کیا، جو بالعموم انیسویں صدی کے اوائل تک مستعمل رہا۔ یائے مجہول کو یائے معروف لکھا گیا ہے اور کہیں اس کے نیچے نقطے بھی لگائے گئے ہیں۔ گ پر بالعموم صرف ایک مرکز لگایا گیا ہے، دو چشمی ھ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ متعدد مقامات پر الفاظ کو ملا کر لکھا گیا ہے جب کہ بعض الفاظ کو اس طرح توڑ کر لکھا گیا ہے کہ ناگوار لگتا ہے۔ مثلاً" چاہتے کو چاہ تے۔

مسطر کا سائز ۸۱٫۳ سینٹی میٹر ہے۔ سطروں کی تعداد مقرر نہیں ہے، بالعموم ایک صفحہ پر ۱۷ سطریں ہیں، لیکن کسی صفحہ پر ۱۵ اور کسی پر ۲۱ بھی ہیں۔ مصرعے آمنے سامنے لکھے گئے ہیں۔ کاغذ دبیز اور مٹیالا ہے۔ سارا نسخہ کرم خوردہ اور نہایت خستہ حالت میں تھا۔ خستگی کے سبب اس کا پشتہ دوبارہ سلائی کے قابل نہیں تھا، چنانچہ جلد ساز نے پشتہ سے قطع نظر حاشیہ کی جانب سے سلائی کر کے جلد تیار کی تا کہ سلائی ہو سکے اور پشتہ کی طرف کے الفاظ مزید ضائع نہ ہوں۔ اس لئے اب یہ مخطوطہ بائیں تا دائیں پڑھنے میں آتا ہے۔ اوراق کی مزید شکستگی اور خستگی کو روکنے کے لئے ہر ورق کے اطراف مومی کاغذ چڑھا کر جلد بندی کی گئی ہے۔ اس طرح اب یہ نسخہ محفوظ تو ہو گیا ہے، لیکن بوسیدگی اور کرم خوردگی کے باعث اس کا ہر ورق، اوپر اور نیچے کے کونوں اور سابقہ پشتہ کی جانب، نقصان رسیدہ ہے، جس کے باعث الفاظ بھی ضائع ہوئے ہیں۔

کاتب بہت غیر محتاط معلوم ہوتا ہے' اس نے اغلاط بہت کی ہیں۔ نہ صرف الفاظ غلط لکھے ہیں اور ان کی بندش تبدیل کر دی ہے بلکہ مصرعے تک بدل دیئے ہیں' اور کہیں کہیں یکسر مختلف مصرعے لکھے ہیں۔ سرخیوں اور عنوانات کے مقامات بھی قدرے بدل دیئے ہیں۔ کئی اشعار کی ترتیب میں بھی اختلاف کیا ہے۔ کہیں کہیں اشعار اور کہیں کہیں مصرعوں کو تکرار سے بھی لکھ دیا ہے۔ اس نے اپنی بے نیازی کا اس حد تک ثبوت دیا ہے کہ کسی کسی جگہ الفاظ یہاں تک کے قافیہ بھی لکھنے سے رہ گیا ہے۔ ویسے اس نے بعض مقامات پر متن ہی کے قلم سے تصحیح بھی کی ہے اور غلط الفاظ یا مصرعہ کو کاٹ کر حاشیہ میں اصلاح کر دی ہے۔ املا کی اغلاط بھی موجود ہیں' مثلاً "ذ" کی بجائے "ز" استعمال کیا ہے۔ جیسے "ذرا" کو "زرا" اور "گلزار" کو "گلنار" لکھا ہے۔

ذیل میں راقم نے زیر نظر نسخہ کا نسخہ سحرالبیان مرتبہ رشید حسن خاں (مطبوعہ مکتبہ جامعہ' دہلی' ۱۹۸۲ء) سے' اختلاف نسخ سے قطع نظر' اس کے متن کا مقابلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ضمنی طور پر راقم کا مملوکہ "نسخہ اول" اور دیگر مطبوعہ نسخوں میں سے "نسخہ مخزن" (مثنویات میر حسن" مرتبہ مولوی سید اشرف حسین دہلوی' مطبوعہ مخزن پریس' دہلی' ۱۹۰۸ء) اور "نسخہ نو لکشور" ("مجموعہ مثنویات میر حسن" مرتبہ مولانا عبدالباری آسی' مطبوعہ جنوری ۱۹۴۵ء) بھی پیش نظر رہے ہیں۔ ان نسخوں میں سے نسخہ رشید حسن خاں' جو دراصل فورٹ ولیم کالج کے نسخہ مطبوعہ ۱۸۰۵ء پر مبنی ہے' اور "نسخہ مخزن" و "نسخہ نو لکشور" میں بڑی مماثلت موجود ہے۔ جب کہ ان میں اور زیر نظر نسخہ میں واضح اختلافات نسخ سے قطع نظر اشعار کی کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے اور اس اعتبار سے زیر نظر نسخہ میرے مملوکہ "نسخہ اول" سے قدرے مماثلت رکھتا ہے۔

اب ذیل میں زیر نظر نسخہ کا اشعار کی کمی بیشی کے لحاظ سے مذکورہ بالا نسخہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

الف۔ وہ اشعار جو زیر نظر نسخہ میں موجود نہیں۔ (صفحہ نمبر۔ شعر نمبر)
۱۹-۱۱، ۲۰-۱۱، ۲۱-۱، ۱۰، ۲۳-۱۳، ۲۵-۷، ۲۶-۱۴، ۲۷-۳، ۷، ۳۰-۱، ۴ تا ۱۴، ۳۱-۱ صرف پہلا مصرعہ، ۲ صرف پہلا مصرعہ، ۳۵-۶، ۱۴، ۱۷، ۳۶-۶، ۹، ۱۷، ۳۷-۷، ۱۰، ۱۳، ۱۵، ۳۹-۸ تا ۱۰، ۴۰-۱۳، ۴۱-۱۳، ۱۴، ۴۵-۱۵، ۴۶-۱۷، ۴۷-۱، ۴۸-۷، ۱۰ تا ۱۵، ۴۹-۱۴، ۵۰-۱۱، ۵۲-۶، ۵۳-۵، ۶ کے بعد عنوان، ۵۴-۲، ۵۶-۱۲، ۱۴، ۱۷، ۵۷-۲، ۴، ۶، ۶۰-۶، ۷، ۹، ۶۱-۱۲، ۱۵ کے بعد عنوان، ۶۳-۳، ۶۵-۷، ۱۳، ۶۶-۱۴ سے ۶۷-۱۲ تک، ۶۷-۱۵ درمیان میں مصرعوں کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے، ۷۰-۱۴، ۷۲-۴، ۷۷-۱۴، ۷۸-۱۳ تا ۱۵، ۷۹-۱۲ تا ۱۳، ۸۱-۱۳، ۱۷، ۸۲-۱، ۸۳-۱۳، ۸۹-۴، ۱۱ تا ۱۲، ۹۰-۱، ۹۱-۱۲، ۹۴-۵ تا ۱۴، ۹۶-۱۰، ۹۷-۷، ۱۰، ۱۰۰-۱۰، ۱۰۴-عنوان، ۱۴، ۱۰۵-۶، ۱۵، ۱۰۷-۱، ۱۰۹-۷ تا ۱۷، ۱۱۰-۲ تا ۳، ۱۲، ۱۱۱-۵، ۷، ۱۱۲-۸، ۱۱۳-۸، ۱۱۵-۷، ۱۱۸، ۱۰ تا ۱۱، ۱۱۹-۶، ۱۵، ۱۲۱-عنوان، ۹، ۱۴، ۱۲۲-۹ تا ۱۵ بشمول عنوان، ۱۲۳-۱ تا ۸، ۱۲۴-۵، ۱۲۶-۱، ۱۲۸-۱۰، ۱۲۹-عنوان، ۱۳۲-۱۷، ۱۳۴-۷، ۱۳۸-۷، ۱۰، ۱۳۹-۸، ۱۵، ۱۴۰-۳، ۱۴۱-۱ تا ۱۷، ۱۴۲-۱، ۵ تا ۶، ۱۳ تا ۱۵، ۱۴۳-۱، ۵، ۱۴۵-۱۳، ۱۵ صرف دوسرا مصرعہ، ۱۴، ۱۷ صرف پہلا مصرعہ، ۱۴۷-۲، ۱۴، ۱۴۸-۱، ۲، ۶، ۱۴۹-۸ سے آخر تک۔

ب۔ وہ اشعار اور عنوانات جو زیر نظر نسخہ میں موجود ہیں، لیکن مذکورہ نسخہ میں شامل نہیں۔ خالی جگہوں پر الفاظ یا تو پڑھے نہیں گئے یا کرم خوردہ ہیں۔
صفحہ نمبر........ شعر نمبر
۲۳-۱ کے بعد۔

وزیری جنہیں شہر یاری چناں
جہاں چوں مکر و قراری چناں

(۸-۶)

۲۴-۳ کے بعد۔ عنوان

دربیان سخاوت نواب صاحب گوید

(صفحہ ۹)

۲۵-۵ کے بعد۔

.... یہی عنوان دوبارہ لکھا ہے

(صفحہ ۱۰)

۲۷-۱۱ کے بعد: عنوان

بجناب فیضیاب نواب مستعاب گوید (کذا)

(صفحہ ۱۳)

۳۳-۱۲ کے بعد۔ عنوان

تولد شدن شاہزادہ بے نظیر گوید

(صفحہ ۱۸)

۳۶-۱ کے بعد

جہاں تک کہ تھے گایک اور نرت کار
ہنر اپنا کرنے لگے آشکار
جہاں تک کہ تھے ڈوم تہاڑی ہزار
لگے گانے اور ناچنے ایک بار
جہاں تک کہ سازندہ تھے ساز کے
دہنی دست کے اور آواز کے

(۲۱-۱ تا ۳)

ان تین اشعار کی جگہ نسخہ رشید حسن خاں میں دو شعر اس طرح ہیں۔
جہاں تک کہ سازندے تھے ساز کے
دھنی دست کے اور آواز کے

جہاں تک کہ تھے گائک اور تنت کار
لگے گانے اور ناچنے ایک بار

دیگر نسخوں میں سے "نسخہ مخزن" اور "نسخہ نو لکشور" میں بھی یہی اشعار اور یہی ترتیب ہے، جب کہ "نسخہ اول" میں نسخہ رشید حسن خاں کے تیسرے مصرعے کی بجائے زیر نظر نسخہ کا تیسرا مصرعہ اس طرح لکھا ہے۔

جہانتک کے تھے ڈوم ڈہاڑی ہزار

(ورق ۱۵ ب)

۶-۳۷ کے بعد۔

وہ دل .... ہاتھ پر دھر کے ہاتھ
اوچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ (کذا)

(۱۱-۲۲)

۳-۵۵ کے بعد۔

.... روتی تھی جو ....
تو بس روتی روتی کھڑی رہ گئی

(۸ ب-۱۵)

۵-۵۷ کے بعد۔ عنوان

رسیدن شاہزادہ درپرستان و شفقت نمودن
ماہ رخ پری نژاد

(صفحہ ۴۱)

۸-۵۸ کے بعد۔

پڑی کھکے سبھی وہ کچونکی نمود
جسے دیکھ نیلا ہو چرخ کبود

(۴۲-۵)

"نسخہ اول" میں بھی یہ شعر اس طرح موجود ہے ۔

پڑی کہنی سی بھی کچھ تکی نمود
لوسی دیکھ نیلا ہو چرخ کبود

(ورق ۳۲ ب)

۱۷-۷ کے بعد ۔

کھچے ابرو اور چشم مست غرور
بھرے گال چہرے کے خورشید نور

(۵۴-۱۱)

"نسخہ اول" میں بھی یہ شعر اس طرح موجود ہے ۔

کچی ابرو اور چشم مست غرور
بھری گال خورشید چہرکا نور

(ورق ۴۲ ب)

۷۳-۱۲ کے بعد ۔

بہم بستہ .... پیچ و تاب
گرہ دار شب از پس آفتاب

(۵۶-۱۲)

۷۴-۱۳ کے بعد ۔

یہ کہتی ہوئی ناز سے دلربا
دیئے ویسے قربان ظاہر قضا (کذا)

(۵۷-۱۳)

۷۶-۵ کے بعد ۔ عنوان

ملاقات مرتبہ اول بلبدر منیر شاہزادہ درباغ و عاشق شدن
(صفحہ ۵۹)

۷۶۔۱۲ کے بعد۔

وہ بیٹھے عجب (ایک انداز) سے
بدن کو چھپائے ہوئے ناز سے

(۶۰۔۱)

۷۹۔۱۶ کے بعد۔

وہ دن میں وہ دندان سلک گہر
وہ تھے شام کے (اصفہانی) سپر (کذا)

(۶۳۔۱)

کاتب نے اس شعر میں اصفہان کا املا اصفہان لکھا ہے۔
۱۰۵۔۱۶ کے بعد۔

ملی راکھ سارے بدن کے تئیں
کیا .... تن کے ....

(۸۷۔۱۴)

یہ شعر "نسخہ اول" میں اس طرح درج ہے۔

ملی راکہہ ساری بدن کی تیئں
کیا دندہا اپنی تن کی تیئں

(ورق ۶۹ الف)

۱۱۷۔۶ کے بعد۔

جو دیکھا کبھی تو لیا منہ کو موڑ
اسی طرح کرتے رہے توڑ جوڑ

(۱۔۹۹)

"نسخہ اول" میں مصرعہ ثانی اس طرح ہے۔

اسی طرح کرتی رہی جوڑ توڑ

(ورق ۸۷ ب)

۱۳۴۔۱۲ کے بعد۔

لگے پینے مل .... گھوٹ گھوٹ
لگے ہونے (کذا) آپس میں دل لوٹ پوٹ

(۲۔۱۱۶)

۱۳۸۔۹ کے بعد۔

جلی جو لگی پھولجھڑی آگ سے (کذا)
تو ہاتھی لگے ....

(۱۱۹۔۱۳)

۱۴۵۔۷ کے بعد۔

نجومی بلا پوچھ کے نیک دن
دیا ایک تاریخ اس کا لگن (کذا)
یہ اور ایک اتنی خوشی کی بہار (کذا)
لگا ہونے اسباب شادی تیار

بیاہ شدن نجم النساء با شاہزادہ فیروز شاہ کہ ....

کدھر ہے تو اے ساقیا لا شراب
وہ مے دے کہ دل کا اٹھا دے حجاب
مجھے مے کا نشا جو ہے اب ضرور
جو شادی کا ہے میرے دل کو سرور
لگا ہونے شادی کا آغاز کار

یہ ایک باغ فردوس کی تھی بہار
وہ مطرب جو کرنے لگے راگ و رنگ
جو آواز سے اٹھ کے پاتے ....
ہوئی ہر طرف مجلس آراستہ
سرانجام ہو جس کا دل خواستہ
عجب طور سے دھمک تردنگ کی
وہ آواز کانوں (میں) مردنگ کی
.... مرچنگ بین و رباب
جسے سن کے ذرہ کا .... (کذا)
وہ سارنگیوں کی صدا خوشنما
.... جو عالم کے ....
وہ طبلونکی باتیں وہ آواز ساز (کذا)
وہ گانا بجانا ....
وہ .... الاپیں وہ ....
تھی قربان ہونے ....

(۱۲۵ـ۴ تا ۱۴)

بچھی ہر طرف یوں خوشی کی بساط (کذا)
نہوگا کہیں ایسا عالم نشاط (کذا)
طوائف وہ .... جابجا
وہ (گلزار) قدرت کا تھا جا بجا
.... کی صورتیں
طلسمات قدرت کی تھیں مورتیں
مرصع کے زیور سے تھیں سب بھری

جسے دیکھ سورج کو ہو تڑ پڑی (کذا)
وہ تھیں جا بجا موج دریائے نور
پڑی تھیں جسے دیکھ غوطہ میں حور
بندھا ناچ کا اس جگہ جب سماں
لگے .... مہر و مہ سب وہاں
وہ .... بتانا طوائف کا یوں
چلے قتل کرنے کوئی شب کو جوں (کذا)
کسی کو .... سی
لگی تھی وہ ہیروں کی جیسے لڑی
کسی کی تھیں .... جو زلفیں پڑی
کہ تھا جیسے سورج، ....
وہ زیور، وہ پوشاک، وہ ان کی شان
تڑپ جائے بجلی کی دیکھے سے جان
.... رنگ دکھانے لگی
.... کو رجھانے لگی
اشارت بتانا وہ .... کے ساتھ
دکھانا کبھی رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ
دیئے بیٹھنا . . . .
کبھی ناز سے ان کو دیکھ ....
چمک کر کوئی اک اٹھا ناز سے
کبھی ناچتے آنا انداز سے
منہ چھپا . . . .
کبھی ناز سے آپ کو آ لیا

تعجب طلسمات جیسا خیال

(۱۲۶۔۱ تا ۱۶)

براتی زری پوش خورشید رو
ایدھر اور اودھر جا بجا سو بسو
کسی کی تھی خورشید سی پالکی
کسی کی تھی مہتاب سی ....
کوئی اپنے گھوڑے اڑاتے چلے
کوئی اپنے باجے بجاتے چلے
وہ دولہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار
وہ موتی جواہر کا ہونا نثار
وہ رستے وہ .... کا ہونا . . . .
یہ بھادوں میں جس طرح بادل کے . .
وہ .... وہ .... شان
جو .... جری یا دلیری نشان (کذا)
کوئی لے تصدق کو زر ....
تماشا کوئی ہر طرف دیکھتا
ہوا ایک خلقت کا وہاں اژدھام
تعجب کے عالم (میں) تھے خاص و عام
وہ دریائے قلزم کی تھی موج سی
وہ یاشہ سکندر کی تھی فوج سی (کذا)
ہوئی . . . . کے
پڑی ...... کے عالم ...... آواز کے
ملبس زری میں وہ .... سمند

چمک جس کی تھی چاندنی سے دو چند
تجمل کے چلتے تھے تخت رواں
وہ (گلزار) فردوس کا تھا نشاں
جب .... منزل پہ آئی برات
عجب طور کا وہاں ہوا ....
وہ توپوں کے .... نقاروں کے . . .
پڑا چرخ میں دھوم کا ....
ہوا آتش اوپر وہ آتش کا کھیل
ہوا .... وہ مہتاب کے ....
نکلتے ستارے . . . . (۲۷ا ۱ تا ۱۱)

ہو جیسے وہ .... پھول اور وہ انار
.... ہر طرف بے شمار
قطار و قطار ....
وہ (گلزار) دلکش کی تھی جو بہار
پٹاخے برابر لگے چھوٹنے
مچی دھوم کبوتر لگے چھوٹنے (کذا)
ہوا اس طرح کا وہاں جب . . . . .
دیئے سب .... دیئے دل کے چار
ہوا جب نکاح (پھر) ہوا کچھ ہجوم (کذا)
وہی (چونچلے) اور وہی سب رسوم
ہوا ان کی قسمت کا وہ سب نثار
ہوئے ان کے جو دل کے مارے تھے . . . (۲۸ا ۱ تا ۶)

(مطبوعہ۔ ''اردو'' کراچی' اکتوبر ۱۹۸۶ء)

دیوان اول مصحفی کا ایک قلمی نسخہ

زیر نظر نسخہ، جس کا تعارف مقصود ہے، راقم کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ نامکمل ہے اور اس میں اطراف و درمیان کے کئی اوراق موجود نہیں ہیں۔ موجودہ حالت میں یہ محض ان اوراق پر مشتمل ہے۔

۱۱۲، ۱۱۷-۱۳۴، ۱۳۷، ۱۴۰، ۲۴۵، ۲۳۲-۲۳۳، ۲۳۶-۲۳۷-۲۴۲-۲۴۷۔

ان کی مجموعی تعداد ۳۲ ہے۔ تقطیع ۶x۹ انچ اور فی صفحہ ۱۳ سطریں ہیں۔ کاغذ عمدہ، دبیز اور زردی مائل ہے۔ چونکہ قدرے کرم خوردہ اور آب رسیدہ ہے۔ اس لئے بعض مقامات پر کچھ الفاظ متاثر ہوئے ہیں۔ پورا نسخہ سیاہ روشنائی اور ایک قلم سے صاف و جلی خوش خط نستعلیق میں کتابت ہوا ہے۔ ہر جگہ تخلص کو شنگرفی روشنائی سے لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع دوم میں اس کی کتابت کی گئی ہے۔

مصحفی کا دیوان اول، کلیات مصحفی کے سلسلے میں ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے اختلاف نسخ پر مبنی ضروری حواشی کے ساتھ مختلف دستیاب نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ اس ترتیب کے مطابق دیوان اول، میں کل ۷۰۹ غزلیں اور مسدس، مخمس اور مثنویات ہیں۔ لیکن زیر نظر نسخہ موجودہ حالت میں محض حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ مطبوعہ دیوان اول، کے مطابق غزل نمبر ۳۲۱ کے مقطع کے مصرعہ ثانی سے شروع ہوتا ہے۔ اور غزل نمبر ۷۰۵ پر اس کا اختتام ہوا ہے۔ غزل نمبر

۳۱۹ اور ۳۵۹ اس میں علی الترتیب ۳۲۳ اور ۳۶۹ کے بعد تحریر ہوئی ہیں۔ چونکہ نسخہ منتشر اوراق پر مشتمل ہے اس لئے بعض غزلیں ناکمل ہیں اور بعض غزلوں کے تو محض ایک یا دو شعر ہی موجود ہیں۔ جو غزلیں مکمل ہیں یہاں ان کی نشاندہی مطبوعہ دیوان اول' کے مقابلے سے کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق زیر نظر نسخے میں یہ غزلیں مکمل ہیں۔

(غزلوں کے نمبر مطبوعہ دیوان اول' کے مطابق ہیں)

۳۱۹، ۳۲۲۔۳۲۳، ۳۳۷۔۳۸۵، ۳۹۲۔۳۹۳، ۴۰۰۔۴۰۱، ۶۳۹۔۶۴۱، ۶۶۱۔۶۶۶، ۶۷۳۔۶۷۷، ۶۹۱۔۷۰۵

کل مکمل غزلیں = ۸۵

اوراق ضائع ہونے کے سبب ناکمل غزلیں۔

نمبر.................. جو اشعار یا مصرعے نسخے میں موجود ہیں۔

۳۲۱.................. صرف مقطع کا مصرعہ ثانی

۳۲۴.................. صرف مقطع

۳۳۶.................. صرف مقطع

۳۸۶.................. ۱ تا ۸

۳۹۴.................. ۱ تا ۳

۳۹۹.................. ۱۴ تا ۱۵

۴۰۲.................. ۱ تا ۲

۶۳۸.................. ۶ تا ۷

۶۴۲.................. ۱ تا ۴

۶۶۰.................. ۴ تا ۶

۶۶۷.................. ۱ تا ۳

۶۷۲.................. صرف مقطع

۶۷۸ .... ۱ تا ۱۱

۶۹۰ .... ۹ تا ۱۱

مطبوعہ دیوان اول' کے مقابلے میں نسخے کی بعض غزلوں میں کچھ اشعار بھی کم ہیں' جن کی تفصیل یہ ہے۔

نمبر.............. شعر نمبر' جو موجود نہیں

۳۴۲ .... ۶

۳۵۲ .... ۶

۳۸۱ .... ۸

۶۶۴ .... ۲

۷۰۱ .... ۶

مطبوعہ دیوان اول میں مخطوطے کا ایک شعر موجود نہیں ہے' جو درج ذیل ہے۔

۳۴۷-۹ کے بعد

نہیں اوسکیی صلح و جنگ سیی خالی ہر ایک شب
رتا ہیی ساتھ رکھکیی وہ تلوار درمیان

(ورق-۱۴۰' ب)

املا کے تعلق سے اس میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو اس کے آس پاس کے عہد میں لکھے جانے والے عام نسخوں میں نظر آتی ہیں۔ عام طور پر الفاظ کو مرکب شکل میں لکھا گیا ہے' جہاں یائے "زائد" کی ضرورت تھی وہاں بعض اوقات یائی مجہول استعمال کی گئی ہے اور عام طور پر یائے مجہول کو یائے معروف کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں املا کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ گ' کو بیشتر الفاظ میں ایک ہی مرکز کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس نسخے میں اختلاف نسخ بھی موجود ہے۔ جس کی نشاندہی یہاں ذیل میں کی جاتی ہے۔

مطبوعہ	قلمی
۳۱۹-۳ ۔ (غزل ۳۱۹، شعر ۳)	ورق ۱۱۲، الف
.... گزر جائیں گے جی سے	.... گذر جائیں گے جی سے
.... ۴	۱۱۲، الف
آنے دو اسے	آتی وہ اسے ....
.... ۷	۱۱۳، ب
.... بچانے کے نہیں ہم	.... پہچانے کے نہیں ہم
۳۲۲-۱	۱۱۳، الف
کیا وصل کی شب کا	کیا وصل کی شب کے ....
۳۲۳-۵	۱۱۳، ب
والے بے صبری	والے بے صبر.........
۳۳۶-۸	۱۱۷، الف
.... ہوا کیوں تو دربدر	.... ہوا کیوں تو روبرو
۳۳۷-۴	۱۱۷، الف
پوچھا نہ کسی نے	پوچھا نہ کسی سے ....
.... ۵	۱۱۷، الف
.... اب بھلا رہا کون	.... اب یہاں رہا کون
۳۴۱-۶	۱۱۸، ب
جنھوں کے دست و دل ریو و ریا سے	جنھوں کے دست و دل رو و ریا سے
۳۴۲-۲	۱۱۸، ب
.... ہاتھ پاؤں چلتے ہیں	.... ہاتھ پاؤں جلتے ہیں

۳۴۴-۲	۱۱۹، الف
.... کھاتا ہے اگر پان	.... کھاتا ہے وہ گر پان
۳۴۹-۴	۱۲۱، الف
.... کتنوں کی جانیں نکالیاں	.... کشتوں کی جانیں نکالیاں
۳۵۲-۴	۱۲۲، الف
نظریں وے پیاری	نظریں وہ پیاری ....
۳۵۴-۱	۱۲۲، ب
.... بتاں میں وہ نہیں	.... بیاں میں وہ نہیں
.... ۲	۱۲۲، ب
.... تم عاجز سے	.... اس عاجز سے
.... ۵	۱۲۲، ب
وہ جو اک ناز	وہ جو ایک یار ....
۳۵۶-۲	۱۲۳، الف
.... روتا ہے چلا اے قاصد	.... روتا چلا ہے اے قاصد
۳۵۹-۱۲	۱۲۸، الف
.... گرچہ پلکوں سے	.... گرچہ پلکوں نے
۳۶۰-۱	۱۲۴، الف
وے آنکھیں	وہ آنکھیں ....
۳۶۱-۱	۱۲۴، ب
یا اب اک جھپکی کو	یا اب ایک جھمکی کو ....
.... ۱۱	۱۲۵، الف
ہیں یہ وے لوگ	ہیں یہ وہ لوگ ....
۳۶۲-۱	۱۲۵، الف

عشق ہے آفت و بلا	ہے یہ عشق آفت و بلا ....
۳۶۴-۶	۱۲۵، ب
نے زلف دیکھتے ہیں نے خال دیکھتے ہیں	نہ زلف دیکھتے ہیں نہ خال دیکھتے ہیں
.... ۷	۱۲۵، ب
یا ہم اب اس کی جاگہ	یا اب ہم اوس کی جاگہ ....
۳۶۵-۱۱	۱۲۶، ب
نہر بن مو پہ مرے	ہر بن مو پہ تیرے ....
۳۶۶-۳	۱۲۶، ب
.... جہاں چاہ ہی نہیں	.... جہاں جاہ ہی نہیں
.... ۶	۱۲۶، ب
لکھا ہے اس نے	لکھا ہے اون نے ....
۳۶۸-۲	۱۲۷، ب
ان کو جو موے	اون کو جو ہوئے ....
.... ۶	۱۲۷، ب
.... مرے تار نفس میں	میرے ہار قفس میں ....
.... ۷	۱۲۷، ب
اک بیت کہیں	ایک بیت کہوں ....
۳۶۹-۴	۱۲۷، ب
مرا دل زلفوں کے حلقوں سے ہرگز بچ نہیں سکتا	میرا دل زلف کے حلقوں سے ہرگز چھپ نہیں سکتا
۳۷۰-۴	۱۲۸، ب
ابھی وے تو	ابھی وہ تو ....
۳۷۱-۲	۱۲۹، الف
گل اپنے دور پیرہن پر	گل اپنے دور پیرہن پہ ....

.... ۴	۱۲۹، الف
قیامت ماجرا اس نلچ میں گزرا سحر ہوتے	قیامت ماجرا اس تلج میں گذرا سحر ہو لی
.... ۵	۱۲۹، الف
کسونے لے کے جیسے چینٹیاں	کسونے لے کے جیسے چٹیاں ....
۷۴۔۳۔۲	۱۲۹، الف
سو ہووے ۔ ہلے	سو ہووے ہمہ ....
۷۴۔۳۔۶	۱۳۰، الف
.... شب تار کے پھریں	.... شب یار کے پھریں
.... ۹	۱۳۰، ب
.... چہرے پہ بلبلیں	.... چہرے پہ یہ لٹیں
جوں پیچ گرد چہرۂ گلنار	جوں پیچ گرد چہرۂ گلنار ....
۷۵۔۳۔۱	۱۳۰، ب
نے محرم قفس نہ	نہ محرم قفس نہ ....
۷۶۔۳۔۱	۱۳۰، ب
اس نے تیری سی	اون نے تیری سی ....
۷۷۔۳۔۴	۱۳۱، الف
شیشہ دل کو مرے	سینہ دل کو مرے ....
۷۹۔۳۔۴	۱۳۲، الف
ہمارے حق میں وے	ہمارے حق میں وہ ....
.... ۷	۱۳۲، الف
جہاں گرم ان کی	زبس گرم ان کی ....
.... ۸	۱۳۲، الف
وہی چھنیں	وہی پچھیں ....

۳۸۱-۱۰

.... وصف ہیں یہ

.... ۱

اس نے ایسی تو ....

۳۸۲-۱

.... مرزا محمدی خاں

...... ۶

تا قطع کریں وہ ....

.... ۸

.... وے بلبل خوش

.... ۹

.... اپنی غزل سنا دے

۳۸۳-۲

.... ملے وہ مژگاں

۳۸۵-۱۱

زمانے کا دیکھا ہے میں نے بہت کچھ
مجھے یاد ایسے زمانے بہت ہیں

.... ۱۲

زمانے کا شکوہ نہ کر ہم سے ہمدم
سخن اور کہہ کچھ فسانے بہت ہیں

۳۹۲-۱

ہم لگے جاتے ہیں جو ....

.... ۲

۱۳۲، ب

.... وصف میں یہ

۱۳۳، الف

اس نے تو ایسی ....

۱۳۳، الف

مرزا محمدی خان

۱۳۳، الف

تا قطع کریں وہ ....

۱۳۳، الف

.... وہ بلبل خوش الحاں

۱۳۳، الف

.... اپنی غزل سنا تو

۱۳۳، ب

.... ملے وہ مژگاں

۱۳۴، ب

زمانے کا دیکھا ہے میں نے بہت کچھ
سخن اور کہہ کچھ فسانے بہت ہیں

۱۳۴، ب

زمانے کا شکوہ نہ کر مجھ سے ہمدم
مجھے یاد ایسے زمانے بہت ہیں

۱۳۷، الف

ہم لگے جاتے ہیں جو ....

۱۳۷، الف

رات دن بیٹھے یوں ہی	رات دن بیٹھے ہوئے ....
.... ۴	۱۳۷، الف
آپ کیا مجھ سے بھی	اب کیا مجھ سے بھی ....
۱-۳۹۴	۱۳۷، ب
عشق کی ابتدا	عشق کی ابتدا ....
۱-۴۰۰	۱۴۰، الف
وے قتل پر ہمارے	وہ قتل پر ہمارے ....
.... ۳	۱۴۰، الف
رونے کا اپنے ہم بھی	رونے کا ہم بھی یارو ....
.... ۴	۱۴۰، الف
کیا خود نما ہیں یارو	کیا خود نما ہوئے ہیں یارو........
.... ۹	۱۴۰، الف
آگاہ وے نہیں	آگاہ وہ نہیں ....
۱-۴۰۱	۱۴۰، ب
کس مست کی لو ہو سی	کس مست کی آہو سی........
.... ۴	۱۴۰، ب
جب کھول دیا ہے تو وے	جب کھول دیا ہے تو وہ........
.... ۷	۱۴۰، ب
جب نام تیرا نکلا منہ سے ہے......	جب نام تیرا منہ سے نکلا ہے......
۲-۴۰۲	۱۴۰، ب
یا خود ہی میں	یا خود میں ہی ....
۲-۴۳۹	۲۲۵، الف
.... تزئین کیا ہے اس کو	.... تزئین کیا ہے اون کو

۶۴۰-۵	۲۲۵، ب
تجھ بن تو ہم نے وے بھی....	تجھ بن تو ہم نے وہ بھی......
۶۴۲-۳	۲۲۵، ب
.... اس نے پھر عکس دیکھا	... . اس نے بر عکس دیکھا
لی اپنی ہی صورت	لئے اپنی صورت ....
۶۶۲-۷	۲۳۲، ب
اس کا نت یاں	اوس کا یہاں نت .....
۶۶۳-۷	۲۳۲، ب
نے ذکر ہے، نے شغل ہے، نے یاد خدا ہے	نہ ذکر ہے نہ شغل ہے نہ یاد خدا ہے
۶۶۵-۴	۲۳۳، الف
سنا کیں..........	سنا کہیں ....
.... ۵	۲۳۳، الف
نہ ہنسنا بولنا نے اس طرف ہی کا نظر کرنا	نہ ہنسنا بولنا نہ اس طرف گاہے نظر کرنا
۶۶۶-۲	۲۳۳، ب
.... ایدھر سے نہ وے گزرے	.... ایدھر سے نہ وہ گزرے
۶۷۳-۱	۲۳۶، الف
جب تو بھی تکے میری طرف	جب میری طرح تو بھی تکے ....
.... ۷	۲۳۶، الف
از بس کہ تو پیارا ہے	از بس تو پیارا ہے.........
۶۷۴-۱	۲۳۶، الف
وے جو ہم لوگوں سے	وہ ہم لوگوں سے ....
جی کے دشمن	جب کہ دشمن ....
.... ۳	۲۳۶، الف

وے جو جی اٹھتے	وہ جو جی اٹھتے ....
.... ۴	۲۳۶، ب
.... جائے ہے بہر نماز	.... جائے ہے پڑھنے نماز ....
۶۷۵-۲	۲۳۶، ب
.... جہاں ہوں وے	.... جہاں ہوں وہ
۶۹۰-۱۱	۲۴۲، الف
.... دل پر تو مٹا ہے	.... دل پر تو ہٹا ہے
۶۹۳-۵	۴۲، ب
.... سیل کی رہ گذر میں	سیاں اس رہ گذر میں
عجب ہے گر	عجب ہے کہ ....
.... ۱۱	۲۴۳، الف
جو وعدے پہ اپنے	جو وعدے پر اپنے ....
.... ۱۳	۲۴۳، الف
..... بے ہوشیاں ہی ہوئیں یاں	..... بے ہوشیاں ہیں ہوئیں یہاں
۶۹۴-۶	۲۴۳، الف
وہ جو اک ٹیس سی ہے	وہ جو ایک ٹیس سی تھی ....
رہ کے بے اختیار	وہ کہ بے اختیار.........
۶۹۶-۴	۲۴۴، الف
تیغ کے ساتھ یہاں	تیغ کے ساتھ جہاں ....
.... ۷	۲۴۴، الف
مصحفی ہم تو تیرے ملنے کو آئے کئی بار	ہم تو تیرے ملنے کو آئے کئی بار مصحفی
۶۹۷-۱	۲۴۴، الف
.... چاہ اپنی جتا گئے	.... چاہ اپنی دکھا گئے

۴	۲۴۴، الف
.... کسو ساتھ آنکھیں ملا ملا	.... کسی ساتھ آنکھیں ملا ملا
.... آنکھیں چرا گئے	.... نظریں چرا گئے
۵	۲۴۴، الف
.... وے برنگ موج ہوا گئے	.... وہ برنگ موج ہوا گئے
۶	۲۴۴، الف
.... دوں ہی گات اپنی چھپا گئے	.... وہیں گات اپنی چھپا گئے
۷	۲۴۴، الف
نہ چلے جنازے کے ساتھ وے......	نہ چلے جنازے کے ساتھ وہ......
۸	۲۴۴، الف
یوں ہی کہنے سننے سے	یوں ہی کہنے سننے کو ....
۹	۲۴۴، الف
.... بھلا اس میں کیا ہے بھلا برا	تمہیں اس میں کیا ہے بھلا برا
۶۹۸۔۲	۲۴۴، ب
.... ان کی بیزاری تو مشکل ہے	.... اور بیزاری تو مشکل ہے
۸	۲۴۴، ب
.... داد محبت میں	.... داؤ محبت میں
۶۹۹۔۲	۲۴۴، ب
ہر لحظہ تم کو آئینہ........	ہر لحظہ بن کے آئینہ........
۶	۲۴۵، الف
سب چاہئے ہے زیست کو........	سب چاہئے ہے عیش کو........

مطبوعہ غزل ۷۰۱ میں ردیف عباسی استعمال ہوئی ہے، جب کہ قلمی نسخے میں یہ ردیف عیاشی تحریر ہے (ورق ۲۴۵، ب۔ ۲۴۶، الف)

۷۰۱-۸	۲، الف
.... خوش نہیں آتی	.... خوش انہیں آتی
۷۰۲-۹	۲۴۶، ب
.... کچھ کا کچھ کہا	.... کچھ کچھ ہی کہا
۷۰۳-۸	۲۴۶، ب
.... روتا ہوں	.... رویا ہوں
.... شرز طوفاں سے	.... شور طوفاں سے

(مطبوعہ - "اردو" کراچی، اپریل ۱۹۷۸ء)

علی ابراہیم خاں

کمپنی کے دورِ ملازمت کی ایک نادر تحریر

شاعر[۱] تذکرہ نویس اور مورخ علی ابراہیم خاں (۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء-۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء) نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت[۲] ۱۷۸۱ء میں اختیار کی۔ علی وردی خان (متوفی ۱۷۵۶ء) کے زمانہ اقتدار میں اپنی جائے پیدائش شیخوپورہ' نزد عظیم آباد' سے مرشد آباد آئے تھے[۲] جہاں وہ میر قاسم خاں عالی جاہ (متوفی ۱۷۷۷ء) کی نیابت لور مشاورت میں رہے' جو ان کا ایک قریبی دوست[۳] لور بنگال' بہار اور اڑیسہ کا نواب ناظم تھا۔ اس نے ۱۷۶۰ء میں علی ابزاہیم خاں کو اپنا مشیر لور داروغہ مقرر کیا لور وقتاً فوقتاً متعدد اہم ذمے داریاں سپرد کیں[۴] ۱۷۶۳ء میں میر قاسم کے زوال کے بعد اولاً خانہ نشینی اختیار کی' لیکن علی وردی خاں کے ایک قریبی عزیز مرزا کاظم[۵] کے تحفظ میں مرشد آباد پہنچے' جہاں بنگال کے نائب ناظم اور نائب دیوان محمد رضا خاں (۱۷۱۷ء-۱۷۹۱ء) اور ان کے احباب و رفقاء میں گرم جوشی سے قبول کئے گئے۔[۶] محمد رضا خان نے اپنے اختیارات کے تحت انہیں "دیوان سرکار" نامزد کیا۔[۷] کئی مواقع پر علی ابراہیم خاں نے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء-۱۷۸۵ء) اور محمد رضا خان کے مابین تعلقات کی استواری میں بھی معلونت کی تھی۔[۸] ۱۷۷۷ء میں رضا خان نے انہیں سبکدوش کر دیا' چنانچہ وہ کچھ عرصہ گوشہ نشین رہے' یہاں

تک کہ ۱۷۸۱ء میں انہوں نے راست ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ وارن ہیسٹنگز علی ابراہیم خاں کی صلاحیتوں اور لیاقتوں کا قدر شناس تھا۔[۹] ۱۷۸۰ء میں انہیں اپنے ساتھ لکھنؤ لے گیا اور نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء۔۱۷۹۵ء) سے متعارف کرایا' جس نے علی ابراہیم خاں کو خلعت عطا کی اور مغل شہنشاہ شاہ عالم (۱۷۵۹ء۔۱۸۰۶ء) نے امین الدولہ ' عزیز الملک ' نصیر جنگ ' بہادر کا خطاب اور جاگیر عطا کی۔[۱۰] وارن ہیسٹنگز نے ایک موقع پر علی ابراہیم خان کو اعلیٰ مناصب کی پیش کش کی تھی لیکن انہوں نے بعض وجوہات کے سبب انہیں قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی[۱۱]" لیکن جب ہیسٹنگز نے ستمبر ۱۷۸۱ء میں بنارس کا دورہ کیا اور صوبے کی بڑھتی ہوئی آمدنی کے باعث' کہ جو چالیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی' ضلع میں ایک مستقل مجسٹریٹ کا تقرر ناگزیر ہو گیا[۱۲] تو اس عہدے پر علی ابراہیم خاں کا تقرر عمل میں آیا' جسے انہوں نے ۱۲ر نومبر ۱۷۸۱ء کو قبول کر لیا۔ وہ چیف مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے[۱۳]۔ ۳ر دسمبر ۱۷۸۱ء اور ۸ر اپریل ۱۷۸۲ء کو کمپنی نے ان کی عمدہ خدمات کا اعتراف کیا[۱۴] اور ۲۴ر مارچ ۱۷۸۳ء کو ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر کے انہیں بنارس کا گورنر بنا دیا گیا[۱۵]۔ یہاں اپنی خدمات پر وہ اپنے انتقال ۱۷۹۴ء تک فائز رہے[۱۶]۔

کمپنی کی ملازمت کے باوجود غالباً" علی ابراہیم خاں نے بہت باثروت زندگی نہیں گزاری[۱۷]" چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ان کے ایک فرزند محمد علی خان نے کمپنی کی ذمہ داریوں کی خدمت میں اولاً" ۲۱ر نومبر ۱۸۰۱ء کو وظیفے میں اضافے کے لئے اور پھر ۲۹ر دسمبر ۱۸۰۱ء کو اپنی خستہ حالی کے حوالے سے طلب معاونت بذریعہ ملازمت کی درخواستیں پیش کیں[۱۸]۔

کمپنی کی ملازمت کے دوران علی ابراہیم خان کی ان اہم تصانیف کا ذکر بالعموم دستیاب ہے۔

ا۔ "سانحہ راجہ چیت سنگھ" راجہ چیت سنگھ والئی بنارس کی بغاوت کے واقعات'

۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء

۲۔ "خلاصۃ الکلام" تذکرہ شعرائے مثنوی گو، ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء

۳۔ "گلزار ابراہیم" تذکرہ شعرائے اردو، مصنف نے دیباچے میں اس کا سال اختتام ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۵ء بتایا ہے، لیکن اغلب ہے کہ اس میں ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۴ء تک اضافے ہوتے رہے[۱۹] اس کا سال آغاز معلوم نہیں، لیکن ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں، کہ میر سوز کے حال میں اسے سال حال بتایا ہے، یہ زیر تحریر تھا۔

۴۔ "وقائع جنگ مرہٹہ" ۱۲۰۱ھ/۷۔۱۷۸۶ء[۲۰]

۵۔ "صحف ابراہیم" تذکرہ شعرائے فارسی، ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء[۲۱]

۶۔ "سوانح مجملی حیدر علی خاں بہادر حاکم میسور"

۷۔ "ریاض المنشات" مجموعہ مکاتیب، جس میں وارن ہیسٹنگز اور دیگر عمائدین اور احباب و اقارب کے نام خطوط شامل ہیں[۲۲]۔

۸۔ "رقعات، اسناد و دستاویزات"[۲۳]

۹۔ "مکاتیب و وقائع" بنام لارڈ کارنوالس (۱۷۸۶ء۔ ۱۷۹۳ء)[۲۴]

ان تصانیف کے علاوہ ان کی ایک اور تحریر ہے، جو ان کی تصانیف کی کسی فہرست میں شامل نہیں ہے اور بالعموم عدم دستیاب ہے۔ یہ

"On the Trial by Ordeal among Hindus"

کے عنوان سے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کے اولین تحقیقی مجلے "Asiatic Researches" کے پہلے شمارے، جنوری ۱۷۸۹ء میں شائع ہوئی، جو سوسائٹی کے بانی و صدر سر ولیم جونز کی ادارت میں شائع ہوا تھا[۲۵]۔ جونز سے علی ابراہیم خاں کی ملاقات بنارس میں ہوئی تھی[۲۶] ہمیں علی ابراہیم خان نے جونز کو، جو ہندو مذہب اور قوانین کے بارے میں ہندو پنڈتوں سے معلومات حاصل کر رہا تھا، اس موضوع پر ایک قدیم سنسکرت تصنیف، منودھرم شاستر، کا حوالہ دیا، جو مقدس تھی اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ منو پر برہما کی جانب سے نازل ہوئی

ہے[۲۷]۔ جونز نے اس تصنیف کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے علی ابراہیم خاں کو اس کے فارسی ترجمے کے لئے آمادہ کرنا چاہا' لیکن انہوں نے معذرت کر لی اور ان کی عدالت کے پنڈتوں نے بھی اس بنیاد پر کہ یہ ایک مقدس تصنیف ہے' اس کے ترجمے سے انکار کر دیا[۲۸]۔

علی ابراہیم خاں نے جونز کو میرزا خان ابن فخرالدین محمد کی تصنیف "تحفتہ الہند" پیش کی تھی۔ یہ تصنیف ہندی صرف و نحو' عروض و قافیہ اور بدیع و بیان' ہندی موسیقی' قیافہ وغیرہ پر مشتمل ہے[۲۹]۔ علی ابراہیم خاں نے جو نسخہ جونز کو پیش کیا تھا وہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے[۳۰]۔

بنارس سے واپسی کے بعد جونز اور علی ابراہیم خاں کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت ہوتی رہی۔ جونز اس بات کا قائل تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ سنسکرت' عربی اور فارسی پر عبور حاصل کئے بغیر ناممکن ہے اور ان زبانوں کے ماخذ کی تشریحات کے لئے برہمن پنڈتوں اور مسلمان علماء سے معاونت ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں وہ علی ابراہیم خاں کی معاونت اور دوستی کا معترف تھا[۳۱]۔

علی ابراہیم خاں کا مذکورہ نادر مضمون' جو فارسی زبان میں لکھا گیا تھا' ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسہ منعقدہ کلکتہ ۲۰ر جون ۱۷۸۴ء میں پیش ہوا اور زیر بحث آیا[۳۲]۔ پھر "Asiatic Researches" کے لئے اسے وارن ہیسٹنگز نے انگریزی میں منتقل کیا۔ ہیسٹنگز نہ صرف ایشیاٹک سوسائٹی کا مربی اور ہندوستان میں مشرقی علوم کا ایک مثالی سرپرست حکمران تھا۔[۳۳] بلکہ جونز اور علی ابراہیم خاں دونوں سے خلوص اور اعتراف کی نسبتیں بھی رکھتا تھا۔ جونز کی ایما پر علی ابراہیم خاں کے مضمون کے ترجمے کے پس پشت یہی نسبتیں کارفرما ہوں گی۔ مضمون کا آغاز یہ یوں ہے۔

ہندوؤں میں سچائی کے آزمائشی امتحان

از علی ابراہیم خاں

چیف مجسٹریٹ' بنارس

ترسیل از وارن ہیسٹنگز صاحب[۳۴]

ذیل میں اس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے' تمام حواشی راقم کے تحریر کردہ ہیں۔

"ہندوؤں میں سچائی کے آزمائشی امتحان"[۳۵]

زیر تفتیش مجرموں کی دیوتاؤں سے التجا کے طریقوں کی' جو متکیشرا[۳۶] یا دھرم شاستر[۳۷] کی شرح کے باب سوگند' میں اور ہندو قوانین کی دوسری قدیم کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں' یہاں ذیل میں یہ بھی خولہ اپنی نوع انسان علی ابراہیم خان لائق پنڈتوں کی تفسیر کے مطابق مناسب صورت میں تشریح کر رہا ہے۔

لفظ دیوتا[۳۸] سنسکرت میں' پر یکیشا[۳۹] یا بھاشا میں پر یکھیا[۴۰] عربی میں قسم' اور فارسی میں سوگند' کے ہم معنی ہے' جو ایک قسم یا خداتعالیٰ سے حتمی صداقت کی تصدیق کے لئے دعا کرنے کی ایک صورت ہے' لیکن یہ عام طور پر سچائی کے آزمائشی امتحان کے مفہوم سے یا قادر مطلق کی فوری توجہ کے لئے التجا کی ایک قسم سے تعبیر کی جاتی ہے۔

یہ آزمائشی امتحان ۹ طریقوں سے انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلا ترازو کے ذریعے' دوسرا آگ' تیسرا پانی' چوتھا زہر' پانچوں کوش[۴۱] یا اس پانی کے ذریعے جس میں کوئی بت دھویا گیا ہو' چھٹا چاول' ساتواں کھولتے ہوئے تیل' آٹھواں سرخ گرم لوہے' نواں شبیہوں کے ذریعے۔

ا۔ ترازو کے ذریعے آزمائش اس طرح کی جاتی ہے۔ ترازو کی ڈنڈی کو پہلے ہی سے ڈوریوں اور پلڑوں کے ساتھ تیار رکھا جاتا ہے۔ ملزم اور پنڈت دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور پھر ملزم کو مقدس پانی میں نہلانے' آگ میں نذر چڑھانے اور بھگوان کی پوجا کے بعد احتیاط سے تولا جاتا ہے

اور جب اسے ترازو سے نکالا جاتا ہے تو چند پنڈت رینگتے ہوئے اس کے سامنے آتے ہیں اور شاستر کے مخصوص منتر پڑھتے ہیں' پھر ایک کاغذ کے ایک ٹکڑے پر فرد جرم لکھ کر ملزم کے سر پر باندھ دیتے ہیں اور چھ منٹ کے بعد اسے دوبارہ ترازو میں چڑھاتے ہیں۔ اگر اس کا وزن پہلے سے بڑھ جاتا ہے تو اسے مجرم قرار دے دیا جاتا ہے اور اگر کم ہوتا ہے تو بے قصور سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر برابر ہوتا ہے تو اسے تیسری مرتبہ تولا جاتا ہے۔ جب اس کے وزن میں' جیسا کہ 'متکشیرا' میں لکھا ہے' فرق محسوس ہو' یا ترازو' مضبوطی سے بندھا ہونے کے باوجود ٹوٹ جائے تو اسے ملزم کے جرم کا ثبوت سمجھا جائے گا۔

۲۔ آگ کے ذریعے آزمائش کے لئے زمین میں ایک نو ہاتھ لمبا' دو بالشت چوڑا اور ایک بالشت گہرا گڑھا کھودا جاتا ہے اور اسے پیپل کی لکڑی کے انگاروں کے ذریعے بھر دیا جاتا ہے اور ملزم کو اس میں ننگے پاؤں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اگر اس کے پیر نہ جلیں تو اسے بے قصور اور اگر جل جائیں تو قصور وار قرار دیا جاتا ہے۔

۳۔ پانی کے ذریعے آزمائش ملزم کو ایک معقول یا اس کی ناف کی گہرائی کے بہتے یا ٹھہرے ہوئے پانی میں کھڑا کر کے کی جاتی ہے۔ یہ احتیاط کر لی جاتی ہے کہ اس پانی میں کوئی مضر جانور موجود نہ ہو اور اس میں اونچی موجیں بھی نہ اٹھتی ہوں پھر ایک برہمن کو ہاتھ میں ڈنڈا لے کر پانی میں جانے کی ہدایت کی جاتی ہے اور ایک سپاہی بیت کی ایک کمان سے خشک زمین پر تین تیر چلاتا ہے اور ایک شخص کو سب سے زیادہ دور تک جانے والے تیر کو لانے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ جب وہ اسے واپس لے آتا ہے تو دوسرے شخص کو پانی کے کنارے دوڑنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اسی لمحے ملزم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ پانی میں غوطہ لگا کر

برہمن کے پیر یا ڈنڈے کو پکڑے اور اس وقت تک غوطہ لگائے رکھے جب تک کہ وہ دو اشخاص' جو تیر لانے کے لئے بھیجے گئے تھے' واپس نہ آ جائیں۔ اگر ان افراد کے واپس آنے سے پہلے ملزم پانی کی سطح پر اپنا سر یا جسم باہر نکالے تو اس کے جرم کو ثابت سمجھا جائے گا۔ بنارس کے قریب ایک گاؤں میں' ایک ایسے فرد کے لئے' جسے ایسی آزمائش سے گزارا جاتا ہے' یہ عمل جاری ہے کہ اس سے اس کی ناف کے برابر پانی میں ایک برہمن کے پیر کو پکڑ کر اتنی دیر تک کے لئے غوطہ لگوایا جاتا ہے کہ ایک آدمی پچاس قدم آہستہ چل سکے۔ اگر اس آدمی کے پچاس قدم مکمل کرنے سے قبل ملزم پانی سے باہر نکل آئے تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے' ورنہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔

۴۔ زہر کے ذریعہ آزمائش کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی' پنڈتوں کے نذر چڑھانے اور ملزم کے پاک صاف ہونے کے بعد ایک زہریلی بوٹی' وشناگ [۴۲] ڈھائی رتی' یا جو کے سات دانوں کی مساوی مقدار میں' یا سنکھیا' چھ ماشے یا ۴۳ رتی مکھن میں ملائی جاتی ہے' جسے ملزم کو ایک پنڈت کے ہاتھ سے کھانا پڑتا ہے۔ اگر زہر کا کوئی نمایاں اثر نہ ہو تو اسے رہا کر دیا جاتا ہے' ورنہ مجرم سمجھا جاتا ہے۔ دوسری' پھن والے سانپ کو' جسے ناگ کہا جاتا ہے' مٹی کے ایک گہرے برتن میں پھینکا جاتا ہے اور اس میں ایک چھلا' ہار یا سکہ ڈال دیا جاتا ہے۔ ملزم کو اسے ہاتھ سے نکالنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اگر سانپ اسے کاٹتا ہے تو اسے مجرم' ورنہ بے قصور قرار دیا جاتا ہے۔

۵۔ پینے کے پانی کے ذریعے آزمائش اس طرح کی جاتی ہے۔ ملزم کو اس پانی کے تین گھونٹ پینے کے لئے کہا جاتا ہے جس میں دیوی دیوتاؤں کے بت دھوئے گئے ہوں۔ اور اگر پندرہ دنوں کے اندر وہ بیمار پڑ جائے

یا بیماری کی علامتیں ظاہر ہوں تو جرم ثابت سمجھا جائے گا۔

۶۔ جب متعدد افراد پر چوری کا شبہ ہو تو کچھ خشک چاول' ایک مقدس پتھر سالگرام کے ہموزن لے کر اور مخصوص اشلوک پڑھ کر ان پر پھونکا جاتا ہے۔ پھر مشکوک افراد کو ان کی کچھ مقدار چبانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اسے چباتے ہیں' ان سے انہیں بھوج پتر' نیپال یا کشمیر کے ایک درخت کی چھال' یا اگر یہ نہ ملے تو پیپل کے پتوں پر تھوکنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ جس شخص کے منہ سے چاول خشک یا خون آلود نکلیں اسے مجرم اور باقی کو بے قصور قرار دیا جاتا ہے۔

۷۔ گرم تیل کے ذریعے آزمائش بہت سادہ ہے۔ جب یہ کافی گرم ہو جاتا ہے تو ملزم اس میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور اگر وہ نہیں جلتا تو وہ معصوم ہوتا ہے۔

۸۔ اسی طرح سے وہ ایک سلاخ یا نیزے کی انی کو گرم سرخ کر لیتے ہیں اور اسے ملزم کے ہاتھ پر رکھتے ہیں' جس کو اگر یہ نہیں جلا پاتی تو بے گناہ سمجھا جاتا ہے۔

۹۔ دھرمارچ[۴۳] جو اس طرح کی آزمائش کی مناسبت رکھنے والے شلوک کا نام ہے' ایک تو دھرما' یا صاحب انصاف نامی بت' جو چاندی کا بنا ہوتا ہے' اور دوسرا مٹی یا لوہے کا' جسے ادھرما' کہتے ہیں' ان دونوں کو مٹی کے ایک بڑے مرتبان میں رکھتے ہیں۔ اور ملزم اپنا ہاتھ اس میں ڈال کر اگر چاندی کا بت نکالتا ہے تو وہ بے قصور سمجھا جاتا ہے اور اگر دوسرا نکالتا ہے تو مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ دوسرے' ایک دیوی کی تصویر ایک سفید کپڑے پر اور ایک سیاہ کپڑے پر بنائی جاتی ہے۔ پہلے کو وہ دھرما' اور دوسرے کو ادھرما' کا نام دیتے ہیں۔ ان کپڑوں کو وہ گائے کے سینگ پر مضبوطی سے لپیٹتے ہیں اور ملزم کو دکھائے بغیر ایک لمبے مرتبان میں ڈالتے

ہیں۔ ملزم اپنا ہاتھ مرتبان میں ڈال کر سفید یا سیاہ کپڑے کو نکالتا ہے تو
اسے اسی مناسبت سے چھوڑ دیا جاتا ہے یا مجرم قرار دیا جاتا ہے۔

دھرم شاستر' کی شرح میں یہ تحریر ہے"[۴۴] کہ چاروں بنیادی ذاتوں میں اس قسم کی آزمائشیں ہر ایک کی اپنی اپنی مناسبت سے موجود ہیں' کہ برہمن کو ترازو کے ذریعے' کشتری کو آگ کے ذریعے' ویش کو پانی کے ذریعے اور شودر کو زہر کے ذریعے جانچیں۔ لیکن کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک برہمن کو زہر کے سوا تمام طریقوں سے اور کسی بھی ذات کے شخص کو ترازو کے ذریعے آزمایا جا سکتا ہے۔ یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایک عورت کو پانی اور زہر کے علاوہ ہر طریقے سے آزمایا جائے۔

منکشیرا' میں آزمائشی امتحان کی مختلف اقسام کے لئے مہینے اور دن مخصوص ہیں۔ جیسے آگ سے آزمائش کے لئے۔ اگہن' پوس' ماگھ' پھاگن' ساون اور بھادوں' پانی سے آزمائش کے لئے۔ اسویں (چیت) کارتک' جیٹھ' اساڑھ' زہر کے لئے۔ پوس' ماگھ اور پھاگن عملاً" لوند کے مہینوں میں اشٹمی (آٹھویں) اور چتردشی (چودھویں) کے دن اور بھادوں کے مہینے میں سنیچر اور منگل کو پانی کے ذریعے آزمائش نہیں کی جاتی۔ لیکن اگر منصف چاہے کہ ان میں سے کسی بھی دن آزمائش کی جائے تو پھر دن اور مہینوں کی کوئی چھوٹ نہیں دی جاتی۔

منکشیرا' میں یہ امتیازات بھی موجود ہیں۔ ایک سو اشرفیوں تک کی چوری یا دھوکہ دہی کی صورت میں زہر کے ذریعے آزمائش مناسب ہوتی ہے۔ اگر اسی اشرفیوں کے برابر ہو تو مجرم آگ سے آزمایا جا سکتا ہے۔ اگر چالیس کے برابر ہو تو ترازو کے ذریعے اور اگر ۱۰ سے ۳۰ کے برابر ہو تو پینے کے پانی سے' اور اگر صرف دو کے برابر ہو تو چاول کے ذریعے۔

ایک فاضل قانون داں کتیاین[۴۵] کا یہ خیال تھا کہ اگر ایک چور یا دھوکے باز گواہی کی بنیاد پر بھی اگر ملزم ثابت ہو جائے تو بھی مذکورہ طریقوں سے آزمایا جا سکتا

ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایک ہزار پنا[۴۶] چوری ہو جائیں یا دھوکے یا فریب سے چھین لئے جائیں تو اس کے لئے آزمائش زہر سے ہونی چاہئے۔ اگر رقم سات سو پچاس ہو تو آگ سے اور اگر چھ سو چھیاسٹھ یا اس سے کچھ کم ہو تو پانی سے۔ پانچ سو ہو تو ترازو سے۔ چار سو ہو تو گرم تیل سے۔ تین سو ہو تو چاول سے۔ ڈیڑھ سو ہو تو پینے کے پانی سے۔ اور ایک سو ہو تو چاندی یا لوہے کی مورتیوں سے۔

گرم سرخ سلاخوں یا نیزے کی انی سے کی جانے والی آزمائشوں کا ذکر "گیا ویلکیا"[۴۷] کی شرح میں کیا گیا ہے۔

علی الصباح وہ جگہ، جہاں رسم کو ادا ہونا ہے، صاف کی جاتی ہے اور دھوئی جاتی ہے، اور طلوع آفتاب کے وقت، پنڈت گنیش کی پوجا کر کے زمین پر گائے کے سینگ سے نو دائرے، ۱۶ انگلیوں کے برابر فاصلوں سے، بناتے ہیں۔ ہر دائرہ ۱۶ انگلیوں کے برابر قطر کا بنایا جاتا ہے۔ لیکن نواں دائرہ دوسرے دائروں سے یا تو چھوٹا بنایا جاتا ہے یا بڑا۔ پھر وہ شاستر میں بتائے گئے طریقوں کے مطابق دیوتاؤں کی پوجا کرتے اور آگ میں نذرانہ ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور مخصوص منتر پڑھتے ہیں اور پھر جس شخص کا آزمائشی امتحان لینا ہوتا ہے اسے نہلایا جاتا ہے اور گیلے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور مشرق کے رخ پر اسے پہلے دائرے میں اس طرح کھڑا کیا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ اس کے کمر بند میں بندھے ہوں۔ اس کے بعد منصف اور پنڈت اسے کچھ چاول (بمعہ دھان) اپنے دونوں ہاتھوں سے ملنے کے لئے کہتے ہیں اور وہ بغور ان کا معائنہ کرتے ہیں اور اگر کسی ایک ہاتھ پر کسی پرانے زخم یا تیل کا نشان نمودار ہوتا ہے تو وہ کسی رنگ سے اس پر نشان لگاتے ہیں تاکہ آزمائش کے بعد وہ کسی نئے نشان سے ممیز ہو سکے۔ اس کے بعد وہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں کو قریب اور کھول کر رکھنے کے لئے کہتے ہیں اور ان میں پیپل، کیکر اور دربھا گھاس کے سات سات پتے، دہی میں ملی

ہوئی کچھ جو' کچھ پھول اس کے ہاتھ پر سات سوتی دھاگوں سے باندھتے ہیں۔ پھر پنڈت موقع کی مناسبت سے کچھ شلوک پڑھتے ہیں اور کھجور کے پتے پر جرم اور معاملے کی نوعیت اور ویدوں کے متعلقہ منتر تحریر کر کے اس پتے کو ملزم کے سر پر باندھ دیتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو وہ ڈھائی سیر وزن کی ایک سلاخ یا نیزے کی انی کو گرم کرتے ہیں اور اسے پانی میں پھینکتے ہیں۔ وہ اسے دوبارہ گرم کرتے ہیں اور اسی طرح اسے پھر ٹھنڈا کرتے ہیں' پھر اسے تیسری مرتبہ گرم ہونے کے لئے آگ میں اس وقت تک رکھتے ہیں' جب تک وہ سرخ نہ ہو جائے۔ پھر وہ ملزم کو پہلے دائرے میں کھڑا کرتے ہیں لور سلاخ کو آگ سے نکال کر اور معمول کے مطابق منتر پڑھ کر چمٹے کی مدد سے ملزم کے ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔ ملزم کو اسی حالت میں ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں اس طرح چلنا ہوتا ہے کہ اس کے قدم کسی ایک دائرے میں رہیں۔ جب وہ آٹھویں دائرے میں پہنچتا ہے تو اسے سلاخ کو نویں دائرے میں پھینکنا پڑتا ہے' جس سے کچھ گھاس جو اسی مقصد سے اس میں رکھی جاتی ہے' جل جاتی ہے۔ اس عمل کے بعد' مصنف اور پنڈت اسے کچھ کچھ چاول دونوں ہاتھوں سے رگڑنے کی ہدایت کرتے ہیں' جن کا وہ بعد میں معائنہ کرتے ہیں اور اگر کسی ایک ہاتھ پر بھی جلنے کا نشان پڑ جاتا ہے تو وہ مجرم ثابت ہو جاتا ہے۔ ورنہ اس کی بے گناہی واضح ہو جاتی ہے۔ اگر اس کا ہاتھ خوف سے تھرتھراتا ہے اور اس کی تھرتھراہٹ سے اگر اس کے جسم کا کوئی اور حصہ جل جاتا ہے تو اس کی سچائی الزام سے بری ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آٹھویں دائرے تک پہنچنے سے قبل ہی وہ سلاخ گرا دے اور تماشائیوں کے ذہن میں شبہ پیدا ہو' چاہے سلاخ اسے جلا بھی دے' اسے سارا عمل شروع سے دہرانا پڑتا ہے۔

۱۷۸۳ء میں بنارس میں میری' یعنی علی ابراہیم خاں کی' موجودگی میں ایک شخص' پر مذکورہ ذیل موقع پر گرم سلاخ کے ذریعے آزمائش کی گئی۔ اس شخص نے یہ درخواست دی تھی کہ اس نے چوری نہیں کی اور مجرم نہیں ہے۔ اور چونکہ

چوری قانونی شواہد سے ثابت نہیں ہو سکتی تھی' اس لئے درخواست گزار پر آگ سے آزمائش کا عمل تجویز کیا گیا' جسے اس نے قبول کر لیا۔ اس بہی خواہ بنی نوع انسان نے منصفوں اور پنڈتوں سے اس تجویز کو سرکار کمپنی کے لئے ایک ناموافق روایت کا مسئلہ سمجھتے ہوئے روکنے کے لئے کہا اور گنگا کے پانی اور پیتل کے ایک چھوٹے برتن میں تلسی کی پتیوں کے ذریعے یا کتاب ہری وانسا[۴۸] کے ذریعے' یا سالگرام پتھر یا مقدس حوضوں یا تسلوں' غرض قسموں کی ان تمام اقسام میں سے' جو بنارس میں مروج ہیں' کسی ایک پر عمل کرنے کی سفارش کی۔ لیکن جب ان سفارش کردہ قسموں میں سے کسی ایک پر بھی فریق اپنی ضد کے باعث آمادہ نہ ہوئے اور گرم سلاخ کے ذریعے آزمائش پر اصرار کیا تو منصفوں اور پنڈتوں نے انہیں اپنی مرضی پر بخوشی عمل کرنے کے لئے کہہ دیا اور آزمائش کی ان اقسام کا خیال ترک کر دیا جن سے زندگی اور جائیداد کے زیاں کا خدشہ بہت کم ہوتا ہے۔ جیسا کہ جھوٹے اقرار کی سزا یقینی اور فوری آسمانی فیصلہ ہے' دھرم شاستر سے مناسبت رکھنے والی آزمائش کے طریقے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن گرم لوہے کے ذریعے یہ آزمائش ایک باقاعدہ فرمان کے جاری ہونے تک پورے چار ماہ تک نہ ہو سکی اور بالآخر یہ چار وجوہات کے سبب منظور کی گئی۔ پہلی یہ کہ چونکہ ملزم کو بے قصور ٹھہرانے یا چھوڑنے کا کوئی اور طریقہ نہیں رہ گیا تھا' دوسری یہ کہ چونکہ دونوں فریق ہندو تھے اور آزمائش کا یہ طریقہ قدیم قانون دانوں نے دھرم شاستر میں خاص طور شامل کیا ہے' تیسری یہ کہ یہ طریقہ آزمائش ہندو راجاؤں کے زیر اقتدار علاقوں میں روبہ عمل ہے اور چوتھی یہ کہ یہ اس بات کو جاننے کے لئے مفید ہو سکتا ہے کہ آگ کی گرمی سے بچنا اور اس ہاتھ کو جس میں یہ رکھی ہوتی ہے' جلنے سے بچانا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ اس وقت عدالت اور بنارس کے پنڈتوں کو یہ حکم نامہ ارسال کیا گیا۔ "چونکہ دونوں فریق' ملزم اور مدعی' دونوں ہندو ہیں اور گرم سلاخ کے علاوہ کسی اور طریقہ آزمائش کے لئے رضامند نہیں ہیں'

اس لئے طریقہ آزمائش کو ان کی مرضی اور "متکیشرا" یا یگیلوالکیا' کی شرح میں بیان کردہ طریقوں کے مطابق انجام دیا جائے۔"

جب آزمائش کے لئے تیاریاں مکمل ہو گئیں تو یہ بھی خواہ بنی نوع انسان' تمام لائق علماء' افسران عدالت' کیپٹن ہوگن (Hogan) کی بٹالین کے سپاہیوں اور بنارس کے متعدد باشندوں کے ساتھ اس جگہ گیا' جو اس مقصد کے لئے تیار کی گئی تھی' اور مدعی سے ملزم کو آگ کی آزمائش سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ " اگر اس کا ہاتھ نہ جلے تو بھی تم قید ہو جاؤ گے۔" مدعی نے اس دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آزمائش پر اصرار کیا۔ چنانچہ میری' یعنی علی ابراہیم خاں کی موجودگی میں یہ تقریب انجام دی گئی۔

عدالت اور شہر کے پنڈتوں نے خدائے دانش کی پوجا اور آگ میں مکھن کی نذر ڈالنے کے بعد' زمین پر گائے کے سینگ سے' دائرے بنائے۔ اور ملزم کو گنگا جل سے نہلا کر گیلے کپڑوں سمیت لایا گیا۔ تمام شبہات دور کرنے کے لئے اس کے ہاتھ شفاف پانی سے دھوئے گئے اور پھر کھجور کے چوڑے پتے پر معاملے کی نوعیت اور منتر لکھ کر اسے اس کے سر پر باندھ دیا گیا اور اس کے ہاتھوں میں' جنہیں قریب قریب کر کے کھلا رکھا گیا تھا' پیپل' کیکر' دربھا گھاس کے سات سات پتے' چند پھول اور کچھ جو دہی میں ملا کر' روئی کے سات دھاگوں سے باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک سلاخ کو گرم سرخ کیا اور ایک چمٹے کی مدد سے پکڑ کر اس کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔ وہ اسے لے کر قدم بہ قدم ساڑھے تین گز کے فاصلے تک درمیانی سات دائروں سے ہوتا ہوا چلا اور نویں دائرے میں سلاخ پھینک دی' جس سے وہ گھاس جل گئی' جو وہاں رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں میں کچھ دھان لے کر رگڑی۔ جنہیں بعد میں بغور دیکھا گیا' ان پر جلنے کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کسی ایک پر بھی کوئی آبلہ پیدا نہیں ہوا۔ چونکہ آگ کی صفت ہی جلانا ہے' عدالت کے

افسران اور بنارس کے لوگوں نے' جن کی تعداد اس تقریب میں پانچ سو کے قریب تھی' اس واقعہ پر شدید حیران ہوئے اور یہ بھی خواہ بنی نوع انسان بھی دنگ رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہلکی گرفت اور شاید تازہ پتوں اور دوسری مذکورہ اشیاء کے باعث' جو ہاتھوں پر رکھی گئی تھیں' ہاتھ نہ جل سکے اور ساتھ ہی اس کا سلاخ کو ہاتھ میں لے کر پھینکنے کا وقت بھی بہت مختصر تھا۔ واضح طور پر 'دھرم شاستر' میں بیان کیا گیا ہے اور اکابر پنڈتوں کی تحریروں میں موجود ہے کہ وہ شخص جو سچا ہوتا ہے اس کے ہاتھ جل نہیں سکتے اور اس علی ابراہیم خان نے بھی واقعتاً اپنی آنکھوں سے اسی طرح' جس طرح بہت سے دوسروں نے دیکھا کہ اس واقعے میں ملزم کے ہاتھ آگ سے محفوظ رہے۔ نتیجتاً اسے بے قصور قرار دیا گیا لیکن ایک ہفتے کے لئے قید رکھا گیا تاکہ لوگ شاید آئندہ سچائی کی آزمائش کے ان طریقوں سے گریز کریں۔ بہرحال اگر اس طرح کی آزمائش کو ایک یا دو مرتبہ قوانین فطرت سے آگاہ چند ذہین افراد دیکھیں تو شاید وہ اس اصل سبب کو جان سکیں کہ کیوں ایک شخص کا ہاتھ کسی ایک موقع پر جل جاتا ہے اور دوسرے موقع پر نہیں جلتا؟

گرم تیل کے ذریعے آزمائش 'دھرم شاستر' کے مطابق' اس طرح انجام دی جاتی ہے۔ آزمائش کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے' اسے صاف کیا جاتا ہے اور اس جگہ گائے کا سینگ رگڑا جاتا ہے اور دوسرے دن' طلوع آفتاب کے

وقت' پنڈت گنیش کی پوجا کرتا ہے اور نذر چڑھاتا ہے اور شاستر کے مطابق دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کرتا ہے۔ پھر متعلقہ اشلوک پڑھتا ہے اور سونے' چاندی' تانبے' لوہے یا مٹی کا ایک گول برتن' جو ۱۶ انگل قطر اور چار انگل گہرا ہوتا ہے' لے کر اس میں ایک سیر یا اسی سکوں کے برابر وزن کا صاف مکھن یا تل کا تیل ڈالا جاتا ہے۔ اس کے بعد سونے' چاندی یا لوہے کا ایک چھلا' صاف کر کے اور پانی میں دھو کر تیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور اسے گرم کیا جاتا ہے۔ جب وہ کافی گرم ہو جاتا ہے تو اس میں پیپل یا بلوا کا ایک تازہ پتا ڈالا جاتا ہے جب پتا جلنے لگتا ہے تو تیل کے گرم ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ تب تیل پر ایک منتر پڑھ کر ملزم سے کہا جاتا ہے کہ وہ برتن کے اندر سے چھلے کو باہر نکالے اور اگر وہ جلے بغیر یا ہاتھ پر چھالے کے بغیر اسے باہر نکال لیتا ہے تو اس کی بے گناہی' ورنہ جرم ثابت ہو جاتا ہے۔

ایک برہمن رشی ایشور بھٹ نے ان کتان (کپڑے) کے ایک رنگ ساز رام دیال پر یہ الزام لگایا کہ اس نے اس کی کچھ چیزیں چوری کر لی ہیں۔ رام دیال نے اس الزام کی تردید کی۔ کافی بحث و تکرار کے بعد بالاخر وہ گرم تیل کے ذریعے سچائی کی آزمائش پر راضی ہوئے۔ اس بہی خواہ بنی نوع انسان نے عدالت کے پنڈتوں سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو انہیں اس قسم کی آزمائش سے باز رکھیں۔ لیکن چونکہ فریقین شاستر کے مطابق گرم تیل کی آزمائش پر مصر تھے' جب کہ اسی ضمن میں گرم لوہے کی آزمائش بھی مروج تھی۔ رسم کی ادائیگی کے وقت یہ پنڈت معاونت کے لئے موجود تھے۔ ثم بھٹ' ناتا پاٹھک' منی رام پاٹھک' منی رام بھٹ' شیوا' اننت رام بھٹ' کرپا رام' وشنو ہری' کرشن چندر' رامندر' گووند رام'

ہری کرسن بھٹ' کلی داس' آخری تین پنڈتوں کا تعلق عدالت سے تھا۔ جب شاستر کے مطابق گنیش کی پوجا ہو گئی اور نذر چڑھائی جا چکی تو اس بہی خواہ بنی نوع انسان کو بلوایا گیا' جو دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے دو دارغاؤں' کوتوال شہر' عدالت کے دیگر افسروں اور بنارس کے میت سے باشندوں کے ساتھ آزمائشی امتحان کے لئے مخصوص مقام پر گیا اور رام دیال اور اس کے باپ کو اس آزمائش سے باز رکھنے کی کوشش کی اور انہیں متنبہ کیا کہ اگر ملزم کا ہاتھ جل گیا تو اسے چوری کے سامان کی مالیت ادا کرنا لازم ہو جائے گا۔ اور ہر جگہ اسے بدکردار کہا جائے گا۔ رام دیال باز نہ آیا۔ اس نے برتن میں ہاتھ ڈال دیا' جو جل گیا۔ چنانچہ پنڈتوں کی رائے لی گئی تو' ہاتھ کے جل جانے کی وجہ سے وہ جرم کی تصدیق پر متفق تھے اور اسے رشی ایشور بھٹ کو چوری کے سامان کی مالیت ادا کرنے کا پابند کر دیا گیا۔ لیکن اگر رقم پانچ سو اشرفیوں سے زیادہ ہو جائے تو شاستر کے ایک واضح قانون کی رو سے اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا اور ایک جرمانہ بھی اس کے ان حالات کے مطابق اس پر عائد ہو جاتا۔

چنانچہ چیف مجسٹریٹ نے رام دیال سے رشی ایشور بھٹ کو سامان کی چوری کے عوض سات سو روپے دلائے' لیکن ان معاملات میں چونکہ بنارس کے نظام قانون میں ایسے جرمانے رائج نہیں' اس لئے جرمانہ معاف کر دیا گیا اور ملزم کو چھوڑ دیا گیا۔

اس مقدمے کا ریکارڈ ۱۷۸۳ء میں اور اپریل ۱۷۸۴ء میں کلکتہ گورنر جنرل عماد الدولہ جلادت جنگ بہادر[۵۰] کی خدمت میں بھیجا گیا' جنہوں نے سچائی کی آزمائش کے امور کو دیکھ کر کئی سوالات یہاں کے مقدمات اور سنسکرت الفاظ کے بارے میں کئے' جن کے جوابات بصد احترام دیئے گئے۔ انہوں نے پہلے جاننا چاہا تھا کہ ہوما' کے اصل معنی کیا ہیں' انہیں بتایا گیا کہ اس کے معنی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے دی جانے والی نذر یا اسی طرح کی چیزوں کے ہیں۔ اسی طرح اگنی

ہوما' میں وہ آگ میں مختلف اقسام کی لکڑیاں اور گھاس جیسے پلاس' کھدر' رکتا چندن' یا سرخ صندل' پیپل' سمی کی لکڑیاں اور کوش گھاس' چند اقسام کے اناج' پھل اور کچھ مصالحے' جیسے سیاہ تیل' جو' چاول' گنا' مکھن' بادام' کھجور' گوگل یا بیلیوم ڈالتے ہیں۔ ان کے دوسرے سوال کا کہ ہوما' کی کتنی اقسام ہیں۔ یہ جواب دیا گیا کہ مختلف مواقع پر مختلف اقسام اختیار کی جاتی ہیں۔ لیکن گرم لوہے اور گرم تیل کے ذریعے آزمائش میں اسی قسم کی پوجا کی جاتی ہے جب انہوں نے لفظ منتر کے معنی جاننے چاہے تو انہیں بصد احترام بتایا گیا کہ پنڈتوں کی زبان پر اس طرح کے تین الفاظ منتر' ینتر اور تنتر ہوتے ہیں۔ پہلے لفظ کا مطلب کسی ایک وید کی ایک عبارت ہے' جس میں مخصوص دیوتاؤں کے نام شامل ہوتے ہیں۔ دوسرے کا مطلب اعداد کی ایک ترتیب ہے' جسے وہ اس عقیدے کے تحت لکھتے ہیں کہ ان سے ان کی خواہشات پوری ہوں گی۔ اور تیسرے کا مطلب ایک طبی احتیاطی اقدام ہے' جس کے استعمال سے تمام امراض دور ہو سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ انہیں ہاتھوں پر ملنے کے بعد گرم سرخ لوہے کے جلے بغیر چھوا جا سکتا ہے۔ پھر انہوں نے دریافت کیا کہ کتنی جو دہی میں ملا کر ملزم کے ہاتھوں پر رکھی جاتی ہے؟ اس کا جواب نو دانے' دیا گیا۔

ان کے دیگر سوالوں کے یہ جواب دیئے گئے کہ "پیپل کے پتے ملزم کے ہاتھوں میں پھیلا کر رکھے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر نہیں۔ وہ شخص کہ جو آگ کی آزمائش کا ذریعہ اختیار کرتا ہے' زیادہ احتجاج نہیں کرتا بلکہ اپنی تمام تر سمجھ بوجھ میں رہتا ہے' وہ شخص کہ جو گرم تیل سے آزمایا جاتا ہے' اولاً" خائف رہتا ہے' لیکن جلنے کے بعد بھی چوری سے انکار پر قائم رہتا ہے۔ چاہے وہ پہلے تحریری معاہدہ ہی کیوں نہ کر چکا ہو کہ اگر اس کا ہاتھ جل جائے تو وہ سامان کی مالیت ادا کرے گا' اس بنیاد پر مجسٹریٹ اسے رقم ادا کرنے پر مجبور کرنے میں حق بجانب ہوتا ہے۔ جب مذکورہ بالا اشیاء ہوما' کے لئے آگ میں ڈالی جاتی ہیں تو پنڈت آگ

کے الاؤ کے اطراف بیٹھ کر شاستر میں بیان کیے گئے اشلوک پڑھتے ہیں۔ الاؤ کی شکل وید' اور دھرم شاستر' میں بیان کی گئی ہے اور یہ کہ اس الاؤ کو ویدی' بھی کہتے ہیں۔ معمولی پرستش کے لئے وہ الاؤ کو زمین سے قدرے اونچا بناتے ہیں اور اس میں آگ جلاتے ہیں۔ غیر معمولی پرستش کے لئے وہ ایک گڑھا تیار کرتے ہیں جس میں وہ ہوما' کا اہتمام کرتے ہیں اور اس مقدس الاؤ کو وہ کندا' کہتے ہیں۔ پھر گورنر نے پوچھا کہ آگ' گرم سلاخ اور گرم تیل کی آزمائشوں میں جب کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا تو انہیں آگ کی آزمائش کیوں نہیں کہا جاتا؟ یہ عاجزانہ جواب دیا گیا کہ چند پنڈتوں کے کہنے کے مطابق کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ جب کہ دوسرے کہتے ہیں کہ آگ کے ذریعے آزمائش گرم تیل کے برتن کی آزمائش سے مختلف ہوتی ہے۔ جب کہ گرم سلاخ اور نیزے کی گرم انی مساوی ہوتی ہیں۔ لیکن اس خاکسار خادم کے خیال میں یہ سب آگ کی آزمائشیں' ہیں۔

مطبوعہ۔ "غالب نامہ"

(دہلی' جولائی' ۱۹۹۶ء)

حواشی

۱۔ تخلص فارسی میں حال اور اردو میں خلیل تھا۔ غلام حسین شورش "تذکرۂ شورش" (لکھنؤ' ۱۹۸۴ء' ص ۲۲۱)

۲۔ ابوالحسن امیرالدین احمد "تذکرہ مسرت افزا" مرتبہ قاضی عبدالودود (پٹنہ' سن ندارد) ص ۴۷

۳۔ سید غلام حسین خان طباطبائی "سیرالمتاخرین" انگریزی ترجمہ' عکسی اشاعت (لاہور ۱۹۷۵ء) جلد ۲' ص ۳۸۸ و جابجا۔

۴۔ ایضاً" وغیرہ ص ۴۴۸۔۴۴۹' ۴۶۴۔۴۶۵' ۴۹۹'۵۳۸۔۵۳۹' ۵۴۱

۵۔ ایضاً" جلد ا' ص ۳۵۷

۶۔ ایضاً" جلد ۳' ص ۱۱

۷۔ ایضاً" ص ۲۶

۸۔ ایک موقع پر محمد رضا خاں نے انہیں اس مقصد کے لئے کلکتہ بھیجا' کہ وہ وارن ہیٹنگز کو اس سے ملاقات کے لئے آمادہ کریں' لیکن ہیٹنگز نے شائستگی سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ نواب کے نمائندے علی ابراہیم جیسے لائق فرد سے ملنا ۔ ۔ ۔ ۔ نواب سے ملنے کے مساوی ہے۔ وارن ہیٹنگز بنام محمد رضا خان' ۱۷اپریل ۱۷۷۲ء "CALENDER OF PERSIAN CORRESPONDANCE" مرتبہ کے بی بھارگو' نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (دہلی) جلد چہارم' ص ۲

۹۔ طباطبائی' جلد ۳' ص ۱۰۳

۱۰۔ علی رضا نقوی "تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان" (تہران ۱۹۶۴ء) ص ۴۵۸' خطابات کے لئے "WARREN HASTINGS PAPERS" مخزونہ - برٹش میوزم لندن' Add. Mss. 29096 اوراق ۲۱۵۔۲۱۹ و ۔نیز "القاب نامہ" ص ۱۷' ۶۹' ۷۱' ۱۰۸' ۱۰۹' ۲۳۸' ۳۳۳' بحوالہ (۱۷۹۸۔۱۸۸۵) "INDEX TO TITLES" مرتبہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا' (دہلی' ۱۹۷۹ء) ص ۳۰۔

۱۱۔ طباطبائی' جلد ۳' ص ۱۰۳' ۱۰۴

۱۲۔ "BENARAS GAZETTEER" (کلکتہ' ۱۹۰۹ء) صد ۲۰۴

۱۳۔ "CALENDER OF PERSIAN CORRESPONDANCE" مرتبہ کے بی بھارگو' جلد ۱۱' نیشنل آرکائیوز آف انڈیا' (دہلی) ص ۵' ۷

۱۴۔ ایضاً" ص ۲' ۸

۱۵۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے بنارس کا گورنر نامزد ہونے کے حق میں آراء متفق نہیں' مثلاً" قاضی عبدالودود "مقالات قاضی عبدالودود" جلد اول (پٹنہ' ۱۹۷۷ء) ص ۵۸' لیکن ان کے گورنر بنائے جانے کا ذکر نہ صرف عام ہے بلکہ اس کی شہادت بھی موجود ہے۔ برٹش میوزم لندن میں علی ابراہیم خاں کا ایک تحریری بیان محفوظ ہے۔ جس میں انہوں نے خود کو گورنر بننے اور نظم و نسق کے قیام' بدعنوانیوں کے خاتمے اور غیر جانبدارانہ و منصفانہ انتظام کا ذکر کیا ہے۔ یہ تحریر دیگر اسناد و دستاویزات کے ساتھ منسلک ہے اور ان پر ثبت مہروں میں سے ایک مہر پر آخری سنہ ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء درج ہے۔ چارلس ریو "Supplement to the Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum" (لندن' ۱۸۹۵ء) ص ۴۰۵' ایک حالیہ تجزیہ کے مطابق علی ابراہیم خاں ان ہندوستانیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے انگریزوں اور ہندوستانی حکمرانوں کے درمیان' انگریزوں کے گماشتوں کا کردار ادا کیا۔ خود علی ابراہیم خاں انگریزوں اور محمد رضا خان کے درمیان رابطہ کا کام کرتے رہے' جب کہ ان کے ایک شاگرد عبدالقادر خاں' جو ریذیڈنٹ دہلی کے منشی تھے' سفارت پر متعدد بار نیپال بھیجے گئے اور پھر پیشوا کے بھائی امرت راؤ کے دربار میں انگریزوں کے گماشتہ کا کردار ادا کرتے رہے۔ ان ہندوستانیوں پر ایرانی شیعیت کے واضح اثرات تھے اور یہ شیعہ اصولی روایات سے ہمیشہ مغلوب رہے۔ انہی علم ابراہیم خاں کا وسیلہ اختیار کر کے' فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل' انگریز اپنے روابط اردو بولنے والے طبقات میں سرایت کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ سی اے بیلی

"Colonial rule and the Informational order in South Asia"

مشمولہ "The Transmission of knowledge in South Asia" مرتبہ نیگل کروک (دہلی' ۱۹۹۶ء) ص ۳۰۰۔۳۰۱ و ۔لنز ص ۳۰۷۔

۱۶۔ سعادت علی خاں "وقائع انتقال نواب علی ابراہیم خاں" نسخہ خطی' مخزونہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) بحوالہ' عابد رضا بیدار "صحف ابراہیم" تلخیص و ترتیب' مشمولہ "خدا

بخش لائبریری جرنل" شمارہ ۶، ص ۴، ۸؛ خلیل ۳۶/جمادی الاول ۱۲۰۸ھ/ یکم دسمبر ۱۷۹۳ء کو بنارس میں فوت ہوئے اور شیخ علی حزیں کے مرقد کے پہلو میں، جسے خود منتخب کیا تھا، دفن ہوئے۔ علی رضا نقوی، ص ۵۹۔

۱۷۔ ان کے انتقال کے بعد، ان کی کل موروثی جائیداد پر تنہا ان کے بھائی علی قاسم خاں قابض ہو گئے تھے۔ اور اصل ورثا کو اس سے محروم کر دیا، نواب زادہ وارث اسماعیل علی ابراہیم خاں کے سلسلہ میں استدراک "مشمولہ" خدا بخش لائبریری جرنل "شمارہ ۲۵، ص ۱۱۳۔

۱۸۔ "Discriptive list of Persian Correspondance, 1801" مرتبہ۔ ایس این پرشاد، جلد ۱، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (دہلی، ۱۹۷۴ء)، محمد علی خاں کے علاوہ دیگر فرزندوں میں نصیر الدین علی خاں، عسکری علی خاں، ہادی علی خاں، ہاشم علی خاں، مہدی علی خاں، مبارک علی خاں کے نام بھی ملتے ہیں۔

"Calender of Persian Correspondance, 1794-5" جلد ۱۱، ص ۲، ح ۵، ۲۔

۱۹۔ امتیاز علی خاں عرشی، دیباچہ "دستور الفصاحت" مصنفہ۔ سید احمد علی خاں یکتا (رامپور، ۱۹۴۳ء) ص ۷۴۔

۲۰۔ کہیں اس کا نام "احوال جنگ مرہٹہ" بھی ملتا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ لند۔سیانا میں محفوظ ہے۔ بحوالہ "Handlist of Oriental Manuscripts Arabic, Persian, Turkish." (ابردین، ۱۸۹۸ء)، ص ۱۳۱، بنمبر ۴۵۳، لارڈ کارنوالس کی فرمائش پر اس کا ایک خلاصہ .

"وقائع جنگ احمد شاہ ابدالی بلوسواس راؤ پسر بالاجی راؤ باجی راؤ وسوشیو راؤ عرف بھاؤ کہ در سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و چہار ہجری در ہندوستان شدہ در ہفت جزو تمام است، منشی محمد محسن الدین نے تحریر کیا تھا۔ قدرے تخفیف کے ساتھ یہ

"The History of India as Told by its own Historians." جلد ۸ (عکسی اشاعت، لاہور، ۱۹۷۶ء) ص ۲۵۷-۲۹۷ میں شامل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ "تاریخ مرہٹہ و شاہ ابدالی" مہدی طباطبائی نے ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۴ء میں کیا تھا اور یہ مطبع احمدی گاؤ گھاٹ (لکھنؤ) سے اسی سال شائع ہوا تھا۔ اردو ترجمے کے بارے میں مزید تفصیلات راقم نے ایک علیحدہ مقالے بعنوان "تواریخ مرہٹہ و شاہ ابدالی۔ اٹھارویں صدی میں

اردو نثر اور تاریخ ہند کا ایک نایاب ماخذ"

۲۱۔ عابد رضا بیدار، ص ۵

۲۲۔ قاضی عبدالودود کے مطابق اس کی دو جلدیں "خدا بخش لائبریری" پٹنہ میں موجود ہیں، ص ۵۸۔

۲۳۔ مخزونہ ۔ برٹش میوزیم، لندن، بحوالہ ۔ ریو، ص ۴۰۵، و۔لز سرجان مرے (Sir John Murray) (کلکتہ) کے نام خطوط کے ایک مجموعے میں، جو ۱۷۸۸ء اور ۱۷۹۶ء کے درمیان لکھے گئے، علی ابراہیم خاں کے خطوط بھی شامل ہیں۔ چارلس ریو "Catalogue of Persian Manuscripts in the British Museum" جلد ۱ (لندن، ۱۸۷۹ء) ص ۴۱۰

۲۴۔ مشمولہ ۔ "Persian Documents" حصہ اول، مرتبہ پی سرن (بمبئی، ۱۹۲۶ء) ص ۳۱۲۔۳۲۴۔

۲۵۔ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد، قیام، سرگرمیوں اور سر ولیم جونز کی علمی و تحقیقی مساعی کے لئے ۔ ایس این مکرجی "Sir William Jones Astudy in Eighteenth Century British Attitudes to India" (کیمبرج، ء) گارلینڈ کینن "Oriental Jones" (لندن، ۱۹۶۴ء) و۔لز معین الدین عقیل "ہندیات کا مطالعہ اور اس کا پس منظر، سرولیم جونز اور اس کا معاصرین کی کاوشوں کا ایک تنقیدی جائزہ" مشمولہ "Journal of the Research Society of Pakistan" (لاہور، جولائی ۱۹۷۹ء) ص ۵۱۔۸۶

۲۶۔ ولیم جونز بنام وارن ہیسٹنگز، ۷رجنوری ۱۷۸۵ء، مخزونہ، برٹش میوزیم، ۲۹، ۱۶۷۔ص ۳۳۰

۲۷۔ کینن، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۲۹۔ اس تصنیف پر مفصل مضمون منشی محمد ضیاء الدین نے تحریر کیا ہے۔ "ہندوستانی" (الہ آباد)، جنوری ۱۹۳۵ء ص ۱۔۴۲

۳۰۔ ریو، جلد اول، ص ۱۲، علی ابراہیم خاں نے کتاب پر یہ عبارت لکھ کر پیش کی تھی

"این کتاب مستطاب موسوم بہ "تحفتہ الہند" این عبد ذلیل اغنی علی ابراہیم خلیل بخدمت افضل الفضلاء و اشرف الاذکر کیا۔ سر ولیم یونس صاحب سلمہ اللہ واہب ہبہ غود نی سنہ ۱۱۹۹ھ ہزار و یک صد و نود و نو ہجری و سنہ ۱۷۸۴ء یک ہزار و ہفتصد و ہشاد و چہار عیسوی"

۳۱۔ مکرجی، ص ۹۰

۳۲۔ روداد مشمولہ "Proceedings of the Asiatic Society" جلد اول (کلکتہ، ۱۹۸۰ء) ص ۳۲

۳۳۔اس ضمن میں بنیادی تفصیلات کے لئے معین الدین عقیل، ص ۵۷۔۵۸

۳۴۔ On the Trial by Ordeal among the Hindus.

By Ali, Ibra'him Khan,

Chief Magistrate at Banares.

Communicated by Warren Hastings Esq.

یہاں علی ابراہیم خاں کے ساتھ چیف مجسٹریٹ' لکھا ہونا محل نظر ہے۔ ممکن ہے یہ مضمون ان کی ملازمت کے ابتدائی دور میں لکھا اور ترجمہ کیا گیا ہو۔

۳۵۔باب ۲۳، صفحات ۳۲۳۔۳۳۲

۳۶۔ 'MITACSHERA' اسے برہیم سترورتی' بھی کہتے ہیں۔ جسے انم بھاتا' نے تحریر کیا تھا۔ بحوالہ سریندرناتھ داس گپتا "A Historyof Indian Philosophy" جلد دوم (کیمبرج، ۱۹۵۲ء) ص ۸۲ ح، جدید بھارت کی قانون سازی میں اس کا اہم حصہ ہے۔ اے ایل باشم "The Wonder that was India" (لندن، ۱۹۵۴ء) ص ۱۱۳

۳۷۔ہندو مذہب کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل مجموعہ، جسے منو اور مختلف رشیوں نے تحریر کیا تھا۔ داس گپتا' جلد سوم، ص ۲۱

۳۸۔ 'DIVYA'

۳۹۔ 'PARICSHA'

۴۰۔ 'PARIKHYA'

۴۱۔ بمعنی پانی کا برتن

۴۲۔ 'VISHANAGA'

۴۳۔'DHARMARACH'

۴۴۔لیکن اومالے (L.S.S. OMALLEY) نے انہیں غیر تحریری اور محض زبانی بتایا ہے۔

"Indian Caste Customs" (لندن، ۱۹۷۴ء) ص ۴۷، اور اس قسم کی آزمائشیں اس کی تحقیقات کے مطابق، صرف پسماندہ علاقوں اور غیر مہذب آبادیوں میں مروج ہیں۔ سچائی کی آزمائش کے ایک مذہبی طریقے کی اس نے مثال دی ہے کہ ملزم کو ایک مندر میں کوئی اقرار کرنے کے لئے کہا جاتا ہے اور جسے کھجور کے پتے پر تحریر کر لیا جاتا ہے۔ جو بالعموم اس قسم کا ہوتا ہے کہ اگر وہ مجرم ہے تو یا تو وہ ایک مقررہ مدت میں اندھا ہو جائے یا اس کے بچے مر جائیں۔ اس کی بتائی ہوئی مدت تک وہ پتا مندر میں رکھا جاتا ہے۔ مدت گزرنے کے بعد اگر وہ اور اس کا خاندان مصائب سے محفوظ رہتا ہے تو اسے سابقہ عزت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایضاً" ص ۴۶، ان آزمائشوں کی مزید مختلف اقسام ابے جے اے دبوئی (ABBE I.A. DUBOIS) کی تصنیف "Hindu Manners Customs and Ceremonies" (دہلی، ء) صفحات - ، میں ملتی ہیں۔

'CATYAYANA' غالباً" یہ وہی شخص ہے جو معروف قواعد نویس پانینی کی تصنیف "اشٹ ادھیائے" کا شارح بھی تھا اور جس کا دور پانینی سے سو سال بعد، تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔

کرشن چیتنیا "A New Historyof Sankrij Literature"(لندن، ۱۹۶۲ء) ص ۲۷، ۱۳۴۔۱۳۵۔

۴۶۔ چاندی یا تانبے کا سکہ ۔ باشم ۔ ص ۱۰۲۰

۴۷۔'YAGYAWLECYA' غالباً" یہاں کوئی سہو ہوا ہے، یہ نام 'YAJNAWALKYA' ہو سکتا ہے۔ جو دھرم شاستر، کی سب سے اہم شرح سمجھی جاتی ہے، اور جو وکرمادت چہارم کے دور (۱۰۷۵-۱۱۲۷) میں لکھی گئی تھی۔ ایضاً" ص ۱۱۳

۴۸۔یہاں 'HERIVANSA' تحریر ہے، جو غالباً" 'ہری واسا' (HARIVAMSA) ہے، جو ہندوؤں کی مقدس کتاب 'مہا بھارت' کا ایک آخری حصہ ہے۔ البیرونی، "کتاب

السند' انگریزی ترجمہ "ALBERUNI'S INDIA" از ای۔ سی۔ سخاؤ (SACHAU E.C.) (لندن' ۱۹۱۰ء) جلد اول' ص ۳۳۴

۴۹۔ مصنف نے یہاں 'GOD OF KNOWLEDGE' لکھا ہے' اس سے ان کی مراد گینش' ہو گی۔

۵۰۔ وارن ہیٹنگز - یہ خطابات شاہ عالم نے اسے دیئے تھے۔ مائیکل ایڈوارڈز (MICHAEL EDWARDES)

"King of the world the life of last great Mughal Emperor"

(لندن' ۱۹۷۰ء) ص ۱۴۳' کنور پریم کشور فراقی نے ان میں "وزیر الممالک" اور "امیر الممالک" کا اضافہ کیا ہے۔ "وقائع عالم شاہی "مرتبہ' امتیاز علی خاں عرشی (رامپور' ۱۹۴۹ء) ص ۲۱

"تواریخ مرہٹہ و شاہ ابدالی"

اٹھارویں صدی میں اردو نثر اور تاریخ ہند

کا ایک نایاب ماخذ

اردو طباعت کا آغاز ۱۷۴۳ء میں ہوا، جب بنجمن شلز
(Benjamin Schultze) نے مسیحی عقائد کے خلاصے پر مشتمل اپنی تصنیف
"Summula Doctrinae" اپریل ۱۷۴۳ء میں جرمنی کے شہر ہالے سے شائع کی[۱]
۔ اگرچہ اردو الفاظ اور حروف پر مشتمل جزوی طباعت اس سے مزید چند ہفتے قبل
جون جوشوا کیٹلر (Joan Josua Ketelar) کی کتاب
"Instructie off ondeŗwitsinge der Hindoustanse" جنوری میں طبع ہو
چکی تھی[۲]۔ اردو طباعت کے یہ اولین نمونے یورپ میں سامنے آئے تھے۔ برعظیم
میں اردو طباعت کا باقاعدہ سلسلہ انیسویں صدی کی بالکل ابتداء میں فورٹ ولیم کالج
(کلکتہ) کے قیام اور اس کے تحت شروع ہوا، جب کہ اس سے قبل اٹھارویں
صدی کے اختتام تک جو کتابیں اردو میں شائع ہوئیں، وہ اس کی جزوی طباعت کے
ذیل میں آتی ہیں۔ مثلاً جان گلکرسٹ (John Gilchrist) کی تصانیف
"A Dictionary English and Hindoostanee' (۱۷۸۷ء)[۳]

"A Grammar of the Hindoostanee Language" (۱۷۹۶ء)[۴]
"The Oriental Linguist" (۱۷۹۸)[۵] جو انگریزی اردو مخلوط زبانوں میں ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت ۱۸۰۲ء سے مکمل اردو طباعت کا آغاز ہوا[۶] اور اولاً "باغ اردو" از شیر علی افسوس اور "باغ و بہار" از میر امن وغیرہ شائع ہوئیں۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام جہاں ہندوستانی زبانوں کی ترقی، بالخصوص ہندی کے ادبی آغاز اور اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے بے حد معاون ثابت ہوا۔ وہیں اردو طباعت کے فروغ کا محرک بھی بنا۔ شعبہ ہندوستانی کے لئے خود کتابیں چھاپنے کی اس شعبے کے پروفیسر گلکرسٹ کی تجویز پر فورٹ ولیم کالج کی انتظامیہ (کالج کونسل) نے چھاپے خانے کا سامان گلکرسٹ کی تحویل میں دے کر "ہندوستانی پریس" کے قیام میں معاونت کی[۷] یہ مطبع ۱۸۰۲ء میں قائم ہوا[۸]۔ اس سے قبل کالج کی کتابیں کلکتہ کے "ہرکارہ پریس" "کلکتہ گزٹ پریس، ٹیلی گراف پریس، مرر پریس، مارننگ پوسٹ پریس" میں چھپی تھیں[۹]۔ اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں انگریزی سے قطع نظر[۱۰] مقامی زبانوں میں طباعت اگرچہ عام ہونے لگی تھی، لیکن دراصل طباعت کو سیرام پور مشنریوں کی طباعتی کوششوں اور فورٹ ولیم کالج کے قیام ہی سے فروغ حاصل ہوا[۱۱]۔ ۱۷۷۸ء سے قبل کوئی شہادت موجود نہیں کہ دیسی زبانوں میں طباعت شروع ہوئی[۱۲]۔ ۱۷۸۴ء میں "کلکتہ گزٹ پریس" کے قیام کے بعد طباعت عام ہونے لگی، یہاں تک کہ نجی شعبے کے چند انگریز اور ہندوستانی افراد بھی اس میں دلچسپی لینے لگے[۱۳]۔

فورٹ ولیم کالج کے "ہندوستانی پریس" میں شائع ہونے والی اردو کتابوں سے قبل کسی اور مکمل مطبوعہ کتاب کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ یہی صورت فارسی کی بھی ہے[۱۴]۔ "کلکتہ گزٹ پریس" کے قیام کے بعد ہی

فارسی طباعت کا آغاز ہوا۔ اخبار "کلکتہ گزٹ" کے پہلے ہی شمارے میں، جو ۴مارچ ۱۷۸۴ء کو شائع ہوا، ایک فارسی کالم شائع ہوا تھا[۱۵] مگر حیران کن امر یہ ہے کہ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے "ہندوستانی پریس" کے قیام سے پہلے اردو مطبوعہ کتابوں کا ثبوت نہیں ملتا، لیکن لکھنؤ میں ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں چھپی ہوئی ایک کتاب "تواریخ مرہٹہ و شاہ ابدالی" موجود ہے، جس کا ذکر غالباً زبان و ادب کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا، جب کہ اس کی نشاندہی سی۔اے۔ اسٹوری (C.A. Story) نے اپنے معروف کتابیاتی جائزے
(Persian Literature, A Bio-Bibliographical Survey) میں کی تھی کہ یہ کتب خانہ انڈیا آفس میں محفوظ ہے[۱۶]۔ یہ کتاب دراصل معروف تذکرہ نویس، مورخ اور شاعر علی ابراہیم خاں (۱۱۵۴ھ/۴۱-۱۷۴۰ء-۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء) کی فارسی تصنیف "وقائع جنگ مرہٹہ" مرقومہ ۱۲۰۱ھ/۷-۱۷۸۶ء[۱۷] کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے شیخ محمد بخش کی فرمائش پر سید محمد مہدی طباطبائی نے اردو میں منتقل کیا تھا اور یہ "مطبع احمدی گاؤ گھاٹ سے ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ آخری صفحہ پر اختتامیہ کی عبارت یہ ہے۔

> "تاریخ مرہٹہ جو کہ زبان فارسی میں علی ابراہیم خان منشی گورنر جنرل چارلس اول کارن صاحب کے نے تصنیف کی تھی، موافق فرمائش شیخ محمد بخش صاحب مجمع اخلاق و کرم، منبع دانش و فیض اتم، ساکن گاؤ گھاٹ کارخانہ دار چھاپہ خانہ علوم دینی و دنیوی کے، واقف فنون شریف خرد اور آگہی کے سید محمد مہدی طباطبائی نے اس کو لباس اردو کا پہنا کر زبان ہندی میں مترجم کیا اور ساتویں تاریخ شہر صفر المظفر ۱۲۰۹ ہجری میں کی .... در مطبع احمدی متصل تکیہ شاہ نصراللہ بر گو گھاٹ طبع شد۔"

اسٹوری نے "مطبع احمدی" کے بنارس میں ہونے کا گمان کیا ہے اور بنارس پر سوالیہ نشان لگایا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کے اختتامیہ میں گاؤ/گو گھاٹ لکھا دیکھ کر اس نے گو/گاؤ گھاٹ کو بنارس میں قیاس کیا ہے۔ کیونکہ بنارس میں بہت سے گھاٹ موجود رہے ہیں۔ لیکن اختتامیہ کی عبارت میں "تکیہ شاہ نصراللہ" برگؤ گھاٹ" تحریر ہونے سے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ "مطبع احمدی" لکھنؤ میں تھا۔ تکیہ شاہ نصراللہ اور گاؤ گھاٹ لکھنؤ کے نواح میں واقع تھے[۱۸]۔

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں لکھنؤ میں قائم کسی "مطبع احمدی" کا حوالہ متعلقہ کتب و تواریخ میں نہیں ملتا۔ اسپرنگر کے مطابق لکھنؤ میں پہلے پہل غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء-۱۸۲۷ء) نے زرِ کثیر صرف کر کے ایک ٹائپ پریس قائم کیا تھا، جہاں سے ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں پہلی کتاب شائع ہوئی[۱۹]۔ ۱۸۳۰ء کے بعد لکھنؤ میں اولین لیتھو چھاپے خانے کے قیام کا پتہ چلتا ہے[۲۰]۔ جس سے ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں پہلی کتاب شائع ہوئی[۲۱]۔ اسپرنگر کے قیام لکھنؤ (۱۸۴۷ء-۱۸۵۰ء) کے وقت وہاں شاہی مطبع کے علاوہ ۱۲ نجی مطابع موجود تھے[۲۲] لیکن اس وقت تک اور اس کے بہت بعد تک وہاں کسی "مطبع احمدی" کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ زیرِ نظر کتاب کے اختتامیہ میں بہت واضح خط میں ۱۲۰۹ھ تحریر ہے۔ اس پر ۱۲۵۹ھ کا شبہ کیا جا سکتا تھا، لیکن کاتب نے جہاں کہیں صفر اور پانچ کے ہندسے لکھے ہیں۔ انہیں بالعموم واضح خفی اور جلی لکھا ہے۔ پھر ۱۲۵۹ھ میں یا اس کے آس پاس لکھنؤ میں کسی مطبع احمدی' کے وجود کی شہادت نہیں ملتی۔ طباعت کے انداز اور معیار سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء سے بہت پہلے کی مطبوعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت بغیر تحریک و سبب کسی قدیم اردو مخطوطے یا مسودے کے ترجمے اور اشاعت کی روایت موجود نہیں تھی اور نہ یہ بعد میں

ایک عرصے تک قائم ہوئی۔ ایک ایسی کتاب جو ۱۲۰۹ھ کے آس پاس کے عرصے میں بظاہر کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی ہو' نہ اس کا مصنف حیات ہو کہ جو اس کی اشاعت کا خواہاں ہو' گورنر جنرل لارڈ کارنوالس (۱۷۸۶ء۔۱۷۹۳ء) کو اس کی وفات (۱۸۰۵ء) کے بعد ممنون کرنا اس کتاب کے ناشر یا مترجم کا مقصد ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب مصنف نے اس کے نام معنون کی تھی۔ تمہید کی عبارت یہ ہے۔

"شکر ہے اللہ تعالٰی کا اوپر نعمتوں اس کی کے اور درود خدا کا بر محمد نبی اس کے کے اور دوستوں خدا اور رسول خدا کے یہ قصہ نادر بیان عبرت نامہ صاحبان عقل و بصارت کا ہے کہ بیچ زمانہ حکومت سردار بلند مرتبہ آسمان بارگاہ جائے قرار دارے اقبال کا نیکی' چاہنے والا دوستوں کا پرورش کرنے والا دوشمنوں کا ہلاک کنندہ آفتاب آسمان عقل کا بلند کرنے والا جھنڈوں بزرگی اور دبدبہ کا نواب پاک لقب بلند مرتبہ مشورہ دینے والا یکتا درگاہ بادشاہ انگلستان کا خلاصہ سرداران بہادر عظیم الشان کا کون کہ گورنر جنرل چارلس ارل کارن والس زیادہ کرے اللہ اقبال اس کا قلم شکستہ رقم سے ناچیز بے تمیز بندہ خدا کے علی ابراہیم خاں سے صورت لکھنے کی پاتا ہے یعنی بموجب فرمائش گورنر جنرل ممدوح کے علی ابراہیم خان نے اس کتاب کو تصنیف کیا[۲۳]۔"

کئی اور باتیں ایسی ہیں جن سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۰۹ھ ہی میں شائع ہوئی۔ مثلاً وہ اہتمام جو انیسویں صدی کے اوائل اور وسط میں طباعت کے ضمن میں کسی صورت کیا جانے لگا تھا' وہ اس میں نظر نہیں

آنا جیسے مخصوص سرورق کا نہ ہونا' طباعت کے لئے کسی مخصوص مسطر کے بجائے مخطوطے ہی کے بے ترتیب انداز کو اختیار کرنا' طباعت میں بھی روایتی اصول املا کا اطلاق' مثلاً" الفاظ کو مرکب اور مخلوط شکل میں بکثرت لکھنا' یائے مجہول کی جگہ یائے معروف اور یائے معروف کے بجائے یائے مجہول کا استعمال' گ کے لئے بالعموم ایک ہی مرکز سے کام لینا — ایسے پہلو ہیں جو املا کی مزید قدامت کو ظاہر کرتے ہیں۔ پھر الفاظ کی بندش اور جملوں کی ساخت بھی زبان کی مزید قدامت کے شاہد ہیں۔ ان چند عبارتوں سے' جو ذیل میں اصل املا میں نقل کی جا رہی ہیں' زبان کی قدامت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(جب امیر الامرا ذوالفقار خاں دکھن میں پہونچا) "اور متوجہ بندوبست اوس ملک کا ہوا فرمان بادشاہی اوپر نام سرداران قوم مرہٹہ کي خصوصا" بنام ساہو راجہ بیٹا سنبھا جی کا متواتر مشتمل مضمون مخالفت امیرالامرا کی آتی تھی ذکر ساہوجی راجہ کا قطب الملک بھائی بڑا امیرالامرا کا کہ پایہ تخت میں حاضر تھا بمجرد دریافت کرنی اس حال کی بھائی کی تیں مبالغہ تمام سی لکھا کہ ...."[۲۴]

- - - - -

"اوسی اثنا میں ملہا راؤ اور ہولکر دکھن سی ہندوستانکو اتی تھی گذر اونکا بھاؤ جعلی کی مکان پر ہوا وہیں خیمہ برپا کیا اور جاسوسوں نی اظہار حال اوسکا کیا ...."

[۲۵]

- - - - -

"القصہ جو بہاؤ بسبب موسم برسات کی کہ سوارونکو طاقت لڑنی کی اور کھوڑونکو مقدور دوڑنیکا نہ تھا چند روز قلعہ میں شاہجہاں آباد کی رہا ...." [۲۶]

- - - - -

"اور ہاتھہ آرزو کا واسطی حاصل کرنی مقصد بزرگی کی کہ حوصلی ان کی سی باہر ہی بہلاتی ہیں ہی بہرحال سچ کرنی والا اس کلام کا حال بسواس راؤ کا ہی کہ بیچ شروع اس نامہ کی اشارہ طرف او سکی کیا تھا اب خاتمہ کام اوسکی کا بتفصیل احاطہ تحریر میں آتا ہی ...." [۲۷]

اس کتاب کے تاحال محض ایک نسخے کا پتہ چلا ہے' جو کتب خانہ انڈیا آفس میں موجود ہے[۲۸]۔ حالانکہ اس کا ذکر اس کتب خانے میں محفوظ مطبوعات کی فہرست مرتبہ جے ایف بلوم ہارٹ (J.F. BLUMHARDT)[۲۹] یا اس کے بعد کی کسی دوسری فہرست میں نہیں ملتا۔ یہ نسخہ بھی نہایت بوسیدہ اور خستہ حالت میں ہے اور اس پر کوئی سرورق موجود نہیں۔ پہلے ورق کے طاق صفحہ پر صرف کتاب کا عنوان "تواریخ مرہٹہ و شاہ ابدالی" چھپا ہے اور باقی صفحہ سادہ ہے۔ اسی ورق کے جفت صفحے سے کتاب کا متن شروع ہو جاتا ہے۔ موجودہ حالت میں نسخہ مکمل بھی نہیں۔ کاتب نے صفحات کے نمبر شمار صفحے کی پیشانی پر درج کئے ہیں۔ لیکن کئی کئی صفحات نمبر شمار کے بغیر چھوڑ دیئے ہیں۔ صفحہ ۸۷ کے بعد کسی صفحے پر نمبر شمار درج نہیں۔ اسٹوری نے کل ضخامت ۸۹ صفحات بتائی ہے۔ لیکن آخری سے قبل کا کم از کم ایک ورق نسخے میں شامل نہیں۔ آخری سے پہلے صفحے کی عبارت اس سطر پر ختم ہوتی ہے۔

"ہو جاتی اور بہت سی ضعیف اور غریب ہلاک ہو جاتی اور کل ملک" آخری صفحے کا آغاز اس سطر سے ہوتا ہے۔

"میں تصنیف ہوئی امید کہ پسند طبیعت پسند کرنے والونکی اور قبول خاطر"

کتاب کے سرورق سے پہلے ایک سادہ ورق ہے' جس پر اسٹوری نے اپنے ہاتھ سے "۹.۵x۷.۱۵ Lines ۸۹" لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اسی حالت میں رہا ہے۔ اسٹوری نے اس کے ساتھ جو عبارت تحریر کی ہے وہ یہ ہے

TARIKH-I-IBRAHIM KHAN

تواریخ مرہٹہ

ELLIOT VIII

This Urdu Translation Made in 1209H

(1794-1795 AD) By Sayyad Muhammad

Mahdi Tabataba For Sheikh Muhammad

Bakhsh Printer of Gao Ghat

یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ کتاب' جو اپنے زمانے کے مروجہ طریق طباعت کے لحاظ سے ٹائپ میں شائع نہیں ہوئی' آیا تانبے کی پلیٹ' لکڑی یا کسی اور قدیم طریق طباعت سے شائع کی گئی۔ ان امور سے قطع نظر یہ کتاب بہرحال اردو کی اولین مکمل مطبوعہ کتاب قرار دی جا سکتی ہے اور یہ نہ صرف اپنے تقدم طباعت کے باعث بلکہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں اردو زبان کے ایک مزید دستیاب نمونہ تحریر کی حیثیت میں ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ پھر فارسی سے اردو تراجم کے ضمن میں اور اس کے علاوہ اردو تاریخ نویسی کی ایک ابتدائی مثال اور ماخذ کے طور پر بھی لائق توجہ ہے۔

پس نوشت ۔ یہ مقالہ اولاً "کتاب نما" (دہلی، مارچ ۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا تھا، پھر کم از کم دو مقالات پر نقل ہوا۔ یہ یقینی ہے کہ "تواریخ مرہٹہ و شاہ ابدالی" کا اردو ترجمہ ۱۷۹۴ء میں یا اس سے قبل ہو چکا تھا، لیکن اس کی اولین طباعت کا سنہ پھر بھی تحقیق طلب ہے۔ اس کے ایک مزید نسخہ کا پتہ چلا ہے، جو رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے اور غالباً ۱۸۴۷ء یا اس کے آس پاس کا مطبوعہ ہے۔

حواشی

۱۔ تفصیلات کے لئے ۔ سلیم الدین قریشی "اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" (اسلام آباد، ۱۹۸۶ء) ص ۱۲ وبعدہ،

۲۔ تفصیلات کے لئے ۔ ایضاً" ص ۹-۱۰ ۔

۳۔ گراہم شا (GRAHAM SHAW) "Printing in Calucatta to 1800"

(لندن، ۱۹۸۱ء) ص ۱۰۷، ۱۳۷

۴۔ ایضاً" ص ۱۸۱

۵۔ ایضاً" ص ۱۹۲، ۱۹۳

۶۔ تفصیلات کے لئے ۔ عتیق صدیقی "گلکرسٹ اور اس کا عہد" (علی گڑھ، ۱۹۶۰ء) ص ۱۹۳-۱۹۵، وینز فورٹ ولیم کالج کے تحت شائع ہونے والے تصانیف کی ایک جامع فہرست کے لئے سیسیر کمار داس

"Sahibs and Munshis: An Account of the Cottege of Fort Wiliam"

(کلکتہ، ۱۹۷۸ء)

۷۔ تفصیلات کے لئے ۔ ایضاً" ص ۱۵۱

۸۔ ڈیوڈ کوف (DAVID KOPF) "British Orientalism and the bengal renaissance, the Dynamics of Indian Modernisation" ۱۸۳۵-۱۷۷۳ (کیلی فورنیا، ۱۹۶۹ء) ص ۸۲، ڈاکٹر عبیدہ بیگم "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" (دہلی، ۱۹۸۳ء) ص ۹۵-۹۷، وینز عتیق صدیقی، ص ۱۵۱-۱۵۲

۹۔ عبیدہ بیگم، ص ۹۱

۱۰۔ جب کہ ۱۸۰۰ء تک صرف کلکتہ میں ۶۵۰ کتابوں کی اشاعت کے شواہد ملتے ہیں، جہاں ۱۷۵۵ء سے کتابوں کی اشاعت ہونے لگی تھی۔ لیکن ۱۷۷۷ء میں وہاں پہلا مطبع قائم ہوا۔ گراہم شا

"A Revised out line of Early South Asian Printing"

مشمولہ "Salg Newsletter" (لندن) شمارہ ۳۴، جون ۱۹۸۹ء، ص ۷۔ مزید تفصیلات کے لئے ۔ یہی مصنف

"South Asia, A retrospective Bibliography : 1556 - 1800"

(مطبوعہ ۔ لندن، ۱۹۸۷ء)

۱۱۔ ڈیوڈ کوف، ص ۱۱۳، ایم اے لائرڈ (M.A. Laird)

"Missionaries and Education in Bengal, ۱۷۹۳-۱۸۳۷، (آکسفورڈ ۱۹۷۲ء) ص ۵۷، دیسی زبانوں میں طباعت کی ابتدائی تاریخ کے لئے۔ اے کے پرولکر،

"Printing Press In India" (بمبئی، ۱۹۵۸ء)

گراہم شا، "Printing In Calcutta to 1800" ص ۱-۱۲ و بعدہ، و نیز عتیق صدیقی

"ہندوستانی اخبار نویسی" (علیگڑھ، ۱۹۵۷ء) ص ۳۸-۴۲

۱۲۔ ڈیوڈ کوف، ص ۱۱۳

۱۳۔ ڈاکٹر نذیر احمد، "Orinental Presses in the World" (لاہور، ۱۹۸۵ء) ص ۱۰۶-۱۰۷، مصنف نے سید غلام حسین خاں مصنف "سیر المتاخرین" کی ایک معاصر شہادت پیش کی ہے، جس کے مطابق ۱۷۹۰ء میں کلکتہ میں چار مطابع موجود تھے، جن میں سے صرف ایک مطبع کا مہتمم ایک یورپی شخص تھا۔ ص ۱۱۳-۱۱۴۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے "پندنامہ" شیخ سعدی، مطبوعہ ۱۷۸۸ء اور کئی اردو کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ کلکتہ کے مطبع "Stuart and Cooper" سے شائع ہوئی تھیں، (ص ۱۰۷) لیکن استناد کا حوالہ درج نہیں کیا۔ یہ اشاعت فارسی متن اور انگریزی ترجمے پر مشتمل تھی، گراہم شا، "Printing in Calcutta to 1800" ص ۱۱۳، اسی سال جزوی نستعلیق طباعت میں مزید کتابیں شائع ہوئیں۔ ایضاً" ص ۱۱۰

۱۵۔ تفصیلات کے لئے۔ عبداللہ یوسف علی "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" (کراچی' ۱۹۶۷ء) ص ۱۳۱' اس اخبار کے ایک شمارے کا عکس' عتیق صدیقی
"ہندوستانی اخبار نویسی" ص ۲۷ کے مقابل شائع ہوا ہے۔

۱۶۔ جلد اول' حصہ اول (لندن' ۱۹۵۳ء) ص ۷۳۲

۱۷۔ یہ غیر مطبوعہ ہے' اور اس کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود

ہیں' جن میں سے چند کی نشاندہی اسٹوری نے محولہ بالا میں کی ہے۔ لارڈ کارنوالس (Lord Cornwallis) کی فرمائش پر اس کا ایک خلاصہ "وقائع جنگ احمد شاہ ابدالی بلوسواس راؤ پسربالا جی راؤ بلجی راؤ وسواشیو راؤ عرف بھاؤ کہ درسنہ یکہزار و یک صد و ہفتادو چہار ہجری درہندوستان شدہ در ہفت جزو تمام است" منشی محمد محسن الدین نے تحریر کیا تھا۔ قدرے تخفیف کے ساتھ یہ
"The History of India as told by its own Historians."
مرتبہ ایچ ایم ایلیٹ (H.M. ELLIOT) اور جان ڈاؤسن (John Dowson)' جلد ۸' عکسی اشاعت (لاہور' ۱۹۷۶ء) ص ۲۵۷۔۲۹۷ میں شامل ہے۔

۱۸۔ "گلو گھاٹ" کا املا "گئو گھاٹ" بھی ملتا ہے۔ خود زیر نظر کتاب کے اختتامیہ میں' جو اوپر نقل کیا گیا ہے' کاتب نے ایک ہی صفحے پر اس کا املا دونوں طرح لکھا ہے۔ "مرقع خسروی" (مصنفہ شیخ محمد عظمت علی کاکوری) میں تحریر ہے کہ "درگاہ برکت تابگاہ حضرت شاہ نصراللہ خلوتی کی' ایک عمدہ پر فضا بلند ٹیلے پر لب گومتی گئو گھاٹ کے کنارے آشکار ہے۔ ایک جانب جس کے آبادی شہر کی اور دوسری طرف کوسوں کا میدان سبزہ زار ہے...... اور مقابل اس ٹیلے کے جانب شرقی ایک اور ٹیلا جو وقت آبادی لکھنؤ کے شیوخ گئو گھاٹ کے تصرف میں آیا۔ اس پر حضرت شیخ حسام الدین اہل اللہ کا مزار ہے......' مرتب ڈاکٹر ذکی کاکوری (لکھنؤ' ۱۹۸۶ء) ص ۴۳۔۴۴' نواب علی نقی خاں آخری وزیر اعلیٰ اودھ (۱۸۴۷ء۔۱۸۵۶ء) کی کوٹھی گلو گھاٹ میں تھی (سید آغا مہدی' "تاریخ لکھنؤ" جلد دوم' کراچی' سن ندارد' ص ۱۴۰) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران نامور مجاہد احمد اللہ شاہ نے گلو گھاٹ میں اپنا مورچہ قائم کر رکھا تھا' تائب لکھنوی "مراۃ احمدی" مرتبہ محمد ابرار حسین فاروقی گوپا موی' (ہردوئی' ۱۹۷۳ء) ص ۲۵۰

۱۹۔ اے اسپرنگر Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustany

"A

جلد اول کلکتہ' Manuscripts of the libraries of the king of oudh."

۱۸۵۴) مقدمہ' ص ۳

۲۰۔ تفصیلات کے لئے ایضاً" مقدمہ' ص ۴

۲۱۔ ایضاً" مقدمہ' ص ۳

۲۲۔ ایضاً" مقدمہ' ص ۴

۲۳۔ ص ۱۔۲

۲۴۔ ص ۱۴

۲۵۔ ص ۶۸

۲۶۔ ص ۳۹

۲۷۔ ص ۴۴

۲۸۔ چند وضاحتوں اور نقول کی فراہمی کے لئے راقم سلیم الدین قریشی (کتب خانہ انڈیا آفس) کا ممنون ہے۔

۲۹۔ "Catalogue of the library of the India Office,

(لندن' ۱۹۰۰ء) Hindustani books"

ہندیات کا مطالعہ اور اس کا پس منظر

سر ولیم جونز اور اس کے معاصرین کی کلوشوں کا ایک جائزہ

ہندیات[1] کے مطالعے کا پس منظر، اغراض و اسباب :

انگریزوں کا ہندوستان میں اقتدار، جو ابتدا میں برائے نام تھا، اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں مسلسل بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آتے آتے اس نے اقتدار اعلیٰ کی صورت اختیار کر لی۔ ابتداء" ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ طور طریقوں اور تجارتی مقاصد کے بارے میں، نقطہ نظر کے لحاظ سے، تبدیلی رونما ہونے لگی"[2]۔ کمپنی نے تجارت کے اس فرق کو اب بزور ختم کرنے کی کوشش کی جسے ایک صدی تک اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے اقتدار اور استحکام کے ساتھ جبر و تشدد کا ایک لامحدود سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں زیادہ سے زیادہ سامان کم سے کم معاوضہ پر حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ رہی۔ یوں انگلستان کی آمدنی میں بھی آئے دن اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سرمایہ، جو کمپنی نے ہندوستان میں تجارت سے پیدا کیا تھا، انگلستان میں صنعتی انقلاب کا سبب بنا۔ اس سلسلے میں یورپی مبصرین متفق ہیں کہ انگلستان کو صنعتی اقتدار صرف اس وجہ

سے حاصل ہوا کہ بنگال اور کرناٹک کے خزانے اسے استعمال کرنے کا موقع مل گیا تھا' ورنہ اس سے قبل انگلستان کی صنعت زوال پذیر تھی۔ ہندوستان کی دولت کا انگلستان میں جانا اور اس کا ایک صنعتی ملک بن جانا کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ ان دونوں میں علت و معلول کا رشتہ ہے[۳]۔ صنعتی انقلاب کا یہ ایک نمایاں نتیجہ نکلا کہ انگلستان کے باشندے زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے لگے اور ان میں ہندوستان سے روابط بڑھانے کا مزید شوق پیدا ہوا۔ نو آبادیات اور مقبوضات کی حکمت عملی اور ان کے طریقہ کار میں واضح تبدیلیاں لائی گئیں۔ خود کمپنی نے اپنے طریقہ کار میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس تبدیلی کے نقوش وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) اور لارڈ کارنوالس (Lord Carnwallis) کے دور میں نظر آتے ہیں۔ ان کے عہد میں نظم و نسق کی از سر نو تنظیم ہوئی اور ہندوستان کی نفسیات کے مطالعے کو ضروری سمجھا گیا۔ ان مقاصد کے لئے یہاں کی تاریخ' تہذیب' زبان اور یہاں کے علوم سے واقفیت ناگزیر تھی۔ لیکن تمام محرکات کے پس پشت فی الحقیقت اس کا ایک محرک عیسائیت کی تبلیغ کا جذبہ تھا۔ اٹھارویں صدی کے نصف اول میں یورپ کے عیسائی' اسلام کے مقابلے پر خاصے آمادہ تھے[۴] ۔ جیسوٹ (Jesuit) فرقہ' جو مشنریوں میں نہایت منظم اور فعال تھا' زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندوستان بھیجا گیا۔ جیسس سوسائٹی (Society of Jesus) کا بانی اگناتیوس لویولا (Ignatius Loyola) مغرب کے مقابلے میں مشرق کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ ہسپانوی ہونے کے سبب اسے مسلمانوں میں تبلیغ کرنے سے زیادہ دلچسپی تھی[۵]۔ تبلیغ اور تجارت کے لئے ان زبانوں کا جاننا ضروری سمجھا گیا' جو مخاطب قوموں کی زبانیں تھیں۔

اس سارے دور میں جب کہ یورپی اقوام نے ہندوستان سے تجارت جاری رکھی' ہندوستانی زبانوں' یہاں کی معاشرت اور تاریخ کی طرف ضرورتاً" اور مصلحتاً" توجہ کی گئی۔ چنانچہ اس ضمن میں یورپ کے مستشرق خاص طور پر پیش پیش

رہے۔ انہوں نے ہندوستانی زبانوں' یہاں کے ادب' مذہب اور معاشرت و تاریخ کا بڑی غائر نظر سے مطالعہ کیا۔ اس سے قبل ہندوستان کے بارے میں ان کا علم زیادہ تر بالواسطہ تھا اور یہ اپنی صحت اور وسعت میں نامکمل تھا کیونکہ اس کا ماخذ قدیم یونانی اور رومی مصنفوں اور کلیسا کے پادریوں کے بیانات' سنی سنائی اور زبانی باتوں پر منحصر تھا۔ ان قدیم مصنفوں کی تحریروں میں صداقت اور افسانے عجیب طرح خلط ملط ہو گئے ہیں۔ زمانہ وسطیٰ کے مصنفین نے زیادہ تر انہی قدیم مصنفوں کی تحریروں کو بہ طور ماخذ استعمال کیا ہے' یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا (Encyclopaedia Britannica) کے مضمون نگار بھی حقیقت اور افسانے کا یہ امتزاج پیش کرتے ہیں' لیکن ہندوستان کے بارے میں معلومات کا ماخذ صرف قدیم مصنفین اور کلیسا کے پادریوں تک محدود نہیں تھا۔ پرتگالیوں کے ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے سے قبل ہندوستان اور یورپ کے کئی نقطہ ہائے اتصال تھے۔ تجارت اور سیاحت اس کے اہم محرک تھے۔ مغربی تاجروں' عیسائی مبلغین اور سیاحوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان تک پہنچتی رہی۔ ان لوگوں نے اپنے سفر کے واقعات اور مشاہدات تحریری شکل میں بکثرت چھوڑے ہیں۔ ہندوستان کے سفر کے سلسلے میں مشہور سیاحوں میں بارتھما (Barthema)' فیڈریچی (Fedrici)' باربوسا (Barbosa)' فچ (Fitch) اور فان لنشوٹن (Van Linschoten)' کے نام ہیں۔

سترہویں صدی میں جو سیاح شہرت کے حامل ہوئے ان میں دیلا والے (Della Valle)' بلدایوس (Baldaeus)' ٹاورنیر (Tavernier)' برنیئر (Bernier) اور مانڈیلس لو (Mondelslo) کے نام ہیں[6]۔

ہندیات کے مطالعے میں اس قسم کی معاون کوششیں زیادہ تر انفرادی سطح پر ہوتی رہیں' لیکن "ایشیاٹک سوسائٹی بنگال" (Asiatic Society of Bengal) کا قیام ہندیات کے مطالعے کی تاریخ میں ایک نمایاں اور موثر ترین اقدام تھا۔ فی الحقیقت ہندیات کے سائنٹی فک (Scientific) مطالعے کی ابتدا اس کے قیام

کے ساتھ وابستہ ہے اور اس لحاظ سے اس کا بانی سر ولیم جونز (Sir William Jones) 'بابائے ہندیات' ہے۔ اس سوسائٹی کے قیام سے نہ صرف استعماری طاقتوں کے مقاصد کی تکمیل ہوئی بلکہ اس کے قیام سے علمی دنیا میں چند ایک مثبت انقلابات بھی رونما ہوئے جن سے ایک طرف تو ہندوستان متاثر ہوا اور دوسری طرف اس سے بڑھ کر خود یورپ میں مشرقی علوم کی تحصیل اور ایشیائی اقوام کی تاریخ و تہذیب کے مطالعے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

ہندوستان کے عہد جدید کا مطالعہ دراصل ہندوستان میں برطانوی حکمت عملیوں اور کارگزاریوں کا مطالعہ ہے۔ حال ہی میں بعض مورخین نے ہندوستان میں برطانوی حکمت عملیوں کا مطالعہ یورپ کی علمی تحریکوں کے رشتے سے بھی کیا ہے[۷]۔ آج بھی برطانوی مورخین کے نزدیک عہد جدید میں ہندوستان کی تاریخ دراصل "برطانوی ہند کی تاریخ" ہے۔ برطانیہ کی انتظامی حکمت عملیوں اور تصورات کے تفصیلی مطالعے کے لئے ہندیات کے ارتقاء کی تاریخ کا جائزہ بھی ناگزیر ہے۔ عام طور پر یہ حقیقت پیش نظر نہیں رہی ہے کہ اٹھارویں صدی میں مشرقی علوم کے مطالعے کے پس پشت سیاسی مقاصد کارفرما رہے ہیں اور یہ کہ ہندوستانی معاملات و مسائل پر قلم اٹھانے والوں نے ہمیشہ مستشرقین کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے اور اپنی حکمت عملیوں کو تشکیل دیا ہے۔ ان تمام مستشرقین میں، جنہوں نے بالخصوص ہندیات کا مطالعہ کیا، جونز کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ اٹھارویں صدی کی برطانوی حکمت عملیوں اور ہندیات کے مطالعے کی تاریخ میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت کے مطالعے کے لئے ایک منظم کوشش "ایشیاٹک سوسائٹی" کے قیام سے انجام دی۔ ہندوستانی تہذیب، زبان اور مذہب و سیاست پر اس کی تحریروں نے یورپ کے ایک خاص پڑھے لکھے طبقے کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ انہیں اس موضوع پر مزید تحقیقات کی ترغیب دی۔ اسے سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ جب تک وہ انگلستان

میں رہا' امریکہ کی جنگ آزادی کا موئید اور پارلیمانی اصلاح کا حامی رہا[۸] اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے لئے قانون اور حکومت کا ایک واضح نظریہ پیش کیا۔ عام طور پر وہ ارباب اقتدار سے قریب اور ان کے مشوروں میں شامل رہا[۹]۔ اسے ہندوستان کے عہد جدید کی تاریخ میں محض اس وجہ سے اہمیت حاصل نہیں کہ اس نے ہندیات کے ضمن میں بڑی اہم تحقیقات پیش کی تھیں' بلکہ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی تحریروں اور مساعی کے سبب ہندوؤں نے اپنے آپ کو پہچانا اور ہندو قومیت کے عوامل کو ان سے تقویت پہنچی۔ اس کے بعد کے ہندوستان کی تاریخ دراصل دو قومیتوں کی تاریخ ہے' جس میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے قومی تشخص کا اظہار اب اعلانیہ طور پر کرنے لگتے ہیں۔

جونز ایک ذہین عالم تھا اور اسے زبان دانی کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں جب وہ ۱۷۶۴ء میں آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو رہا تھا[۱] عبرانی' یونانی' لاطینی' فرانسیسی' ہسپانوی' اطالوی' عربی اور فارسی زبانیں جانتا تھا۔ ان کے علاوہ وہ المانوی' پرتگیزی' ترکی' چینی وغیرہ بھی سیکھ چکا تھا[۲]۔ اپنی چوبیس سال کی عمر میں اس نے فارسی سے فرانسیسی میں نادر شاہ کی سوانح پر مشتمل ایک کتاب "تاریخ نادری" کا ترجمہ کیا' جو محمد مہدی خاں کی تصنیف تھی۔ اس کے ایک سال بعد وہ حافظ کی سولہ غزلوں کا ترجمہ اور انگریزی میں فارسی زبان کی ایک قواعد لکھ چکا تھا[۳]۔ ۱۷۷۰ء سے ۱۷۸۳ء کا عرصہ اس کے لئے تحریر و تصنیف کے اعتبار سے اور علمی حلقوں میں شہرت کے لحاظ سے خاصہ مفید رہا۔ اس مدت میں اس نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا جن میں سے کم از کم نو کتابیں مشرقی علوم سے متعلق تھیں[۳]۔ اس عرصے میں وہ ایک مستشرق کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا۔ اپنی علمی قابلیت سے قطع نظر وہ ایک ممتاز قانون دان بھی سمجھا جاتا تھا' چنانچہ اس کی اس خصوصیت کے پیش نظر ۱۷۷۸ء میں اسے ہندوستان میں عدالت کی منصفی کی پیش کش کی گئی[۴] تو اس نے اس پیش کش کو آمدنی اور حیثیت میں

اضافے کے خیال سے قبول کر لیا۔ ۱۳ اپریل ۱۷۸۳ء کو وہ کلکتہ کے لئے روانہ ہوا۔ روانگی سے چند دن قبل اسے "سر" کا خطاب بھی ملا۔

سفر کے دوران اس نے ذہنی طور پر ایک منصوبہ تشکیل دے لیا کہ اسے ہندوستان میں رہ کر کیا کرنا ہے[۵]۔ وہ ان موضوعات پر خاص طور پر تحقیق کرنا چاہتا تھا۔

۱۔ ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ
۲۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین
۳۔ رسم الخط
۴۔ لفظوں کے استعمال کی روایات
۵۔ ہندوستان کا جغرافیہ اور معاصر سیاست
۶۔ بنگال پر حکومت کے بہتر طریقے
۷۔ ریاضی' الجبرا اور متفرق علوم
۸۔ علم طب' کیمیا' جراحی اور علم الابدان
۹۔ ہندوستان کی معدنیات
۱۰۔ شاعری' خطابت اور اخلاقیات
۱۱۔ موسیقی
۱۲۔ چین کی غنائی نظمیں
۱۳۔ تبت اور کشمیر کے بارے میں بہتر معلومات
۱۴۔ ہندوستان کی تجارت' صنعت اور زراعت
۱۵۔ مغلیہ دستور حکومت
۱۶۔ مرہٹہ دستور حکومت

ان سولہ امور کو تین حصوں تاریخ' سائنس اور فنون میں تقسیم کر کے ان کے مطالعے کے سلسلے میں وہ خیال کرتا تھا کہ مخطوطات جمع کر کے ان کے جائزے

میں مقامی افراد سے مدد لے گا۔ اس وقت تک اس نے کسی 'سوسائٹی' کے قیام کی بابت نہیں سوچا تھا۔

'ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کا قیام:

جونز کو کلکتہ میں' جہاں وہ ۲۵ ستمبر ۱۷۸۳ء کو پہنچا' افسروں کا ایک ایسا گروہ مل گیا جو ہندیات کے مطالعے کا شائق تھا۔ اس گروہ کے بعض افراد بڑے نامور ہوئے۔ ان میں چارلس ولکنس (Charles Wilkins)' نیتھنل ہالہیڈ (Nathaniel Halhed)' جان شور (John Shore)' فرانسس گلیڈون (Francis Gladwin)' جان کرناک (John Carnac)' جوناتھن ڈنکن (Jonathan Duncan) اور ولیم چیمبرس (William Chambers) تھے۔ ان میں سے بیشتر نے ہندیات کے ضمن میں انفرادی طور پر بھی نمایاں کام کیے اور 'ایشیاٹک سوسائٹی' کے قیام اور اس کے جرنل (Journal) کی ترتیب و تحریر میں معاونت کی۔

جونز کی آمد سے قبل اس کی شہرت و ناموری ہندوستان پہنچ چکی تھی[۶] اب تک یہاں کسی مستشرق نے ہندوستانیوں کی زندگی اور معاشرت کے مطالعے کی مستقل کوشش نہیں کی تھی۔ اس عرصے میں بنگال میں صرف ایک فرد ایسا تھا جس نے ہندیات کے مطالعے کی کوششوں کو سراہا اور سرپرستی کی تھی۔ یہ وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) تھا جو ۱۷۷۲ء سے بنگال کا گورنر تھا۔ وہ اپنی ابتدائی عمر ہی میں ہندوستان آ گیا تھا اور یہاں کے طویل المدت قیام نے اسے اس ملک کی روایتوں اور رسوم و رواج سے خوب واقف کرا دیا تھا۔ اس نے فارسی اور عربی زبانیں سیکھ لی تھیں[۷] اور اپنے شوق کی بنیاد پر ہندوستانی مصوری کے بہت سے شاہکاروں اور مخطوطات کو جمع کیا تھا۔ مقامی لوگوں سے وہ ان ہی کی زبانوں میں

بات چیت کر لیتا تھا[۱۸]۔ وہ اپنے ان خطوط میں، جو وہ اپنی بیوی کو تحریر کرتا تھا، گیتا کے اقوال نقل کرتا۔ خود جونز نے گیتا کے مطالعے کا شوق ہیسٹنگز کی صحبت میں حاصل کیا تھا[۱۹]۔ ۱۷۷۲ء میں جونز کی فارسی قواعد اس کی نظر سے گزر چکی تھی[۲۰]۔ چنانچہ یہ امر اس کے لئے فطری تھا کہ وہ ہندیات کے مطالعے کی کوششوں کی سرپرستی کرتا۔ اس نے متعدد پیشرو مستشرقین کی حوصلہ افزائی اور سپریم کونسل (Supreme Council) میں ان کی حمایت کی[۲۱] اور ان سے متعدد مواقع پر بحث مباحثے کئے۔ ولکنس نے اس کی حوصلہ افزائی کے جواب میں اپنی پہلی کتاب کا انتساب اس کے نام کیا۔ شور اور ہالہیڈ نے بھی اس کے لئے اپنی تحریروں اور خطوط میں تشکر کا اظہار کیا۔ ہیسٹنگز کی ان حوصلہ افزائیوں کے پس پشت ایک اور اہم مقصد تھا۔ اس نے ۱۷۷۶ء میں یہ حکمت عملی اختیار کی تھی کہ ہندوستانیوں پر ان ہی کے قوانین کے تحت حکومت کرنی چاہئے ـــــ چنانچہ اس نے چند برہمن پنڈتوں کو 'جنتو قوانین' کا ایک مسودہ فارسی زبان میں مرتب کرنے کا کام سپرد کیا[۲۲] ہندوستان پر حکومت کرنے کے سلسلے میں یہ اس کے ذہن کی ایک رسائی تھی۔ اب یہ موقع قریب آ رہا تھا کہ وہاں کی برائے نام سسکتی ہوئی حکومت دم توڑ دے اور صرف انگریزی اقتدار مسلط ہو اور اس مقصد کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہاں انگریزی طریق حکومت یا دستور ہی نافذ ہو۔ اس نے ۱۷۸۰ء میں 'کلکتہ مدرسہ' محض اس لئے قائم کیا تاکہ ہندوستانیوں کے سخت رد عمل اور تعصب کو نرم کیا جا سکے، جو برطانوی اقتدار کے آئے دن اضافے سے مضطرب اور مشتعل ہو رہے تھے [۲۳]۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانوی اقتدار ہندوستانیوں کے اشتراک عمل سے پروان چڑھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستانیوں کے مزاج، رسم و رواج، قوانین اور ادب کے مطالعے کی کوششوں کو مزید پھیلا دیا جائے۔ آئندہ ہالہیڈ اور جونز کے ترجمہ کردہ 'جنتو قوانین' اس کے منصوبے کا ایک حصہ تھے[۲۴]۔

بعد کے حکمران ہندیات کے مطالعے سے بالعموم بے بہرہ رہے۔ گو کہ وہ یہ

سمجھتے تھے کہ حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے بارے میں معلومات رکھنی چاہئیں' لیکن ان میں سے کوئی بھی ہیسٹنگز کی طرح ہندیات کے مطالعے کا سرپرست اور خود شائق نہیں رہا۔ ویسے کارنوالس 'ایشیاٹک سوسائٹی' کے زیادہ تر سالانہ جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ پھر ہنری ہارڈنگ۔ (Henry Hardinge) اور چارلس ہارڈنگ (Charles Hardinge) بھی اس کے صدر اور برطانیہ کے تمام گورنر جنرل بظاہر اس کے سرپرست رہے۔

۱۷۸۳ء کے آخر تک جونز کا یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ مشرقی علوم کا باقاعدہ مطالعہ کسی فرد واحد یا انفرادی طور پر کرنے والے افراد کے ذریعے ممکن نہیں' چنانچہ جنوری ۱۷۸۴ء میں اس نے ایک مراسلہ جاری کیا جس میں اس نے مشرقی علوم کے مطالعے کے لئے کلکتہ میں ایک 'سوسائٹی' کے قیام کا منصوبہ پیش کیا۔ یہ مراسلہ ان تمام لوگوں کے نام تھا جو اس سلسلے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ تیس افراد نے اس مراسلے کا جواب اثبات میں دیا اور وہ سب ۱۵ جنوری ۱۷۸۴ء کو کلکتہ کی عدالت عظمٰی کے 'جیوری روم' میں جمع ہوئے۔ جہاں چیف جسٹس سر رابرٹ چیمبرس (Sir Robert Chambers) نے نشست کی صدارت کی اور جونز نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا' جس میں اس نے ایشیا کی تاریخ' تہذیب' ادب' فنون اور سائنس کے مطالعے کے لئے سوسائٹی' کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ اس کے خیال میں "ایشیا نے علوم کی پرورش کی ہے اور اس نے مفید و لطیف فنون تخلیق کئے ہیں۔ ہم آسانی سے اپنے فاضل اوقات میں ایشیا کے قوانین' مذہب' طریق حکومت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ اس ملک پر حکومت کرنے کے لئے معاون اور ضروری ہے۔"[۲۵]

اس پہلے اجلاس میں جونز نے یہ قرار داد پیش کی کہ 'سوسائٹی' کے اراکین کے لئے شرائط اور سخت قوانین نہیں ہوں گے۔ ہر ہفتہ 'سوسائٹی' کے اجلاس ہوں گے' اس میں طبع زاد مقالے پڑھے جائیں گے اور ان پر اظہار خیال کیا جائے

کل تراجم پڑھنے کی اجازت بھی ہو گی لیکن صرف وہ تراجم جو کسی ہندوستانی مصنف کی تحریروں پر مبنی ہوں اور ہر سال کے اختتام پر یہ مقالات علمی دنیا کے لئے ترتیب دیئے جائیں گے[۲۶]۔ اس 'سوسائٹی' کو "ایشیاٹک سوسائٹی" کے نام سے موسوم کیا گیا اور اسے محض مستشرقین کے لئے مخصوص رکھا گیا۔ اس میں کسی پڑھے لکھے مقامی فرد کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء تک اس میں کسی ہندوستانی کو رکن کی حیثیت سے شامل نہیں کیا گیا' لیکن کچھ ہندوستانیوں کے مقالات کو اس کے 'جرنل' میں ضرور شامل کر لیا جاتا تھا۔

جونز نے اس سوسائٹی' کو انگلستان کی 'رائل سوسائٹی'

(Royal Society) کے طرز پر رو بہ عمل رکھنا چاہا تھا۔ اس اعتبار سے 'رائل سوسائٹی' کے سرپرست کی جگہ اس سوسائٹی' کے لئے اس نے تجویز کیا کہ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز اس کی صدارت کو قبول کر لے' لیکن ہیسٹنگز نے خود جونز کو اس کی صدارت کے لئے آمادہ کر لیا[۲۷]۔ چنانچہ اپنے انتقال (۱۷۹۴ء) تک جونز ہی اس کا صدر رہا۔ دس سال کی اس مدت میں سوسائٹی' کی رکنیت تیس افراد سے شروع ہوئی تھی اور یہ تعداد بعد میں ایک سو دس تک پہنچ گئی۔ ابتداء کی نشستیں ہر ہفتے ہوتی رہیں' لیکن جلد ہی یہ باقاعدگی ختم ہو گئی اور پھر اس کی نشستیں پندرہ روزہ یا پھر طویل مدت کے بعد منعقد ہونے لگیں۔ ان پہلے دس سالوں میں اس کی نشستیں تعداد میں سو سے کچھ زیادہ ہی ہوئی ہوں گی[۲۸]۔ اس کے سالانہ اجلاس میں' جس میں زیادہ سے زیادہ تیس اراکین حاضر ہوتے' گورنر جنرل اور سپریم کونسل کے اراکین' کمپنی کے اعلیٰ عہدہ دار اور عدالت عظمیٰ کے جج شریک ہوتے تھے۔

'سوسائٹی' کو سرکاری سطح پر ہمیشہ سرپرستی حاصل رہی۔ کمپنی نے ۱۷۸۸ء میں اپنا مطبع سوسائٹی' کو اپنا "جرنل" شائع کرنے کے لئے دے دیا تھا۔ ابتدائی دور میں 'سوسائٹی' کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی' اس کی نشستیں عدالت عظمیٰ کے

جیوری روم' میں ہوتی رہیں[۲۹]۔ حکومت اس بات پر بھی آمادہ تھی کہ وہ 'سوسائٹی' کو ملک کے ضروری حالات سے باخبر کرتی رہے گی۔ ۸ اپریل ۱۷۸۴ء کو گورنر جنرل نے تبت کے بارے میں سیموئیل ٹرنر (Samuel Turner) کی تحریریں 'سوسائٹی' میں پڑھنے کے لئے بھیجی تھیں[۳۰]۔ جان میکفرسن (John Macpherson) نے جو ہیسٹنگز کے بعد بنگال کا گورنر بنا تھا' 'سوسائٹی' کو چند معلومات فراہم کی تھیں۔ اس نے 'سوسائٹی' سے کلکتہ مدرسہ کے لئے اسلامی قوانین اور روایات سے واقف کسی فرد کو منتخب کر کے بھیجنے کے لئے کہا تھا جو مدرسہ اور طلبہ کی کیفیت سے 'سوسائٹی' کو بھی مطلع کرتا رہے۔ چنانچہ 'سوسائٹی' کی طرف سے ولیم چیمبرس (William Chambers) کو اس کام پر مامور کیا گیا[۳۱]۔

'سوسائٹی' کے مقاصد محض اس طرح پورے نہیں ہو سکتے تھے' اس کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ مخطوطات اور ہندو اور مسلمان علماء سے بھی معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے لئے بعض مقامات جیسے بنارس وغیرہ کا دورہ بھی ضروری تھا۔ یہ سب کام جونز کے ذمے کر دیا گیا۔ 'سوسائٹی' نے ایک مہتمم کا بھی انتظام کیا' جو اپنے گھر میں 'سوسائٹی' کے مخطوطات اور کتابوں کی جمع و ترتیب کا کام کرتا رہتا تھا۔ 'سوسائٹی' کے لئے گو کہ دیگر اراکین بھی مقالات لکھتے رہتے تھے' لیکن زیادہ تر کام خود جونز نے ہی کیا تھا۔ اس کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جو مقالہ نگار کلکتہ سے باہر ہوتے' وہ ان کے مقالات کو اصلاح کے بعد 'سوسائٹی' کے اجلاس میں پڑھ کر سناتا۔ یہاں تک کہ 'سوسائٹی' کی جانب سے خط و کتابت بھی عام طور پر وہی کیا کرتا[۳۲]۔

جونز کی شخصیت اور اس کی کاوشوں کے سبب 'سوسائٹی' کی شہرت بہت جلد یورپ میں پھیل گئی اور جب ۱۷۸۴ء میں 'سوسائٹی' کے تحت اس کا پہلا تحریری کارنامہ 'کام دیو کے اقوال' کا سنسکرت سے فارسی میں اور پھر فارسی سے انگریزی میں ترجمہ منظر عام پر آیا تو اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کے انتقال تک 'سوسائٹی' نے خاصا اہم اور معیاری کام کر لیا۔ یہ سب کچھ جو اس نے اس وقت

تک کر لیا تھا' یورپ کی علمی دنیا کے لئے ایک محرک ثابت ہوا۔
سوسائٹی کے قیام کے فوراً" بعد ہی یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ ایک مجلّہ بھی' جو محض ہندیات کے لئے مخصوص ہو' زیادہ فائدہ مند اور موثر ثابت ہو گا۔ چنانچہ ۱۷۸۵ء میں "Asiatick Miscellany" کا اجراء ہوا۔ اس کی ادارت فرانسس گلیڈون (Francis Gladwin) کے سپرد ہوئی' جو تصنیف و تالیف اور صحافت کا تجربہ رکھتا تھا[۳۳]۔ اس کے مندرجات میں بنیادی طور پر مشرقی ادبیات کے تراجم' قدیم تحریروں کے اقتباسات اور طبع زاد مقالات شامل ہوتے تھے۔ اس کا نام جونز کے افتتاحیہ خطبے سے اخذ کیا گیا تھا۔ لیکن یہ مجلّہ جونز کے تصورات کی تعبیر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا مجلّہ چاہتا تھا جو صرف طبع زاد مقالات پر مشتمل ہو۔ چنانچہ اس کی تجویز کے مطابق جنوری ۱۷۸۹ء میں
"Asiatick Researches" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ اس کا معیار اس وقت کے اچھے سے اچھے جرنل کے برابر تھا۔ اس میں متعدد طبع زاد مقالات شامل تھے اور ان کے انتخاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا تھا کہ یہ متنوع بھی ہوں۔ ان مقالات میں ہندوؤں کے مذاہب اور زبانیں' ہندوستانی ادب' رسم و رواج' تبت کا ایک سفر' پٹنہ میں سکھوں کا ایک کالج' جیسے مقالات شامل تھے۔ اس میں کم از کم چار ہندوستانی عالموں' گوبر دھن کول' پنڈت رام لوچن[۳۴] رادھا کانت شرمن[۳۵] اور علی ابراہیم خان[۳۶] کے مضامین بھی شامل کئے گئے تھے۔ یورپ میں اس مجلّے کو بہت سراہا گیا[۳۷]۔ جونز کی وفات تک اس کے جتنے شمارے شائع ہوئے' ان میں زیادہ تر مقالات جونز ہی کے تحریر کردہ تھے۔ اپنے مقالات کے لئے معلومات وہ زیادہ تر مخطوطات اور ہندو اور مسلمان عالموں سے گفتگو کے ذریعے حاصل کرتا تھا۔ اس مجلّے کی ہر اشاعت بجائے خود ایک مستقل حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن سرمایہ کی قلت کی وجہ سے یہ مستقل طور پر جاری نہ رہ سکا۔ چنانچہ جونز نے ایک ناشر کو اس کی اشاعت پر آمادہ کیا' جو اس شرط پر رسالہ شائع کرنے لگا کہ سوسائٹی کا ہر

رکن اس کی ہر جلد بیس روپے میں خریدے گا[۳۸] ۱۷۹۷ء تک اس کی کل پانچ جلدیں شائع ہو سکیں۔[۳۹]

جونز کے انتقال کے بعد سوسائٹی کو کوئی اور اس جیسا عالم نہ مل سکا لیکن اس نے اپنا وہ کام جاری رکھا' جس کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ گو کہ اس کی نشستوں اور اس کے جلسوں کے انعقاد میں تواتر اور باقاعدگی برقرار نہ رہی لیکن اس نے اشاعتی میدان میں خاصہ اہم مذہبی' تاریخی اور ادبی سرمایہ فراہم کیا۔ بعد کی تاریخ میں اس کے نمایاں کارناموں میں قدیم اور اہم مخطوطات کی تلاش و جستجو اور اس سے بڑھ کر ان کی تصحیح و ترتیب شامل ہے۔

ولیم جونز کا کام ہندیات پر:

جونز عام طور پر بابائے ہندیات کی حیثیت میں معروف ہے۔ ایک عام فرد کے لئے وہ اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے ہند یورپی زبانوں کی اصل کو ایک قرار دیا' شکنتلا کا ترجمہ کیا اور سنسکرت ادب کو یورپ میں متعارف کرایا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان کے بارے میں اس حد تک معلومات حاصل کر لے کہ کسی اور غیر ملکی نے اتنی حاصل نہ کی ہوں[۴۰]۔ جب وہ ہندوستان آیا تھا تو اسے ہندو مت اور سنسکرت کی بابت کسی حد تک علم تھا اور وہ سنسکرت نہیں جانتا تھا۔ چارلس ولکنس (C. Wilkins) کے زور دینے پر اس نے سنسکرت کو سیکھنا شروع کیا[۴۱]۔ ستمبر ۱۷۸۵ء تک وہ ہندو مت اور سنسکرت کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ مئی ۱۷۸۶ء تک اس نے سنسکرت سے ترجمے کی کوشش شروع کر دی تھی اور ستمبر ۱۷۸۶ء میں اس نے اپنے آپ کو سنسکرت میں پختہ قرار دے دیا تھا[۴۲]۔ قیام کلکتہ کے چند ہی مہینوں میں جونز اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ سنسکرت' لاطینی اور یونانی زبانوں میں بڑی مماثلت ہے۔ زبانوں کی مماثلت سے

جونز نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان زبانوں کے بولنے والے بھی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں"[۴۳]۔

ہندیات سے متعلق جونز کی تحریریں اس کے غیر معمولی ذہن کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے اہم تراجم میں سے ایک منو کے قوانین' کا ترجمہ ہے اور دوسرا کالیداس کا شکنتلا"۔ زبان' تاریخ اور مذہب سے قطع نظر اس نے ادب اور موسیقی پر قلم اٹھایا اور ہندو فلسفے کے مکاتیب کا تجزیہ کیا۔

Asiatick Researches' میں اس کے مقالات اور شکنتلا' کا اس کا ترجمہ بہت جلد یورپ کی دوسری زبانوں میں منتقل ہو گئے۔ اس نے فارسی زبان کی قواعد لکھی' جو کم از کم شیراز کی ادبی بولی کو' جو اٹھارویں صدی سے فارسی مخطوطات میں نظر آتی ہے' سمجھنے میں معاون تھی"[۴۴] یہ بنیادی طور پر انگریزوں کے استفادے کے لئے تھی۔ جب وہ ہندوستان آیا تو سنسکرت سیکھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا' وہ اسے ولکنس (Wilkins) کا حق سمجھتا تھا[۴۵]۔ یکم مارچ ۱۷۸۵ء تک اسے بنارس سے ایک "دھرم شاستر" کا مخطوطہ مل گیا تھا۔ جونز اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہتا تھا[۴۶]۔ پھر اس کو منو کے قوانین' کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی سنسکرت سیکھنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت تک اس نے ہندو مت پر قلم اٹھانے کے لئے بھگوت پران' یوگ وشسٹ' اور سنگیت درپن' کے توسط سے بہت کچھ مواد جمع کر لیا تھا"[۴۷] ۔ ۴ فروری ۱۷۸۵ء کو' جب کہ اسے سنسکرت سیکھتے ہوئے بہ مشکل چار مہینے ہوئے تھے' اس نے ہندوؤں پر اپنا ایک مقالہ تیار کر لیا[۴۸]۔ جب وہ ہندوستان آیا تھا تو اس کے پیش نظر ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین کا ترجمہ بھی تھا۔ ہندو قوانین کے ضمن میں منو کے قوانین' کا ترجمہ اور مسلمانوں کے قوانین کے ضمن میں مسلمانوں کے قوانین وراثت'

(The Mohomedan Law of Succession) اور السراجیہ' کے تراجم اسی تعلق سے اس کی کوششیں ہیں۔[۴۹] ایشیائی علم ہجا' پر اس کا مضمون سنسکرت کے

مطالعے میں ایک اہم اضافہ تھا۵۰۔"

ہندومت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نے ابتداء" فارسی ماخذ کا جائزہ لیا تھا' جیسے محسن فانی کی تصنیف دبستان المذاہب' داراشکوہ کا ترجمہ اپنشد' اور دھرم شاستر' کے فارسی تراجم' اس کے مطالعے میں رہ چکے تھے۔ بعد میں اس نے اصل ماخذ' ان کی اصل زبانوں میں' پنڈتوں کی مدد سے پڑھے۔ ہندومت کی دو باتوں نے اسے خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ایک تو اس کا تصور خدا' جو ثنویت کا حامل نہیں تھا اور انسانی روح کا تصور' جس کو شنکر نے ویدانت' کی تشریح کرتے ہوئے پیش کیا تھا اور دوسرے آواگون'۔ جونز کا خیال تھا کہ ایک لحاظ سے ہندومت عیسائیت سے بہتر ہے۔ اسے عیسائیت کے طریق سزا' اور اذیت کے دوام' پر یقین نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں اسے ہندومت کا تصور آواگون' زیادہ عقلی معلوم ہوتا تھا۵۱۔

ہندوؤں کی تاریخ کی تدوین میں جونز نے زیادہ تر بھگوت گیتا' کے فارسی ترجمے پر انحصار کیا تھا۔ جان شور (John Shore) نے اسے پران ارتھ پرکاش' بھی فراہم کر دیا تھا۵۲۔ جسے پنڈت رادھا کانت نے وارن ہیسٹنگز کے لئے ترتیب دیا تھا۵۳ اور اس میں مذہب اور تاریخ کے ضمن میں پرانوں' کا نقطہ نظر بیان کیا تھا۔ رادھا کانت سے جونز کی ملاقات ۱۷۸۷ء میں ہوئی تھی۔ اس سے وہ طویل مباحثے کیا کرتا۔ پنڈت رام لوچن جو جونز کا استاد بھی تھا اور ایک کشمیری برہمن گوبردھن کول' ہندوستان کی تاریخ کی ترتیب میں جونز کے معاون تھے۵۴۔ ۱۷ جون ۱۷۹۰ء کو سوسائٹی کے اجلاس میں اس نے ایک مقالہ بعنوان "ہندوستانی تاریخ پر ایک ضمیمہ" (A Supplementary Essay on Indian Chronology) پڑھا۔ اسے اپنے ایک دوست سیموئیل ڈیوس (Sameul Davis) سے سوریا سدھانت' کی ایک نقل ملی تھی جسے اس نے اپنے استاد کی مدد سے پڑھ لیا تھا۔ ہندو اساطیر کے مطالعے میں یہ اس کے لئے بڑی مفید رہی۔ اس کی مدد سے جونز نے ہندوؤں

کی تاریخ کے تعین میں بڑی مدد لی تھی۔ کرشن نگر کے دوران قیام میں وہ اپنا زیادہ وقت برہمنوں سے ہندو اساطیر' فلسفہ اور ادب پر گفتگو میں صرف کرتا تھا۔ یہیں اس نے نباتات کا بغور مشاہدہ بھی کیا اور ان کی نوع کے اعتبار سے ان کی اقسام بندی بھی کی۔ لیکن یہ اس کا کوئی مستقل کام نہیں تھا۔ کرشن نگر میں تو اس کی دل جمعی زیادہ تر ان ہندوؤں کے ساتھ وقت گزارنے میں ہوتی تھی جو اسے جنگجو قوم کا ہندو' کہا کرتے تھے[55] یہیں اس نے کرشن نگر کے بچوں کے لئے سنسکرت کی نظمیں ترتیب دیں۔ نثر میں سنسکرت سے گیتا گووندا' یا جے دیو کے گیتوں' کے ترجمے نے اسے ہندو ادب سے قریب تر کر دیا[56]۔

شکنتلا" کے بارے میں اس کو پہلے پہل ۱۷۸۷ء میں معلومات حاصل ہوئیں۔ یورپ میں ہندوستانی ناٹک' کے بارے میں وہ سن چکا تھا اور یہ بھی کہ یہ گیتوں بھری ہندو تاریخ' ہوتے ہیں۔ کلکتہ میں رادھا کانت نے ناٹک کی تعریف کرتے ہوئے اسے انگریزوں کے ان ڈراموں سے مماثل کیا تھا' جو ان دنوں موسم سرما میں کلکتہ میں دکھائے جاتے تھے۔ چنانچہ اسے' بہتر سے بہتر ناٹک دکھانے کی فرمائش پر' شکنتلا" دکھایا گیا۔ وہ اس سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے شکنتلا" کا ترجمہ کرنا چاہا اور اس میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے سال ۱۷ اگست کو اس نے یہ ترجمہ پہلے لاطینی میں اور پھر انگریزی میں مکمل کر لیا۔ ۱۷۸۹ء میں کلکتہ میں اس کا پہلا انگریزی ترجمہ شائع ہوا اور ایک سال کے بعد لندن سے دوبارہ شائع کیا گیا[57]۔ اسی دوران اسے عبداللہ "ہاتفی کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں' کا ایک نادر مخطوطہ دستیاب ہوا' چنانچہ اس نے اس کے ترجمے کا بھی ارادہ کر لیا۔ فارسی کے کسی متن کے ترجمے کی یہ اس کی پہلی کوشش تھی۔ ترجمے کے علاوہ اس نے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا جس میں ہاتفی کے اسلوب اور فن سے بحث کی[58]' یہ ترجمہ کلکتہ سے ۱۷۸۸ء میں شائع ہوا۔

جونز نے اپنی تحریروں اور تحقیقات سے مجموعی طور پر یہ ثابت کرنے کی

کوشش کی کہ ہندوستان ریاضی، الجبرا اور منطق میں برتری رکھتا ہے[۵۹]۔ اس کے خیال میں یہ بھی ممکن تھا کہ ارسطو نے منطق کا اپنا نظام برہمنی قیاس' سے اخذ کیا ہو۔ اس نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ زیادہ تر ہندوستانی اور یورپی اقوام ایک ہی اصل رکھتے ہیں۔ ان کی زبانیں بھی ایک ہی زبان سے مشتق ہیں۔ ہندو اور یونانی دونوں مشترک خداؤں کو مختلف ناموں سے پوجتے ہیں۔ قدیم ہندوستان اور یونانی علم افلاک بھی ایک ہی تھا۔ مجموعی طور پر ہندوستانیوں نے' ہندوستان میں آنے اور بس جانے کے بعد' انسانی تہذیب کی زیادہ خدمت کی ہے۔ اس نے ایک نئی شہادت بھی فراہم کی کہ شطرنج کا کھیل ہندوستان ہی میں ایجاد ہوا تھا[۶۰]۔ ہندو' اس کے خیال میں بجا طور پر علم القواعد' اعشاری پیمائش اور شطرنج کی ایجاد پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ آئزک نیوٹن (Issac Newton) کا کل نظریہ اور اس کے فلسفے کا ایک حصہ ویدوں اور حتیٰ کہ صوفیوں کے علوم میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک' ہندیات کے مطالعے کے ضمن میں' جونز کی اہمیت اور انفرادیت کا تعلق ہے' اس کا صحیح اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اس کی بیشتر کوششیں ایسی ہیں جن پر' اس ہی کے دور میں' چند فرانسیسی مستشرقین نے بھی تحقیقات کی تھیں اور جہاں تک علم ہجا' کا تعلق ہے یہ اس کا بہت اہم کارنامہ نہیں ہے۔ ہندیات کے مطالعے میں اس کا اصل اور حقیقی کارنامہ فی الحقیقت 'ایشیاٹک سوسائٹی' کی تشکیل ہے جس نے ہندوستان کو علمی دنیا سے کما حقہ' متعارف کرایا۔ اس میں بعد میں گو کہ ہندوستانیوں کی مدد بھی' بالخصوص ۱۸۲۹ء سے' شامل رہی ہے جب سے کہ انہیں اس میں شمولیت کی اجازت مل گئی۔ ویسے اس نے اور اس کی سوسائٹی' نے ہندوستانی تاریخ کے مطالعے کے لئے ایک وقیع مثال قائم کی ہے۔ گیتا گووندا' اور شکنتلا' کے اس کے تراجم نے ہندوستانی ادب کو عالمی ادب کے ہمسر کیا۔

جونز سے قبل ہندیات کے مطالعے کی روایات:

عام طور پر ہندیات کے مطالعے کے ضمن میں ایشیاٹک سوسائٹی' کو اولیت اور جونز کو بابائے ہندیات' تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ان کی مستقل' عالمانہ اور بلند پایہ تحقیقی کاوشوں کا سبب ہے۔ لیکن اس امر کو' اولیت کے نقطہ نظر سے' فی الحقیقت درست نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں تک ہند یورپی زبانوں کی اصل کے تصور کا تعلق ہے' جونز اس کے اظہار میں پہلا شخص نہیں ہے۔ تھامس اسٹونس (Thomes Stevens)' ایک جیسوٹ (Jesuit)' جو ۱۵۸۳ء میں ہندوستان آیا تھا' اور فیلپو سیسیٹی (Fillipo Sesseti)' ایک اطالوی تاجر' جو ۱۵۸۵ء میں گوا آیا تھا' انفرادی طور پر سنسکرت اور یورپ کی قدیم زبانوں کے مابین باہمی نسبتوں کو ظاہر کر چکے تھے[۱۱]۔ پانڈیچری کا ایک جیسوٹ (Jesuit) کوئرڈو (Fr. Coeurdoux) بھی' جونز کی آمد سے قریباً بیس سال قبل' سنسکرت اور یورپ کی زبانوں کے مابین باہمی نسبتوں کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ ۱۷۶۸ء میں اس نے سنسکرت اور یورپ کی قدیم زبانوں کے مابین رشتوں کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ اور افعال کی ایک طویل فہرست مرتب کی تھی[۱۲] اسی فہرست کو انکیتل دوپیرن (Anquetil Duperron) نے ۱۸۰۸ء میں شائع کیا تھا[۱۳]۔ دوپیرن خود سات سال تک' ۱۷۵۵ء سے ۱۷۶۲ء تک' ہندوستان میں رہا اور اس نے یہاں فارسی' ملیالم' کنڑی اور سنسکرت زبانیں سیکھیں۔ ہندوستان کے بارے میں اس نے اپنے مشاہدات اور اپنی تحقیقات کو دو جلدوں میں مرتب کیا[۱۴]۔ اپنی تحریروں کے ذریعے اس نے ہندوستانی تہذیب کی برتری کو یورپ پر جتانے کی ایک غیر مربوط سی کوشش کی تھی[۱۵]۔ قریب قریب ایک صدی قبل ایک ولندیزی عالم بوکسورن (Marcus Zeurius Boxhorn) نے بھی ہند یورپی زبانوں کی اصل کو مشترک قرار دیا تھا لیکن اس کی تحقیقات شائع

نہیں ہوئیں' مگر اس کے ساتھی جارج ہورن (George Horn) کے توسط سے اس کے تصورات سترہویں صدی کے نصف آخر میں یورپ میں مشہور ہو چکے تھے۔ یہ اقدام یورپ میں زبانوں کے تقابلی جائزے کے لئے محرک ثابت ہوا۔ اس کی ایک مبسوط شکل' جونز کے عہد میں' پلاس (P.S Pallas) کا یورپ اور ایشیا کی دو سو زبانوں کا جائزہ تھا' جو اس نے کیتھرائن دوم (Catherine II) کی سرپرستی میں' ۱۷۸۶ء - ۱۷۸۷ء میں مکمل کیا تھا[۶۶]۔

ہندوؤں کی تاریخ کے تعین میں بھی جونز سے قبل ابتدائی نوعیت کا کام ہو چکا تھا۔ الیگزینڈر ڈو (Alexander Dow) کی تاریخ ہندوستان' (History of Hindostan) تین جلدوں میں لندن سے ۱۷۶۸ء - ۱۷۷۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ ڈی اینویل (J. B d'Anville) کا مرتبہ قدیم ہندوستان کا سب سے پہلا جغرافیہ بھی پیرس سے ۱۷۷۵ء میں شائع ہو گیا تھا۔ ۱۷۷۹ء میں مریداس پلائی نے' جو پانڈیچری کی سپریم کونسل' میں نگران مترجم تھا' حکومت برطانیہ کے وزیر اور سیکرٹری برٹن (M. Bertin) کو "بھگوت پران" کا ایک فرانسیسی ترجمہ روانہ کیا تھا۔ رینیل (J. Reunel)' رابرٹسن (W. Robertson) اور جوزف ڈی گائنس (Joseph de Guignes) کی تحریریں اور تحقیقات بھی جونز کے زمانے میں منظر عام پر آ چکی تھیں[۶۷]۔ ایک خیال کے مطابق' جونز نے بالخصوص گائنس کی تحقیقات سے استفادہ ضرور کیا ہو گا' کیونکہ ان دونوں کے نتائج میں بڑی حد تک مماثلت نظر آتی ہے[۶۸]۔

جونز نے ۱۷۹۰ء میں شکنتلا" کا لاطینی اور انگریزی میں جو ترجمہ کیا تھا وہ یقیناً" بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ایسی ہی کچھ اور کوششیں پہلے بھی ہو چکی تھیں۔ ولندیزی مبلغ ابراہام راجر (Abraham Roger) نے پہلے پہل بھرتری ہری کے دو سو اقوال کا ولندیزی میں ترجمہ کیا۔ اس کی کتاب ۱۶۵۱ء میں اس کے انتقال کے دو سال بعد لندن سے شائع ہوئی۔ اس کی کتاب سے مغرب سنسکرت

ادب کے نمونوں سے پہلی مرتبہ روشناس ہوا۔ راجر نے ہندو مذہب کے متعلق نہایت قیمتی معلومات اس کتاب میں جمع کی تھیں۔ گو اس کے بعد یورپ میں سنسکرت ادب کی ترقی کچھ عرصے کے لئے رک گئی تھی مگر جستہ جستہ معلومات وقتاً" فوقتاً" فراہم ہوتی رہیں[۴]۔ پھر خود جونز کے عہد میں چارلس وِلکنس (Charles Wilkins) ۱۷۸۵ء میں بھگوت گیتا کا اور ۱۷۸۷ء میں ہتوپدیش' کا ترجمہ کر چکا تھا۔ لیکن یہ ترجمے یورپ کو ہندوستان کے مذہب اور تصورات سے واقف کرانے کے لئے کئے گئے تھے' ان کی ادبی خصوصیت کی وجہ سے نہیں۔ جونز نے شکنتلا" کا ترجمہ کیا تو اس دعوے کے ساتھ کہ کالیداس شیکسپیئر سے کسی طرح کم نہیں۔ دونوں بحیثیت ڈرامہ نگار اور شاعر یکساں مرتبہ رکھتے ہیں[۷]۔

ہندوستان میں ہندیات کا مطالعہ 'ایشیاٹک سوسائٹی' کے قیام سے قبل انفرادی طور پر ہوتا تھا۔ لیکن اگر تبلیغی وفود کو' جو عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ہندوستان آتے رہے' ایک جماعت یا ایک منظم منصوبے کے حامل گروہ سمجھا جائے تو یہ کوششیں گروہی یا جماعتی بنیادوں پر بھی خاطر خواہ کامیابی کے ساتھ ہوتی رہیں۔ عیسائیت کے جیسوٹ (Jesuit) فرقے نے اس سلسلے میں بڑے ذوق و شوق کا مظاہرہ کیا۔ ان کی ان کوششوں کے پس پشت ان کے اپنے فائدے زیادہ تھے۔ ہندوستان میں یہ فرقہ تبلیغ کے کاموں میں بہت منضبط اور فعال رہا۔ اس کے تحت یہاں زیادہ تر نہایت قابل اور لائق افراد بھیجے گئے۔ خصوصاً" فرانس زیویر (Francis Xavier) کی ۱۵۴۲ء میں ہندوستان آمد سے اس کا نہایت جوش اور ولولہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان مبلغین کا ایک طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اپنے نگران یا سرپرستوں کو اپنی کارکردگی کی رودادیں خطوط کی صورت میں ارسال کرتے تھے۔ یہ خطوط اور رودادیں صرف تبلیغی کاموں کے کوائف پر مبنی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہندوستانیوں کی سماجی حالت اور تہذیبی روایات کی تفصیلات پر بھی مشتمل ہوتے[۱۱]۔ اس کی ایک مثال جین فرانکوس پونس

(Jean-Francois Pons) کے جائزے کی ہے' جو اس نے ۱۷۴۰ء میں اپنے وطن بھیجا تھا[۷۲]۔ اس کو ویدوں' کے مندرجات کا علم تھا اور اس نے ہندوستانی ادب پر بھی اظہار خیال کیا تھا[۷۳]۔ مبلغین نے اپنی تبلیغی کوششوں کے ابتدائی مرحلے پر ہی مقامی زبانوں سے واقفیت کی اہمیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ تھامس اسٹیونس (Thomas Stevens)' جو ایک نامور جیسوٹ (Jesuit) عالم تھا' مرہٹی اور سنسکرت سیکھ چکا تھا۔ ڈی نوبلی (De Nobili) سنسکرت اور تامل پر عبور رکھتا تھا اور روتھ (Roth) کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اس نے سنسکرت کی ایک قواعد لکھی تھی' جو شائع نہ ہوئی[۷۴]۔

قدیم مخطوطات کی تلاش و دریافت بھی ان مبلغین کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ سترھویں صدی کے اختتام تک یورپی کتب خانوں میں ہندو مخطوطات کا ایک معتدبہ ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر ۱۶۹۸ء میں رلائن' کے سنسکرت مخطوطات' اس کے تلگو اور ملیالم میں تراجم پر مبنی مخطوطات رائل سوسائٹی' (Royal Society) میں نمائش کے لئے رکھے گئے تھے[۷۵]۔

۱۷۰۶ء میں ولندیزیوں نے جنوبی ہندوستان میں' جہاں ان کی مستقل سکونت تھی' پروٹیسٹنٹ (Protestant) فرقے کے مبلغ بھیجے۔ انہوں نے بھی یہاں کی تہذیب و تمدن میں دلچسپی لی اور اس کی چھان بین اور تحقیقات میں حصہ لیا۔ اپنی معلومات کو انہوں نے متعدد جلدوں میں طبع کرا لیا اور انہیں "British Society for Promoting Christian Knowledge" کو بھیجا' جو انہیں اعانت کرتی تھی[۷۶]۔

تاجروں نے ہندوستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور انہیں یکجا کرنے کی کوششیں کیں۔ بعض تاجروں نے سفرنامے لکھے اور بعض نے خطوط کے ذریعے یہاں کے بارے میں ضروری معلومات اپنے اپنے وطن بھیجیں۔ اس قسم کی اچھی مثالوں میں ایک فرانسیسی تاجر پیرے سونرے

(Pierre Sonnerat) کا سفرنامہ ہے۔ یہ ۱۷۸۲ء میں شائع ہوا۔ مصنف نے اس میں ہندومت کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا تھا۔
گلیشیرے (le Gentil de la Galaisiere) نے ہندوستانی علم افلاک پر بھرپور معلومات کا حامل ایک مقالہ تحریر کیا[۷۷]۔ یہ بھی ایک فرانسیسی تاجر تھا۔ اس عہد میں ہندوستان سے جس طرح تجارتی سامان اور سرمایہ مختلف ذرائع سے یورپی ممالک میں بھیجا جا رہا تھا' یہی ممالک اپنے تاجروں' سیاحوں اور مبلغین کے ذریعے' مختلف مفادات اور مصلحتوں کے تحت علمی سرمائے کو بھی اپنے پاس سمیٹ رہے تھے۔ چنانچہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ علمی اور ذہنی انقلاب بھی نتیجتاً" اس صورت حال کے زیر اثر رونما ہوا۔

جونز کے معاصر مستشرقین:

جونز کے دور میں دیگر متعدد مستشرقین کی کاوشوں نے بھی یورپ کو ہندیات سے خاصہ متعارف کرایا۔ اس کے معاصرین میں جان ہالول (John Zephaniah Holwell) الیگزینڈر ڈو (Alexander Dow)' چارلس ولکنس (Charles Wilkins)' نیتھینل ہالہیڈ (Nathaniel Brassey Halhed) اور وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) ممتاز اور نمایاں ہیں۔
جان ہالول ایسٹ انڈیا کمپنی سے طبیب کی حیثیت سے وابستہ ہو کر بنگال میں تعینات ہوا تھا۔ ترقی کرتے ہوئے وہ ایک مختصر مدت کے لئے ۱۷۶۰ء میں بنگال کا گورنر بھی نامزد ہوا[۷۸]۔ نمایاں شخصی خوبیوں کا حامل کہا جاتا ہے۔ ذہانت' قابلیت اور شائستگی اس میں یکجا سمجھی جاتی تھیں۔ سنسکرت سے واقف نہیں تھا' لیکن کچھ دوسری ایشیائی زبانیں جانتا تھا۔ مقامی زبانوں میں ہندوستانی اور بنگالی سے واقف تھا اور کسی حد تک عربی بھی جانتا تھا۔ ۱۷۶۵ء میں ہندومت کے بارے میں اس کے

مطالعے کا پہلا حصہ شائع ہوا[۷۹]۔ ۱۷۶۷ء میں دوسرا حصہ اور ۱۷۷۱ء میں تیسرا حصہ بھی منظر عام پر آیا۔ لیکن اسی موضوع پر اس کی ایک اور تصنیف بھی' جو زیادہ محنت سے لکھی گئی تھی' ۱۷۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کی تحریروں کا جرمنی میں ۱۷۶۷ء میں اور فرانسیسی میں ۱۷۶۸ء میں ترجمہ ہوا[۸۰]۔

الیگزینڈر ڈو ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال فوج' سے وابستہ تھا۔ اپنی وفات (۱۷۷۹ء) کے وقت وہ کرنل کے عہدے پر فائز تھا[۸۱]۔ ڈراما نگاری سے دلچسپی تھی اور تاریخ سے بھی خاصہ شغف تھا۔ تین جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ مرتب کی۔ فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ دو فارسی کتابوں کے ترجمے اس سے منسوب ہیں[۸۲]۔ اس کی تاریخ ہندوستان' میں ہندومت کا ایک مفصل مطالعہ شامل تھا۔ اس حصہ کا ۱۷۶۹ء میں فرانسیسی میں ترجمہ ہوا۔

فرانسیسی مفکر اور ادیب والٹیئر (Francois Marie Arouet Voltraire) ہالول اور ڈو کا معاصر تھا۔ اسے بھی ہندیات سے دلچسپی تھی۔ یہ دلچسپی ۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئی تھی' جب اس نے ہندو کتبات کے بارے میں ایک مخطوطے کا مطالعہ کیا[۸۳]۔ والٹیئر نے ۱۷۶۷ء میں ہالول کی تحریروں کا فرانسیسی ترجمہ بھی پڑھا اور اس کے مطالعے سے ڈو کی کتاب کا فرانسیسی ترجمہ بھی گزر چکا تھا۔ ان کے علاوہ ۱۷۴۳ء میں وہ ہندوستان پر برطانوی حکومت سے متعلق لیوک اسکریفن (Luke Scrafton) کے تاثرات کا مطالعہ بھی کر چکا تھا[۸۴]۔

نیتھینل ہالیڈ ۱۷۷۱ء میں کمپنی کی ملازمت اختیار کر کے ہندوستان پہنچا تھا۔ ابتدائی عمر ہی میں اس نے وسیع مطالعہ کر ڈالا تھا۔ جنتو قوانین' کا کیا ہوا اس کا ترجمہ ۱۷۷۶ء میں شائع ہوا اور بنگالی زبان کی قواعد' ۱۷۷۸ء میں منظر عام پر آئی[۸۵]۔ وہ وارن ہیسٹنگز کے ساتھ ۱۷۸۵ء میں واپس چلا گیا۔ وہ ایک لائق ماہر لسانیات تھا' جسے زبانوں کے ارتقا سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے فارسی پر عبور حاصل کیا

تھا۔ فارسی کے تراجم پر مشتمل متعدد مقالات بھی تحریر کئے۔ وہ پہلا انگریز تھا جس نے نہ صرف بنگالی زبان سیکھی بلکہ بنگالی زبان میں مراسلت بھی کی۔ اس نے بنگالی اور سنسکرت کے مشترک عناصر کی نشاندہی بھی کی۔ اس نے سنسکرت پر بھی دسترس حاصل کر لی تھی اور اس کے مخطوطات کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی جمع کر لیا تھا۔ جونز سے قبل، ۱۷۷۹ء میں اپنے ایک مسودے میں اس نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ سنسکرت میں فارسی اور عربی بلکہ لاطینی اور یونانی زبانوں کے الفاظ مشترک ہیں[۸۶]۔

چارلس ولکنس، جسے 'سنسکرت کے مطالعہ کا بانی' کہا جاتا ہے[۸۸]۔ بیس سال کی عمر میں کمپنی کا ملازم ہو کر بنگال آیا تھا۔ یہاں اسے ہالہیڈ کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ ہالہیڈ نے ۱۷۷۸ء میں اسے سنسکرت سیکھنے کی ترغیب دی[۸۸]۔ چنانچہ اس نے اتنی زیادہ دلچسپی لی کہ ۱۷۷۹ء میں اس کی ایک قواعد بھی مرتب کر ڈالی[۸۹]۔ یہ پہلا انگریز ثابت ہوا جو سنسکرت میں مہارت رکھتا تھا۔ مشرقی علوم سے بھی اس حد تک دلچسپی لینے لگا تھا کہ مقامی زبانوں پر مشتمل ادب کی اشاعت کے لئے مطبع قائم کیا[۹۰]۔ جس میں فارسی اور بنگالی حروف کے ٹائپ کو بھی رواج دیا۔ یہ خود ولکنس کی اختراعی کوششیں تھیں[۹۱]۔ اس نے ۱۷۸۷ء میں جب کہ وہ انگلستان واپس جا چکا تھا، ناگری حروف کا ٹائپ بھی تشکیل دیا۔ اس کے مشرقی علوم کے ذوق کی تعمیر میں وارن ہیسٹنگز کو بھی دخل حاصل تھا۔ ہیسٹنگز کی ترغیب پر ہی اس نے مہابھارت' کا ترجمہ شروع کیا اور اس کام کے لئے بنارس گیا۔ ۱۷۸۴ء میں جب ہیسٹنگز نے بنارس کا دورہ کیا تو ولکنس کو اس نے 'بھگوت گیتا' کا ترجمہ علیحدہ کر کے شائع کرنے کے لئے کہا۔ اس کے دوسرے سال یہ ترجمہ انگلستان سے شائع ہوا۔ ہیسٹنگز نے ولکنس کو 'منو کے قوانین' کے ترجمے پر بھی مامور کیا تھا۔ اسی نے 'منو کے قوانین' پنڈتوں کے ذریعے سنسکرت سے فارسی میں منتقل کرائے تھے۔ اس فارسی ترجمے سے انگریزی ترجمے کا کام ولکنس نے شروع کیا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اس نے باقی کام جونز کے سپرد کر دیا، جسے جونز نے ۱۷۹۴ء میں مکمل کیا اور

اسی سال یہ شائع ہوا[۹۲]۔ ۱۷۸۷ء میں و لکنس نے "ہتو پدیش" کا ترجمہ بھی شائع کرایا، جو پنچ تنتر' کا ایک حصہ ہے۔ پنچ تنتر' یورپ میں فارسی کے توسط سے پہلے ہی سے مشہور تھا[۹۳]۔ ۱۷۸۷ء ہی میں گیتا' کا ایک فرانسیسی ترجمہ بھی ہوا۔ معروف جرمن مستشرق ہرڈر (Johann Gotteried Hereder) نے و لکنس کے ترجموں کی مدد سے ہتو پدیش' اور گیتا' کا اور راجر (Abraham Roger) کے بھرتری ہری کے مذکورہ ترجمے کا جرمن میں ترجمہ کیا[۹۴]۔

سنسکرت کے ماہرین میں و لکنس کے ساتھ ساتھ کولبروک (H. T. Colebrooke) کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی علمیت اور اپنے مقالات کے لحاظ سے جونز کے بعد شمار کیا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے جونز کے انتقال کے بعد اس کی جگہ اسی کو منتخب کیا گیا[۹۵]۔ ہیسٹنگز کے دور میں بالعموم ان کوششوں کی سرپرستی ہوئی۔ اس کے سیکرٹری ڈیلیم ڈیوی (William Davy) نے، جو فارسی پر عبور رکھتا تھا، مشرقی مخطوطات پر مشتمل ایک نجی کتب خانہ ترتیب دیا تھا [۹۶]۔ فرانسس گلیڈون (Francis Gladwin) نے آئین اکبری' کا ترجمہ کیا جو ۱۷۸۳ - ۱۷۸۶ء میں شائع ہوا۔ گلیڈون بھی ہیسٹنگز کی سرپرستی میں رہا[۹۷]۔ آئین اکبری کے علاوہ اس نے ۱۷۸۸ء میں سعدی کے پند نامہ' کا ترجمہ کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے عبدالکریم کاشمیری کے بیان واقع' کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ مزید کئی کتابیں ترجمے میں اس سے منسوب ہیں[۹۸]۔ جو ناتھن اسکاٹ (Jonathan Scott) نے تاریخ ارادت خان' کا فارسی سے ترجمہ کیا، جو ۱۷۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے تاریخ فرشتہ' کے اس حصے کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو دکن کے بارے میں تھا[۹۹]۔ رابرٹ اورم (Robert Orme) نے "Historical Fragments of the Mogul Empire" تحریر کی جو لندن سے ۱۷۸۲ء میں شائع ہوئی۔ فرینکلن (Franklin) نے ۱۷۹۸ء میں شاہ عالم ثانی کے عہد کی تاریخ لکھی، جو لندن سے شائع ہوئی۔ اورنگ زیب کے ابتدائی دس

سالوں کی تاریخ ونسی ٹارٹ (H. Vansittart) نے لکھی' یہ کلکتہ سے ۱۷۸۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ سب کتابیں اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں شائع ہوئیں۔ اس عرصے میں ہندوستانی تاریخ نویسی میں اصل ماخذ اور متن کے ترجموں اور ان کی تدوین پر خاص توجہ دی گئی"[۱۰۰]۔

اثرات:

جونز اور اس کے معاصرین کی تحقیقات کے نتیجے میں یورپ کی علمی دنیا نے ہندوستان کی طرف خاص توجہ دی۔ ۱۷۶۰ء کے بعد سے ہندوستان کے بارے میں عام طور پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ لیکن پھر بھی ان کتابوں کے عام قاری ان کتابوں میں ہندوستان سے تقابل کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی حد تک احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں"[۱۰۱]۔ ہندومت پر مستشرقین کے خیالات کو ردعمل کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ ردعمل کلیسا کی جانب سے تھا"[۱۰۲]۔ یہ رویہ صرف انگلستان یا یورپ ہی میں رونما نہیں ہوا۔ ۱۷۸۰ء میں ہندوستان کے پادریوں نے اپنے اپنے ملک کے کلیساؤں کو ہندومت کے خلاف تردیدی بیانات بھیجنے شروع کئے تھے"[۱۰۳]۔ چارلس گرانٹ (Charles Grant) ہندوستان میں اس رویے کی نمائندہ مثال ہے"[۱۰۴]۔

اس سے قطع نظر سوسائٹی کے قیام اور جونز اور اس کے معاصر مستشرقین کی تحقیقات کے خاصے مثبت نتائج بھی سامنے آئے۔ یورپ کے متعدد علماء نے سوسائٹی میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی"[۱۰۵]۔ ڈاکٹر رابرٹ واٹسن (Robert Watson) پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ کیمبرج یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا ایک ادارہ قائم ہونا چاہئے"[۱۰۶]۔ یہ سوسائٹی کی کارکردگی کا ایک فوری اثر تھا۔ بعد میں برطانیہ کی "رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن" اسی کے زیر

اثر ۱۸۲۳ء میں قائم ہوئی۔ خود ہندوستان میں ایشیاٹک سوسائٹی کی طرح بمبئی اور مدراس میں بھی اسی قسم کی انجمنیں قائم ہوئیں "۷۔ یورپ کے جن علماء کو ہندیات سے دلچسپی تھی اور وہ یورپ ہی میں مقیم تھے' سوسائٹی کے ارکان سے ہندیات کے متعلق استفسار کرنے لگے "۸۔ سوسائٹی کے تحت تقابلی لسانیات کے جائزوں سے اس علم میں سائنٹیفک دور کا آغاز ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر سے یہ علم قدیم اور وسطی لسانیات کے دور سے جدید دور میں داخل ہوتا ہے۔ اس ارتقاء کے پس پشت دو عوامل تھے۔ مغربی اقوام نے اپنے علوم کے دائرے کو وسیع کیا اور اب وہ زبانوں سے واقف تھے اور دوسرے انہوں نے خود تجربات سے زبان کے مطالعے کے زیادہ سائنٹیفک طریقے وضع کئے۔ افکار اور خیالات میں بھی یورپ خصوصاً فرانس اور جرمنی ہندوستان سے بہت متاثر ہوئے۔ گوئٹے اس کی ایک بہت نمایاں مثال ہے۔ مشرق سے اس کی دلچسپی بہت پرانی تھی۔ ہندو تہذیب کا مطالعہ اس نے ابتدائی عمر ہی میں شروع کیا تھا "۹۔ لیکن وہ اس سے بہت جلد متنفر بھی ہو گیا' اس کے باوجود اس نے کالیداس کے ڈرامے "شکنتلا" کی تعریف کی اور وہ اس ڈرامے کے ذریعے کالیداس کے افکار سے متاثر ہوا۔ فاؤسٹ (Faust) اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے دوسرے حصے کا آخری کورس (Chorus) ہندوستانی فکر کا مظہر ہے۔ گوئٹے کے علاوہ شکنتلا کے ترجمے سے متاثر ہونے والوں کی فہرست میں معروف شخصیات کے مزید نام شامل ہیں "۱۰۔ ایک عام علمی دنیا پر اس کا یہ نمایاں اثر ہوا کہ اس کے قیام سے علمی تحقیق میں تخصیص (Specialization) کے دور کی ابتداء ہوئی۔

ہندوستان میں بھی اس کے اثرات بڑے دور رس اور ہمہ گیر ثابت ہوئے۔ ہندومت کے مطالعے کا ذوق عام ہونے کے نتیجے میں عیسائیت کے تبلیغی اداروں میں جو رد عمل شروع ہوا اس کا ایک فطری تقاضا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ زیادہ زور و شور سے کی جائے۔ چارلس گرانٹ

(Charles Grant) کو' جو اس وقت کمپنی کی کل تجارت کا نگران اور تبلیغی خیالات کا حامل تھا' عیسائیت کے نفاذ سے ہندوستانی معاشرے کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی[۴۱]۔ بیس سال ہندوستان میں رہ کر وہ ۱۷۹۰ء میں واپس چلا گیا۔ اب وہ اس حیثیت اور اثر و نفوذ کا حامل تھا کہ اس کے زیر اثر ۱۷۹۳ء میں کمپنی کا ترمیم شدہ مسودۂ قانون منظور ہو[۴۲] جو اس کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔ اس قانون کے تحت بکثرت تبلیغی وفود ہندوستان بھیجے گئے[۴۳]۔ ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج بنارس' کا قیام اس حکمت عملی کا ایک توسیعی منصوبہ تھا' تاکہ عیسائی مبلغ اس میں داخل ہو کر ہندوستان کی زبانوں' تہذیب اور مذہب سے واقفیت حاصل کریں اور ان کا باضابطہ درس لیں۔ عیسائی تبلیغی اداروں نے' جو حکومت پر اپنا واضح اثر بھی رکھتے تھے' حکومت کو مجبور کیا کہ اس کے قائم کردہ اسکولوں و کالجوں میں انگریزی زبان اور مغربی علوم بھی نصاب کے طور پر رکھے جائیں' تاکہ مقامی افراد ان کی بات آسانی سے سمجھ سکیں[۴۴]۔ وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کی جانب سے ۱۷۸۰ء میں کلکتہ مدرسہ کا قیام اس کی دور اندیشی کا ثبوت تھا' لیکن فورٹ ولیم کالج (Fort William College) کا قیام حکومت پر تبلیغی اداروں کے اثرات کو بہتر صورت میں ظاہر کرتا ہے[۴۵]۔ مقامی زبانوں بالخصوص اردو' ہندی' فارسی' بنگلی کے مطالعے اور تدریس کے لئے اس کالج کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے بعض ارکان اس میں درس و تدریس کے لئے بھیجے گئے۔ اس کے اساتذہ میں جان گلکرسٹ (John Brothwick Gilchrist) نے زیادہ امتیاز اور شہرت حاصل کی۔ اس کالج سے وابستگی سے قبل تک وہ ہندوستانی زبانوں سے متعلق متعدد اہم کام کر چکا تھا[۴۶]۔ اس ضمن میں ایسے افراد کی فہرست نہایت طویل ہے جنہوں نے زیادہ تر ہندوستان ہی میں رہ کر' گلکرسٹ کی طرح ہندوستانی زبانوں کی قواعد لکھیں' لغات ترتیب دیں' زبانوں کے ارتقاء کا جائزہ لیا یا مغربی زبانوں سے مقامی زبانوں میں

تراجم کیے"۔

ہندوستانی معاشرے کے مختلف طبقات میں برطانوی حکمت عملی کی فتح مختلف اور بعض اوقات متضاد قسم کے رجحانات کی پرورش کا باعث ہوئی۔ انگریزوں نے ہندیات کے مطالعے کے فروغ کے لئے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے ہندوستانیوں کے قوانین' زبانوں' تہذیبوں اور مذاہب سے واقفیت کو نہایت درجہ اہمیت دی تھی۔ لیکن اس کا ایک اور نتیجہ ہندوستانیوں کے لئے بھی بڑا دور رس اور انقلاب انگیز ثابت ہوا۔ انگریزوں نے اپنے فوائد کے لئے اور بظاہر ہندوستانیوں کے علوم کی ترقی کی خاطر' جو ادارے قائم کیے' وہ ہندوستان میں قومی اور سیاسی شعور کی بیداری کا سبب بھی بنے۔ ہندوؤں نے مجموعی طور پر انگریزی حکومت اور مغربی تعلیم کا خیر مقدم کیا تھا' لیکن اس وقت کی صورت حال میں مسلمان انگریزوں سے مذہبی اور سیاسی اعتبار سے کبھی مفاہمت پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کا انگریزی اور مغربی علوم سے دور رہنا یقینی امر تھا۔ وہ اپنی تہذیب سے دور نہ ہو سکے اور ان کے مقابلے میں ہندو مغربی تعلیم سے بہرہ مند ہوئے اور ان میں اپنے مذہب کے احیاء اور اس کی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا' جو دراصل ان کے قومی شعور کی بیداری کا مظہر ہے۔ یہ صورت حال ہندوؤں اور مسلمان دونوں کے لئے نتائج کے اعتبار سے اپنے اپنے قومی تشخص کی بازیافت اور علیحدہ قومی احساس کا سبب بنی۔

(مطبوعہ۔ "جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی
آف پاکستان" ۳' ۱۹۷۹ء)

حواشی

۱۔ Indology

۲۔ فلپس، سی۔ ایچ۔ "The East India Company" میں انہیں متعدد مقالات پر دیکھا جا سکتا ہے، خصوصاً" ص، ۵، ۸، ۲۳، ۲۴، ۲۸ وغیرہ۔

۳۔ بروک، آدم۔ "The law of Civilization and decay" ص، ۲۵۹۔۲۶۰ و نیز تفصیلات کے لئے، نہرو "Discovery of India" ص ۲۴۳ ۔ ۲۴۴۔

۴۔ مارشل، "The British Discovery of Hinduism" مقدمہ، صفحہ ا۔

۵۔ مکرجی، ایس۔ این۔ "Sir William Jones" ص ۹۔

۶۔ ان تحریروں کا ایک سرسری جائزہ رے می، آرتھر ایف جے "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" ص ا۔۵ میں ہے۔ خصوصاً" سفرناموں کے لئے، ص ۵۔۸، ۱۸۔۲۰، زبان و ادب کے لئے۔ ص" ۲۱۔۲۲ ہندو مذہب کے لئے، ص ۲۳۔۲۶۔

۷۔ مثال کے طور پر اسٹوکس "The English Utilitarians and India" ص، XIII-XII، و نیز بلہا چٹ "Social Policy and Social Change in India" مفصل ہے۔

۸۔ انگلستان میں اس کی سیاسی زندگی کے احوال کے لئے کینن "Oriental Jones" بالخصوص ص ۶۰۔۸۷ وغیرہ، مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۴۹۔۷۲۔

۹۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۲۔۳۔

۱۰۔ تفصیلات کے لئے، کینن، تصنیف مذکور، ص، ا۔۱۳، مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۱۷۔۲۰، آربری "Oriental Essays" ص، ۴۸۔۵۱۔

۱۱۔ کینن نے ۲۹ زبانوں کی فہرست درج کی ہے، تصنیف مذکور، ص ۱۵۴۔

۱۲۔ حافظ کی غزلوں کا ترجمہ پہلے پہل قواعد، میں شامل تھا، لیکن بعد میں علیحدہ کر کے اصل غزلوں کے ساتھ شائع کیا گیا۔ ایضاً" ص ۳۰۔

۱۳۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۳۵۔

۱۴۔ ایضاً" ص ۳۴، ۷۴۔

۱۵۔ ایضاً" ص ۴۷، و نیز کینن، ص ۱۱۳۔

۱۶۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۷۸۔

۱۷۔ میکالے، "Critical and Historical Essays"، ص ۸۲۔

۱۸۔ ایضاً" ص ۸۳۔

۱۹۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۸۹۔

۲۰۔ جونز نے، جب وہ لندن ہی میں تھا، یہ کتاب اسے ۳۰ مارچ ۱۷۷۴ء کو بھیجی تھی۔
آربری، تصنیف مذکور بالا، ص ۵۱۔

۲۱۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۷۹۔

۲۲۔ آربری، تصنیف مذکور بالا، ص ۶۳۔

۲۳۔ لائرڈ "Missionaries and Education in Bengal" ص ۴۰۔

۲۴۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۷۹۔۸۰، جونز کے ترجمے کے لئے، کینن، تصنیف مذکور، ص ۱۸۷۔

۲۵۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۸۱۔

۲۶۔ ایضاً" ص ۸۲۔

۲۷۔ ایضاً" ص ۸۳۔۸۴، کینن، تصنیف مذکور، ص ۱۱۸، کینن کا ایک حالیہ مقالہ "The Indian Affairs of W. Jones" ص ۲۸۰۔۲۹۴، جونز اور ہندوستان کے تعلق سے مفصل ہے۔

۲۸۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۸۴۔۸۵۔

۲۹۔ بالآخر ۱۸۰۵ء میں سوسائٹی کی عمارت کے لئے حکومت نے ایک مناسب جگہ سوسائٹی کو بلا قیمت دے دی۔ سوسائٹی کے اراکین نے اپنے ذاتی چندے سے اس کی عمارت تعمیر کرائی۔ آج بھی کلکتہ میں موجودہ پارک اسٹریٹ پر سوسائٹی کا دفتر اور اس کا قیمتی اور نادر کتب خانہ موجود ہے۔

۳۰۔ ایضاً" ص ۸۵۔

۳۱۔ ایضاً"

۳۲۔ ایضاً"

۳۳۔ ایضاً"، ۸۷۔

۳۴۔ یہ جونز کو سنسکرت پڑھایا کرتا تھا۔

۳۵۔ پنڈت تھا اور ہیسٹنگز اور جان شور کے ساتھ کام کرتا تھا۔

۳۶۔ یہ اس وقت بنارس میں تھا' وہیں اس کی ملاقات جونز سے ہوئی' مکر جی' تصنیف مذکور' ص ۸۹۔ بنارس سے واپسی کے بعد جونز اور اس کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ ایک شاعر' عالم اور منتظم اور کمپنی کا ملازم تھا۔ ۱۷۸۲ء میں بنارس میں بطور منصف تعینات کیا گیا تھا۔ ہندوستانی شاعروں کا ایک تذکرہ "تذکرۂ گلزار ابراہیم" اس سے یادگار ہے۔ مصنف نے اس میں خود اپنے بھی حالات تحریر کئے ہیں۔ مطبوعہ علی گڑھ' ۱۹۳۴ء' (دیگر تصانیف اور حالات زندگی کے لئے "مخطوطات انجمن ترقی اردو" جلد اول' ص ۱۲۰۔۱۲۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" ص ۱۹۲۔۱۹۴ سے ماخذ کا علم ہوتا ہے۔ "Asiatick Researches" میں اس کا مقالہ بعنوان "Trial by Ordesl" شامل تھا۔

۳۷۔جلد ہی یہ فروخت ہو گیا' چنانچہ اس کا ایک دوسرا ایڈیشن لندن سے شائع کیا گیا۔ پھر اس کا یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ (مکر جی' تصنیف مذکور' ص ۸۸۔۸۹)

۳۸۔کوف' ڈیوڈ "British Orientalism and the Bengal Renaissance" ص ۳۱۔

۳۹۔ ایضاً" ۱۸۳۹ء تک اس کی کل بیس جلدیں شائع ہوئیں۔ عتیق صدیقی' "ہندوستانی اخبار نویسی' کمپنی کے عہد میں" ص ۸۱' "ایشیاٹک سوسائٹی بنگال" کے کتب خانے اور نیشنل لائبریری' کلکتہ میں اس کی تمام جلدیں محفوظ ہیں۔ اسی دوران ۱۸۳۲ء میں اس سوسائٹی کے تحت ایک اور مجلہ "The Journal of Asiatick Society Culcutta" کا اجراء ہوا۔ اس عرصے میں "Asiatick Researches" بھی نکلتا رہا۔ لیکن بالآخر ۱۸۳۹ء میں یہ جرنل میں ضم ہو گیا۔ اسی طرح کلکتہ سے نکلنے والا ایک اور مجلہ "Indian Review and Journal of Foreign Studies" بھی اس جرنل میں ضم کر دیا گیا۔ اس کا اجراء ۱۸۳۴ء میں ہوا تھا' لیکن ۱۸۴۷ء تک اس کی صرف ۸ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ ایضاً"

۴۰۔ آربری' تصنیف مذکورہ بالا' ص ۶۶۔

۴۱۔ ایضاً" ص ۶۵' مارشل تصنیف مذکور' ص ۴۔

۴۲۔ جونز' ولیم "On the Hindus" ص ۲۵۲۔۲۵۳۔

۴۳۔ تفصیلات کے لئے، مارشل، تصنیف مذکور، ص ۱۵، کینن، تصنیف مذکور، ص ۱۴۰۔۱۴۱۔

۴۴۔ مکر جی، تصنیف مذکور، ص ۹۴۔

۴۵۔ ایضاً"۔

۴۶۔ ایضاً"۔

۴۷۔ ایضاً"، ص ۹۵۔

۴۸۔ "On the Hindus" مشمولہ "Asiatick Researches" جلد اول، ص ۴۱۴۔۴۳۲۔

۴۹۔ کینن، تصنیف مذکور، ص ۱۳۹۔

۵۰۔ "Asiatick Orthography" مشمولہ "Asiatick Researches" جلد اول، ص ۱۔۵۶۔

۵۱۔ مکر جی، تصنیف مذکور، ص ۱۱۸۔۱۱۹۔

۵۲۔ ایضاً"، ص ۱۰۲۔

۵۳۔ ایضاً"۔

۵۴۔ ایضاً"

۵۵۔ کینن، تصنیف مذکور، ص ۱۴۳۔

۵۶۔ ایضاً"، ص ۱۶۰

۵۷۔ مکر جی، تصنیف مذکور، ص ۱۱۵، آربری، تصنیف مذکور بالا، ص ۷۹۔

۵۸۔ کینن، تصنیف مذکور، ص ۱۵۰۔

۵۹۔ ہندوستان سے متعلق اس کی تحریروں کی ایک مفصل فہرست، مکر جی، تصنیف مذکور، ص ۱۸۲۔۱۸۳ میں ہے۔ انتخاب کے لئے، مارشل تصنیف مذکور، ص ۱۹۶۔۲۸۹۔

۶۰۔ مکر جی، تصنیف مذکور، ص ۱۱۷، تفصیلات کینن نے بیان کی ہیں، تصنیف مذکور، ص ۱۷۰۔۱۷۱۔

۶۱۔ مکر جی، تصنیف مذکور، ص ۹۵۔

۶۲۔ ایضاً"، ص ۹۶۔

۶۳۔ بریل، ایم،

"Grammaire Comparee des Langues Indo-Europeennes" مقدمہ ص

XVII-XVIII۔

۶۴۔ ہندوستان کے تعلق سے اس کے مقالے تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔ جس میں سے دوسری جلد "ہندوستان میں تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات"
(Recherches Historiques et Geographiques Sur LInde) مطبوعہ پیرس' ۱۷۸۷ء اور تیسری جلد "ہندو یورپی روابط
(LInde en rapport avee LEurope) مطبوعہ' پیرس ۱۷۹۸ء - اہمیت کی حامل ہیں۔ پہلی جلد سفرنامے اور مشاہدات کا مجموعہ ہے۔

۶۵۔ ڈوگن' ایم۔ ایل۔ ایس' "Uuquetil-Duperron et ses Successerrs" ص ۱۶۔

۶۶۔ مکرجی' تصنیف مذکور' ص ۹۳۔

۶۷۔ ان کے تنقیدی جائزے کے لئے' مکرجی' تصنیف مذکور' ص ۹۵-۹۶' مکرجی نے چند مباحث پر خاص توجہ دی ہے۔

۶۸۔ تفصیلات کے لئے' ایضاً' ص ۱۰۵-۱۰۷

۶۹۔ اس کی کچھ مثالیں رے ی' تصنیف مذکور' نے درج کی ہیں' ص ۲۴' ادب و شعر کے اثرات کے لئے' ص ۲۵-۳۰۔

۷۰۔ کینن' تصنیف مذکور' ص ۱۴۹۔

۷۱۔ مارشل تصنیف مذکور' ص ۱۸۔

۷۲۔ ایضاً

۷۳۔ ایضاً۔

۷۴۔ مکرجی' تصنیف مذکور' ص ۱۰۔

۷۵۔ مارشل' تصنیف مذکور' ص ۱۸۔

۷۶۔ ایضاً' ص ۴۔

۷۷۔ ایضاً' مصنف نے یہاں کچھ مزید حوالے بھی دیئے ہیں' ونیز کچھ مزید تفصیلات رے ی' تصنیف مذکور' ص ۶-۱۰' ۱۲' ۱۴-۱۶' ۱۹ میں ہیں۔

۷۸۔ بکلینڈ' سی۔ ای' "Dictionary of Indian Biography" ص ۲۵-۲۶۔

۷۹۔ مارشل' تصنیف مذکور' ص ۶۔

۸۰۔ ایضاً' ص ۷-۸۔

۸۱۔ بکلینڈ، تصنیف مذکور، ص ۱۳۲۔
۸۲۔ مارشل، تصنیف مذکور، ص ۷۔
۸۳۔ ایضاً" ص ۸۔
۸۴۔ ایضاً"۔
۸۵۔ بکلینڈ، تصنیف مذکور، ص ۱۸۵۔
۸۶۔ مارشل، تصنیف مذکور، ص ۱۰۔
۸۷۔ آربری، "British Contribution to Persion Literature" ص ۱۳، اسے سنسکرت میں اعلیٰ قابلیت کی بنیاد پر آکسفورڈ یونیورسٹی سے ۱۸۰۵ء میں .D.C.L اور ۱۸۳۳ء میں سر، کا خطاب دیا گیا۔ کوف، تصنیف مذکور، ص ۲۸۔
۸۸۔ مارشل تصنیف مذکور، ص ۱۰۔
۸۹۔ بکلینڈ، تصنیف مذکور، ص ۴۵۱۔
۹۰۔ ایضاً"۔
۹۱۔ عبداللہ یوسف علی، "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" ص ۴۷۔
۹۲۔ آربری، "Oriental Essays" ص ۴۳، کینن نے اسے پھر بھی نامکمل ہی قرار دیا ہے، تصنیف مذکور، ص ۱۸۷۔
۹۳۔ مارشل، تصنیف مذکور، ص ۱۲۔
۹۴۔ رے می، تصنیف مذکور، ص ۳۵۔۳۶۔
۹۵۔ کوف، تصنیف مذکور، ص ۲۸۔
۹۶۔ چارلس اسٹیورٹ، "Malfuzat Timury" ص IX
۹۷۔ آربری "British Orientalists" ص ۱۸۔
۹۸۔ ایضاً" "British Contributions to Persian Literature" ص ۱۹۔
۹۹۔ ایضاً"۔
۱۰۰۔ ایضاً"۔
۱۰۱۔ مارشل، تصنیف مذکور، ص ۲، ایسا ہی تجزیہ ریکورٹ، اے۔ ڈی، "The Soul of India" ص ۲۶۵ میں ہے۔
۱۰۲۔ مارشل، تصنیف مذکور، ص ۴۱۔
۱۰۳۔ ایضاً" ص ۴۲۔

۱۰۴۔ تفصیلات کے لئے، ایضاً" ص ۴۲۔۴۳۔

۱۰۵۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۸۶۔

۱۰۶۔ ایضاً"۔

۱۰۷۔ عبداللہ یوسف علی، تصنیف مذکور، ص ۸۰، تفصیلات کے لئے آربری،
"Asiatick Jones"۔

۱۰۸۔ مکرجی، تصنیف مذکور، ص ۸۷۔

۱۰۹۔ وکٹر، کارل "Goethe, The Poet" ص ۲۲۰، تفصیلات کے لئے، رے ی، تصنیف مذکور، ص ۴۱۔۴۵۔

۱۱۰۔ فریڈرک شلیگل (Freidrich Schlegel)، وکٹر ہیوگو (Victor Hugo)، لامر ٹائن (A.M.L. Lamertine)، ڈی ماسٹر (de Maistre)، لامیناس (Lamennais)، کائنٹ (Quinet)، میچلیٹ (Michelet)، ہرڈر (Herder) وغیرہ۔ مارشل، تصنیف مذکور، ص ۱۷، فکری اثرات کا ایک مفصل جائزہ۔ رینکورٹ، تصنیف مذکور، ص ۲۵۸۔۲۴۹ و بعدہ میں ہے۔ لیکن یہ بہت بعد کے اثرات پر مبنی ہے۔ نیز تفصیلات کے لئے رے ی، تصنیف مذکور، ص ۱۷۱ ۔ ۱۷۵۔

۱۱۱۔ لائرڈ، تصنیف مذکور، ص ۴۰، اس نے اپنے عزائم اپنے دو مفصل مضامین میں تحریر کئے، ایضاً"۔

۱۱۲۔ امبری، اے ٹی "Charles Grant and British Rule in India" ص ۱۳۰، ۱۵۲۔

۱۱۳۔ فلپس، تصنیف مذکور، ص ۱۵۹، ۱۵۱، لائرڈ" مقدمہ "Bishop Heber in Northern India" ص ۳، ۵۔۶، قریبی عہد کے جائزے کے لئے، ایضاً" "Missionaries and Education in Bengal" ص ۳۷۔۴۳۔

۱۱۴۔ ایضاً"، ص ۴۰۔

۱۱۵۔ ایضاً"، ص ۵۷، ۱۷، اس کے قیام میں اولین مشنری ولیم کیری (William Carey) کی مصلحتوں اور کوششوں کے لئے، ایضاً"، ص ۵۷۔۵۸ و بعدہ، اور اس میں مشنریوں کو تدریس کے لئے بھیجے جانے کا تذکرہ، یہی مصنف، مقدمہ "Bishop Heber in Northern India" ص ۴۔۵ میں ہے۔

۱۱۶۔ عتیق صدیقی "گلکرسٹ اور اس کا عہد" اس موضوع پر مفصل ہے۔

۱۷۔ اس قسم کا جائزہ متعدد فاضل مصنفین کی تصانیف کا موضوع بنا ہے، چنانچہ ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے، جیسے، ایضاً" مولوی عبدالحق، مقدمہ "قواعد اردو" ابواللیث صدیقی، مقدمہ "جامع القواعد" آغا افتخار حسین "یورپ میں اردو" اور "یورپ میں تحقیقی مطالعے"

فہرست اسناد محولہ

آربری، اے۔ جے (Arberry, A.J.)،

"Asiatic Jones: The Life and Influences of Sir William Jones" (لندن، ۱۹۴۶ء)

...... "British Contributions to Persian Literature" (لندن، ۱۹۴۲ء)

...... "British Orientalists" (لندن، ۱۹۴۳ء)

...... "Oriental Essays" (لندن، ۱۹۶۰ء)

اسٹوکس، ای۔ (Stokes, E.)، "The English Utilitarians and India" (آکسفورڈ، ۱۹۶۳ء)

اسٹیورٹ، چارلس (Stewart Charles)

"The Mulfuzat Timury: Autobiographical Memories of The Moghul Emperor Timur" (ہالبورن، ۱۸۳۰ء)

افتخار حسین، آغا، "یورپ میں اردو" (لاہور، ۱۹۶۸ء)

.... "یورپ میں تحقیقی مطالعے" (لاہور، ۱۹۶۷ء)

افسر صدیقی امروہی اور سید سرفراز علی رضوی، "مخطوطات انجمن ترقی اردو" جلد اول، (کراچی، ۱۹۶۵ء)

امبری، اے۔ ٹی (Embree, A.T.)

"Charles Grant and British Rule in India" (لندن، ۱۹۶۲ء)

بروک، آدم (Brook, Adams) "The Law of Civilization and Decay" (لندن، ۱۹۲۸ء)

بریل، ایم (Breal. M.)

"Grammaire Comparee des Langues Indo-Europeennes" جلد اول، (پیرس، ۱۸۶۶ء)

بکلینڈ، سی۔ ای (Buckland, C.E.) "Dictionary of Indian Biography" (لندن، ۱۹۰۶ء)

بلہاچٹ، کے (Ballhatchet,k.)
"Social Policy and Social Change in Western India, 1817-1830" (لندن، ۱۹۵۷ء)

جونز، ولیم (Jones, William) "Asiatick Orthography" مشمولہ "Asiatick Researches" جلد اول، (کلکتہ، ۱۷۸۹ء)

.... "On the Hindus" مشمولہ "Asiatick Researches" جلد اول، (کلکتہ، ۱۷۸۹ء)

دوپیرن، انکیٹل (Duperron, Anquetil)
"Recherches Historiques et Geographiques Sur L Inde" جلد دوم (پیرس، ۱۷۸۷ء)

.... "LInde en rapport avee LEurope" جلد سوم، (پیرس، ۱۷۹۸ء)

ڈوگن، ایم۔ایل۔ایس
"Anquetil Duperron et ses Successeurs" (Dugin , M.L.S.) مشمولہ "Indo-Iranean" (کلکتہ، دسمبر، ۱۹۶۸ء)

رینکورٹ، اے۔ ڈی (Reincourt, A.D.) "The Soul of India" (لندن، ۱۹۶۱ء)

رے می، آرتھر ایف۔ جے (Ramy, Arthur F.J.) "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" اردو ترجمہ "The Influence of India and Persia, on the Poetry of Germany" مترجم ریاض الحسن، (کراچی، ۱۹۷۳ء)

صدیقی، ابواللیث "جامع القواعد" (لاہور، ۱۹۷۱ء)

صدیقی، محمد عتیق "گل کرسٹ اور اس کا عہد" (علی گڑھ، ۱۹۶۰ء)

.... "ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں" (دہلی، ۱۹۵۷ء)

عبدالحق، مولوی "قواعد اردو" (اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء)

عبداللہ یوسف علی "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" (کراچی، ۱۹۶۷ء)

علی ابراہیم خاں، خلیل "تذکرہ گلزار ابراہیم" مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، (علی گڑھ، ۱۹۳۴ء)

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن" (لاہور، ۱۹۷۲ء)

فلپس، سی۔ ایچ (Philips, C.H.) "The East India Company" (مانچسٹر، ۱۹۶۱ء)

کوف، ڈیوڈ

"British Orientalism and The Bengal Renaissance" (Copf Devid) (کیلیفورنیا، ۱۹۶۹ء)

کینن، گارلینڈ (Cannon, Garland) "Oriental Jones" (لندن، ۱۹۶۴ء)

.... "The Indian Affairs of Sir William Jones" مشمولہ "Asian Affairs" (لندن، اکتوبر ۱۹۷۸ء)

لائرڈ، ایم۔ اے (Laird, M.A.) "Bishop Heber in Northern India" مقدمہ (کیمبرج، ۱۹۷۱ء)

.... "Missionaries and Education in Bengal' (آکسفورڈ، ۱۹۷۲ء)

مارشل، پی۔ جے (Marshall, P.J.)

"The British Discovery of Hinduism" مرتبہ، (کیمبرج، ۱۹۷۰ء)

مکرجی، ایس این (Mukerjee, S.N.)

(Sir William Jones)

'A Study in Eighteenth Century British Attitudes to India"

(کیمبرج، ۱۹۶۸ء)

میکالے، ٹی بی (Macaulay, T.B.) "Critical and Historical Essays" (لندن، ۱۸۹۲ء)

نہرو، جواہر لال "The Discovery of India" (کلکتہ، ۱۹۴۶ء)

وکٹر کارل (Victor, Karl) "Goethe, The Poet" (کیمبرج، ۱۹۴۹ء)

قائم خاں قائم

اردو مثنوی ۔ ۔ ۔ اور تحریک مجاہدین

کا ایک غیر معروف شاعر

کپتان قائم خاں قائم کے حالات اور اس کے ذکر سے متعلقہ ماخذ بالعموم خالی ہیں' جب کہ یہ ایک پر گو شاعر تھا اور اس نے بالخصوص غزل اور مثنوی کے ساتھ ساتھ متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ریاست ٹونک سے اس کا تعلق تھا' لیکن ٹونک کی ادبی یا علمی و تہذیبی تاریخ سے متعلق جو ماخذ دستیاب ہیں اور وہاں کے شاعروں کے جو تذکرے منظر عام پر آئے ہیں' ان میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ راقم کے ذخیرۂ کتب میں اس کا ایک ضخیم دیوان "دیوان قائم" اور ایک ضخیم مثنوی "گوہر نگار" محفوظ ہیں۔ دیوان ۳۹۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع جعفری اکبر آباد سے حافظ جعفر بخش کے اہتمام سے ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوا ہے۔ مثنوی بھی یہیں سے شائع ہوئی ہے' لیکن راقم کے نسخہ میں اس کا آخری ورق نہ ہونے کے باعث اس کے سنہ اشاعت کا علم نہیں ہوتا۔ یہ صفحہ ۲۲۶ پر خاتمہ مثنوی کے عنوان کے تحت ۷ اشعار کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ امکان ہے کہ اس کا آخری ورق ہی ضائع

ہوا ہے۔ اس کی داخلی شہادت سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ قائم نے اسے دیوان کی تکمیل کے بعد لکھنا شروع کیا۔
کیا جب کہ دیوان میں نے ختم ....

مثنوی - ۱۲
دیوان اور مثنوی دونوں کی کتابت و طباعت اور کاغذ کے معیار کی یکسانیت سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں تقریباً" ساتھ ہی ساتھ شائع ہوئی ہیں۔
دیوان اور مثنوی میں ایسی داخلی شہادتیں بھی موجود نہیں' جن سے شاعر کے حالات کے بارے میں علم ہو سکے۔ یہ نواب وزیر محمد خاں وزیر الدولہ کے عہد (۱۸۳۴ء - ۱۸۶۴ء) سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے دیوان اور مثنوی دونوں میں ان کی شان میں مدحیہ قصیدے تحریر کئے ہیں۔ اگرچہ اس کے نام کے ساتھ "کپتان" کا لاحقہ بھی یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ ریاست کی فوج میں اس عہدے پر فائز رہا ہے یا اپنے اجداد سے کہ وہ ریاست میں کبھی اس عہدے پر فائز رہے ہوں گے' وراثتاً" جیسا کہ وہاں یہ روایت قائم ہو گئی تھی' اس نے بھی اسے اپنے نام کا حصہ بنا لیا ہو گا مگر اس نے وزیرالدولہ کی نسبت اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے خود کو بحیثیت کپتان ان کا نوکر بتایا ہے' جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ ریاست میں سرکاری ملازمت اور اپنے اسی مذکورہ عہدے کے ساتھ وابستہ تھا۔

ملازم میں ان کا ہی کپتان ہوں
دل و جاں سے حاضر میں ہر آن ہوں

(دیوان - ۳۹۰)

میں نوکر ہوں جس کا اے بار کریم
اسے بھی تو رکھ خوش بہر دوسرا

دیوان - ۹

میں نوکر اس کا ہوں آقا ہے میرا حاتم ثانی
اسے زیبا ہے ہر طرح سے ہر رتبہ بھلائی کا

مثنوی - ۹

پھر دیوان کے خاتمہ میں بھی اس موضوع پر یہ اشعار ملتے ہیں' جن سے اس کے مصطفیٰ آباد (ٹونک) میں متمکن اور وزیرالدولہ کی ملازمت میں رہنے کی واضح شہادت ملتی ہے۔

دل آباد ہے اور جی شاد ہے
کہ میرا وطن مصطفیٰ باد ہے
جو ہے والئی ٹونک ابن امیر
وہ ہے میرا آقا محمد وزیر

قائم نے یہاں ٹونک کو "مصطفیٰ آباد" سے موسوم کیا ہے' جب کہ یہ "محمد آباد" کے نام سے معروف ہوا۔ ممکن ہے اولاً ٹونک کے لئے محمد آباد ہی نام تجویز ہوا ہو' مگر چونکہ ہندوستان میں اور بھی محمد آباد موجود رہے ہیں' اس لئے شاید اسے مصطفیٰ آباد سے موسوم کر دیا گیا ہو۔ لیکن بعد میں یہ کسی وجہ سے "محمد آباد" کے نام ہی سے معروف ہوا' جو متاخر ماخذ سے ثابت ہوتا ہے[۱]۔ پھر بھی قائم کی اس عصری شہادت کے مطابق اس کا نام ایک وقت میں "مصطفیٰ آباد" ضرور رکھا گیا تھا۔ کیونکہ یہ امکان کم ہے کہ وہ کسی اور مصطفیٰ آباد میں مقیم ہو' جیسے "جوناگڑھ" کا بھی یہ نام رکھا گیا تھا[۲]۔ یا مین پوری (یو پی) کی ایک تحصیل کا بھی یہ نام تھا[۳]۔ اور ضلع انبالہ میں بھی ایک تحصیل اس نام کی تھی[۴]۔ لیکن قائم کا ان میں سے کسی ایک میں رہ کر وزیرالدولہ کی ملازمت میں رہنا بعید از حقیقت ہے۔

ریاست کے افغان نسل حکمرانوں کی طرح قائم یا اس کے اجداد کا تعلق بھی افغانستان سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ اردو کے علاوہ ہندی' فارسی اور پشتو سے بھی خوب واقف تھا۔ اس کے دیوان میں "افغانی غزلیں" اور پشتو کی ایک مقبول صنف

"پہ" کو اردو میں اختیار کرنے کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

قائم نے وزیرالدولہ کی نسبت جو عقیدت مندانہ اور دعائیہ جذبات بیان کئے ہیں، ان کا نمونہ یہ ہے۔

جواں مرد ہے وہ خجستہ سیر
خدا سی بزرگی اسے ہے عطا
وہ ہے معدن جود ارباب علم
نہیں جس (کا) ثانی کوئی دوسرا
وہ ہے ہند میں ایک سلطان دیں
ثنا خواں ہے (ہر) یک بصد مرحبا
شجاعت کے عالم میں ہے لامثال
سخاوت میں رکھتا ہے دل کو بھرا
عبادت کے دریا کا ہے ایک در
جبیں پر ہے قدرت کی اس کے ضیا
مروت فتوت کا جامہ ہے یہ
سبھی لوگ جس پر کریں جاں فدا
وہ عادل ہے عالم ہے عامل غرض
شب و روز کرتا ہے کار خدا
خدایا اسے رکھ بجاہ و جلال
کہ رونق ہے اس کے ہی دم سے سوا
کرم رحم سے اس کا دل شاد رکھ
نہ لا پاس کچھ اس کے جور و جفا

تو دنیا میں قائم رکھ اس کو رحیم
وہاں تک کہ خورشید کا ہے ضیا

دیوان ۔ ۹ ۔ ۱۲

وزیر الممالک محمد وزیر
جوان و جواں بخت روشن ضمیر
عدالت گری اور سخاوت کا طور
ہے جیسا ہے اس میں نہو کوئی اور
جہاں میں ہوئے ہیں سلاطیں تمام
نہ ایسا کسی نے کیا جگ میں نام
کہ نواب نے جو کیا ہے ضرور
اسے جانتے سب ہیں نزدیک و دور
کہ فعل شنیعہ جو تھے لاکلام
کئے ملک سے دور اپنے تمام
جھکایا سبھوں کو رہِ دین پر
بد آئین بھی آئے آئین پر
ہے رونق عجب شہر اسلام میں
ہے نیکی کا ہر کار ہر کام میں
اسے علم کا شوق ہے اس قدر
کہ جو ذکر ہے اس کا شام و سحر
ادب حفظ معقول و منقول ہے
خدا کا وہ ہر طرح مقبول ہے
ہے جب تک جہاں میں یہ ماہ منیر

الٰہی رہے شاد دل یہ وزیر
اسے خرم و شاد رکھ تو مدام
طفیل محمد علیہ السلام

مثنوی ـ ۸ـ۱۱

یہاں انہی اشعار کے درمیان قائم نے وزیرالدولہ کے والد نواب امیرالدولہ (۱۷۶۸ـ۱۸۳۴ء) کی شان میں بھی اس طرح کے اشعار لکھے ہیں۔

جہاں میں تھا زور اس کی شمشیر کا
ہر اک اس سے ڈرتا تھا چھوٹا بڑا
ولایت سے تھا نامور وہ امیر
نہ رکھتا تھا دنیا میں (اپنی) نظیر
کیا اس نے آباد سنبل کے تئیں
وہ کرتا تھا گلزار جنگل کے تئیں
ہوا ٹونک میں جب کہ رونق فزا
تو گردن کشوں نے دیا سر جھکا
گیا جس ولایت میں وہ نامور
کیا پل میں تسخیر اسے سر بہ سر

(مثنوی ـ ۱۰ـ۱۱)

قائم کو سید احمد شہید سے بے پناہ عقیدت و نسبت تھی اور چونکہ نوابین ٹونک بھی سید احمد شہید کی تحریک سے ربط و عقیدت رکھتے تھے' اس لئے قائم کے خیال میں وزیرالدولہ کی نیک طبعی اسی تحریک کے زیر اثر تھی۔

خلیفہ ہے یہ سید احمد کا ایک
تو ہوتا ہے اس سے ہر اک کار نیک

(مثنوی ـ ۱۰)

وزیرالدولہ عالی ہے خلوص دل سے جو ان کا
تو ان کے فیض سے ان کو ملا درجہ بڑائی کا

قائم کا طبعاً مذہب کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس سے قطع نظر کہ اس وقت کی روایت کے مطابق اس کے دیوان اور اس کی مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے، اس کے دیوان کی متعدد غزلوں میں بھی نعتیہ اشعار شامل ہیں۔ اور ساتھ ہی دیوان میں نعت و مناجات کا ایک علیحدہ گوشہ موجود ہے اور اس کی مثنوی میں منقبتیں بھی شامل ہیں۔ بلکہ اس کی مثنوی کا تو مرکزی خیال اور بنیادی مقصد ہی تمام تر اخلاقی اور ناصحانہ و اصلاحی ہے۔ ان دونوں تصانیف میں اس نے سید احمد شہید سے اپنی عقیدت و ارادت کے اظہار میں جو اشعار تحریر کئے ہیں، وہ ان کی ذات اور تحریک سے اس کی نسبت و وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں ان اشعار کو مکمل نقل کیا جاتا ہے۔

قصیدہ در شان جناب پیر دستگیر قدس سرہ العزیز جناب سید احمد صاحب

کہاں تک شکر ہو بندے سے ذات کبریائی کا
کہ وہ معبود حق سلطان ہے ہر دو سرائی کا
اٹھائیں سر کو کیوں کر جو کہ حامل ہیں گناہوں کے
ولے امید رحمت نے ہے دعویٰ بس عطائی کا
کیا محبوب پیدا اس نے اپنا اپنی رحمت سے
عنایت سے لقب بخشا اسے ہے مصطفائی کا
گناہگاران امت کے جو ہیں بس واسطے سب کے
کریں گے معاملہ عقبیٰ میں وہ مشکل کشائی کا
گناہوں کے پھنسا ہے دام میں قائم کہے کیا اب
توقع ہے انہیں کی ذلت سے یارو رہائی کا

کیا آل نبی سے ملک روشن حق تعالیٰ نے
سمجھتا بھید ہے وہ آپ ہی اپنی خدائی کا
اطاعت جس نے کی آل نبی کی جان اور دل سے
تو اس کو پا گیا رستہ مجو پھر جفائی کا
غلام احمد کا ہوں میں اور جناب سید احمد کا
مجھے ہے داعیہ بس جان و دل سے خاکپائی کا
مریدوں میں نہیں کہتا میں خود کو پر یہ کہتا ہوں
انہیں رتبہ ہے شاہی کا مجھے رتبہ گدائی کا
سیادت منہ پہ روشن اور انہوں کو تھی بزرگی خوب
جنہوں نے یہاں نکالا طور دیں کی رہنمائی کا
خدا کی راہ پر چلتے تھے وہ دن رات اے ہم دم
اسی باعث ملا رتبہ ہے ان کو دوسرائی کا
اگر مس آ گیا نظروں میں ان کی تو ہوا اکسیر
تھا جلوہ آنکھ میں ان کے عزیزو کیمیائی کا
ولایت میں ہوا روشن وہ جوں خورشید تابندہ
جبیں پر تھا چمکتا ان کے تو نور خدائی کا
ہزاروں کو ہوا ہے فیض ان کی ذات سے یارو
کہ ہر چاروں طرف ہے نام روشن بس بھلائی کا
کرامت جو ہوئی ظاہر انہوں کی ملک و عالم میں
فلک تک اڑ گیا آوازہ ان کی پارسائی کا
امیرالمومنین اس دور میں حق نے کیا ان کو
نبی کے دین میں پایا ہے درجہ کیا بڑائی کا
نہایت عجز تھا ان میں بہادر دین کے تھے وہ

نہ لائے پاس اپنے نام کا ہے وہ ریائی کا
مروت میں یگانہ خلق میں از بسکہ لاثانی
ختم ہے اس سے کار متقی و پارسائی کا
ہوا بیمار ایک پل میں انہوں کے لب سے یہ فی الفور
نہ حاجت مند وہ ہرگز ہوا نسخہ دوائی کا
فدا ہر شخص تھا ان پر ملائک دل سے تھے قرباں
کہ تھا نام خدا وہ مظہر نور خدائی کا
تھا خورشید سعادت ماہتاب احمدی تھا وہ
چمک سے جس کی ہے عالم میں جلوہ روشنائی کا
جو لے حاجت گیا ان پاس وہ شاداں ہوا (یک دم)
کہ نزدیک ان کے تھا مطلق نہ نام خودنمائی کا
وہ تھے مقبول حق کے ہر طرح اور برگزیدہ تھے
انہیں زیبا ہے درجہ ہر صفت کا اور ثنائی کا
پیغمبر کے نواسے تھے عزیز از جان جو حسنین
دیا حق نے انہیں درجہ شہادت کی ضیائی کا
جناب سید ذوراں کو بھی اس حق تعالیٰ نے
عطا یہ درجہ اعلیٰ کیا ہے خوش نمائی کا
جہاں میں جو کرامت تھیں وہ سب ان میں ہویدا تھیں
قلم کو تاب کیا ہے جو لکھے حرف بڑائی کا
ہوا جو خلوم ان کا گرچہ مجرم ہے وہ عالم کا
وہیں حق سے ہوا بس وہ سزاوار عطائی کا
حقیقت ہوں میں ذرہ اور (وہ) خورشید عالم ہے
اسی پرتو سے میں پایا اثر اپنی صفائی کا

وہ رنگ قدرتی تھا اور سراپا نور سے پر تھا
ہوا روشن میرا ان سے یہ رنگ حنائی کا
غلام اپنی بزرگی جو ۔رکھے تحقیق (ہے) یہ بات
میاں کا ہے وہ سب صدقہ اور اس کی پارسائی کا
مکرم اور اشرف تھے بزرگ دہر تھے واللہ
تھے ساکن گر زمیں پر حال تھا ظاہر سمائی کا
جہاں ان کا قدم پہنچا ہوئے جا ایک وہ گلشن
ملا تحقیق تھا درجہ انہوں کی اولیائی کا
میں تھا تاریک دل ازبسکہ خوبی ہے یہ قسمت کی
یہ ان کے فیض سے مطلب ہوا ہے دل کشائی کا
حقیقت میں نہیں تھا بات کرنے کا مجھے کچھ ڈھنگ
ملا درجہ انہیں سے ہے سخن کی آشنائی کا
ہو مجھ سے کب صفت ان کی کہ ہوں قطرہ کے میں مانند
وہ ہے دریائے رحمت فضل جود کبریائی کا
عجب ہے چرخ کی گردش کہ باعث اس کی گردش کے
پڑا جو سامنے یک بار کے پردہ جدائی کا
رہے محروم ہم دیدار سے اس جا پہ صد افسوس
قدم سے ان کے جنت میں لیا رتبہ ضیائی کا
الٰہی مجھ کو قدموں میں ان کے دیجیو تو جا
تری درگاہ میں ہر دم ہے یہ دست دعائی کا
بھرا ہوں میں گناہوں میں تو اپنے فضل سے وہ کر
کہ محفل میں ہو ان کی وہاں میرا دخل رسائی کا
وزیرالدولہ عالی ہے خلوص دل سے جو ان کا

تو ان کے فیض سے ان کو ملا درجہ بڑائی کا
یہاں تک خوبیاں اس کی ہیں کر تو اے دلا یہ غور
کہ پہونچا آسماں تک شہرہ (ہے) حشمت نمائی کا
نہو اس کی صفت قائم سے یک ذرہ کسی ڈھب سے
دکھاتا ہے ولے یہ خیال طبع آزمائی کا

(دیوان۔ ٦۔۹)

صفت پیر دستگیر جناب حضرت سید احمد صاحب رضی اللہ عنہ

مجھے ارغوانی پلا دے شراب
کہ ہے ساقیا تو بساں آفتاب
مجھے مثل آئینہ روشن کرے
وہ پژمردہ دل میرا گلشن کرے
کرے جو صفت پیر کی میرا دل
انہوں کی محبت میں ہو جائے کھل
وہ ہے شاہ ایسا جہاں میں نمود
قلم جو لکھے اس سے ہے گا فزود
شہان عرب اور عجم کے تمام
فتادہ ہیں در پر وہ انہوں کے مدام
کیا صدق دل سے انہیں جس نے یاد
بفضل خدا وہ ہوا زود شاد
میں قربان ہوں اے خدا تجھ اوپر
کہ امت نبی میں ہیں ایسے بشر
مثل مسیح معجزہ ان سے ہو

تلطف سے کر دیوے تو اپنے دو
پڑا ان کا جس جا پہ جا کر قدم
ہے کیا دخل اس جا پہ پھر ہو ستم
جہاں سے کیا کفر یک بار دور
وہ تھے برگزیدہ خدا کے ضرور
کرامت ادنیٰ یہ سن ان کی یار
گئے جو وہ پنجاب میں ایک بار
وہاں پر شقی تھے بہت سرنگوں
کیا ایک دم بیچ ان کو زبوں
ہوئے خود بخود آ کے فرماں پذیر
نشانہ پہ بیٹھے ہے جس طرح تیر
جو فرمان سے ان کے باہر ہوا
تو ایک دم میں دوزخ سے جا کر ملا
ہوئے وہ شہادت سے پھر کامیاب
نبی کے ہوئے دین میں آفتاب
ہوس تھی یہی ان کے دل میں مقیم
سو بر لایا رحمت سے اپنے کریم
دلا کر تصور تو اس جا بہم
بزرگی رکھے کوئی ایسی اتم
تو پھر کیوں نہ قربان انسان ہوں
جہاں میں وہی ایک سلطان ہوں
جواں مرد تھے بس وہ ہر کام میں
ہیں جانے سبھی شہر اسلام میں

سخاوت میں یکتا مروت میں فرد
تھے وہ دین کی رہ میں مردانہ مرد
شجاعت کے پیشہ کا تھا شیر نر
ہے ان کی شجاعت کی حق کو خبر
عبادت میں رہتے تھے حق کی تمام
بجز یاد حق کے نہ تھا اور کام
شرافت وہ رکھتے تھے ہر بات میں
بھرا علم ہر ایک تھا ذات میں
کروں نام کا ان کے تم سے بیان
کہ ہے اسم یہ ان کا اے مردمان
خدا (کا) وہ عاشق جو واحد ہوا
تو مشہور بس سُید احمد ہوا
میرے پیر ہیں وہ میں ان کا مرید
رکھوں ہوں میں الفت انہوں کی مزید
عجب شان ہے ان کی اے مردماں
خدا نے کیا فضل اپنا عیاں
بھلا جس کی امت میں یہ ہوں بشر
پیغمبر کی مانند کب ہو دگر
نبی کی جو ادنیٰ سی اک بات ہے
وہ سب مرسلوں کی کرامات ہے
خدا سے کرو تم دعا میرے پیر
مرے دل کا بر لا دے ما فی الضمیر
ولایت کے تم ماہ تابندہ ہو

بزرگی کے خورشید رخشندہ ہو
سر اپنا تمہارے قدم پر رکھوں
میں جاروب روضہ کی آ کر کروں
خدا دیوے گر مجھ کو طاقت بہم
تو روضہ کا حضرت کے دیکھوں حشم
رہوں اس پہ پروانہ آسا نثار
کہ ہے زیب افزا وہ باغ و بہار
یہ قائم ہے فدوی تمہارا ضرور
کمر بستہ خدمت میں ہے بے قصور

مثنوی ۔ ۶۔۸

قائم نے غزل اور مثنوی کے علاوہ دیگر متعدد اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دیوان میں غزلیں صفحہ ۲ سے ۳۵۶ تک محیط ہیں۔ ان کے بعد مخمس' مسدس' قطعات' رباعیات' واسوخت اور ٹپے شامل ہیں۔ طبیعت میں موزونی اور پر گوئی تو ہے لیکن شعری پختگی' گہرائی' ندرت خیال' بلندی فکر اور محاسن و رموز سے اس کا کلام بالعموم آراستہ نہیں۔ یہ آمد کے علاوہ آورد اور ساتھ ہی تک بندی و لفظی آراستگی کی کوششوں تک محدود نظر آتا ہے۔ بلکہ اس باب میں کم سوادی اس حد تک بھی نظر آتی ہے کہ عروض ہی کی نہیں' قواعد کی اغلاط کے ساتھ ساتھ' کہ جو متعدد مقامات پہ نمایاں ہیں' لغوی کوتاہیاں' مثلاً" مونث کو مذکر' جیسے انتہا' راہ' توقع' آواز' ضیا' نظیر کو مذکر استعمال کرنا اور املا کی اغلاط بھی ملتی ہیں۔ تلاش کو تلاش اور خرم کو خورم جیسی کوتاہیوں سے قطع نظر مثنوی کو ہر جگہ مسنوی لکھنا تعجب خیز ہے۔ ان سب کے بلوجود شاعر اپنے اسلوب کو (مثنوی میں) پر بہار قرار دیتا ہے۔

عجب اس کا اسلوب ہے پر بہار
عجائب یہ قصہ ہے گوہر نگار

مثنوی۔ ۱۳

لیکن اسے اپنی کمزوری اور کم مایگی کا احساس ضرور ہے، چنانچہ وہ دعا گو ہے۔

سخن کا مرے دل میں خانہ بنا
مجھے شاعروں میں یگانہ بنا
صفت شعر کی میرے شاعر کریں
خوشی سے سروں پر اسے وہ دھریں
اگر اس میں خامی وہ دیکھیں ذرا
تو اصلاح فرماویں اس میں بپا
مرا خامہ کر دے تو گوہر فشاں
کہ قائم رہے اس سے نام و نشاں

مثنوی۔ ۱۳

یہ نہیں کہ قائم کا سارا کلام ہی خامیوں اور کمزوریوں کا حامل ہے، متعدد مقامات پر نظر ٹھہر بھی جاتی ہے بلکہ کہیں جم بھی جاتی ہے۔ مثلاً غزلوں میں جا بجا اس طرح کے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔

آنکھوں سے پس از مرگ بھی جاری رہا دریا
بہتا ہے ہر اک سمت میری گور میں پانی
ہے موج زن آنکھوں میں مری اشک کا طوفاں
ابلا تھا کبھی جیسے کہ تنور میں پانی
دامن کو تو رکھ لیتے ہیں ہاں دیدہ تر پر
پر داغ جگر پر کبھی پھایا نہیں رکھتے
کس طرح کہیں تیری نظر آوے تجلی

موسیٰ کی طرح دیدہ بینا نہیں رکھتے
جب اس نے بھرے زلف گرہ گیر میں موتی
ہم نے بھی جڑے اشک کی زنجیر میں موتی
اس تشنہ فرقت کو تصور ہے یہ ہر دم
پلوا دے تو الفت سے مجھے آب بقا کا
دائم رہوں ہوں ہجر میں جانان من بیا
ہوں مرغ نارسیدہ گلستان من بیا
ہر ایک دشت میں پھرتا ہوں برنگ ہوا
سراغ حیف ملے ہے نہ شہسوار ترا
شکر خدا کہ مر گئے وعدے سے پیشتر
مشہور خلق میں نہ صنم بے وفا ہوا
امکان سے خارج ہے کہ نکلے ہوس دل
وہ شوخ تصور میں بھی تنہا نہیں آتا
استخوان کو بھی قائم کے نہ کھلایا پس مرگ
تجھ کو بھی ہم نے سگ کوچہ جاناں دیکھا
ناتوانی سے سبک دوش ہوا ہوں قائم
لاش جاتی ہے چلی جیسے کفن میں تنکا
لکھا تھا وصف جو قائم نے گیسوئے جاناں
تو بن گیا پر طاؤس اس کتاب میں سانپ
اب چبھے ہے دل پہ میرے بے طرح خار فراق
اور نشتر زن جگر میں ہو رہا ہے خار تپ
آنکھوں کو میں نے کس کے کف پا سے ملا تھا
آتی حنا کی اشک سے تھی بو تمام رات

قیس نے مجھ سے عشق سیکھا تھا
اس سبب سے تھا عشق اس کا پاک
جھڑی فرقت کی آنکھ سے ہے رواں
غم کے آتے ہیں دم بدم بادل
آپ نے ابرو چڑھائیں غیظ میں
خم پڑا ہے آگے کیا تلوار میں
گر دیدۂ پر آب سمندر سے کم نہیں
لخت دل و جگر بھی شناور سے کم نہیں
پھرتے ہیں غیر صورت یاجوج غم زدہ
دیوار یار سد سکندر سے کم نہیں
تیری خوش چشمی کی تعریف سنی ہے جب سے
حسرت دید میں باہر نکل آئیں آنکھیں
نخل خزاں رسیدہ ہوں میں باغ دہر میں
ملتا ہے اب صبا کوئی رشک چمن کہاں
خانہ بدوش پھرتے ہیں ہم شکل آسماں
اس مہر وش کی یاد میں حب وطن کہاں
ڈبویا ہم نے اب دے دے کے رخصت دیدۂ تر کو
شجر کو کوہ کو فرش زمیں کو چرخ اخضر کو
ترے بن چور کر ڈالوں نہ کیوں کر سنگ حسرت سے
صراحی کو سبو کو جام کو صہبا کو ساغر کو
نہ ملا ساغر مے مجھ کو تو کس حسرت سے
پی گیا ساقیا میں آنکھ میں بھر کر آنسو
موت سمجھی ہے بہانہ شب تنہائی کو

کاش ایسے میں وہ آ جائیں مسیحائی کو
کنج تنہائی میں سوجھے مجھے لاکھوں مضمون
عین وحدت میں نظر آتی ہے کثرت مجھ کو

قائم نے بالعموم اپنی علامتوں اور استعارات کو محدود رکھا ہے۔ روایتی موضوعات اگرچہ اس کے کلام میں بکثرت موجود ہیں لیکن محاکات اور معاملہ بندی جیسے عناصر خاصے کم نظر آتے ہیں۔ عشقیہ جذبات کی اس کے کلام میں بہتات ہے اور اس نے ان کا اظہار متنوع صورتوں میں کیا ہے۔ ذاتی یاس و محرومی اور نارسائی اس کے ہاں بکثرت ملتی ہے۔ دیوان میں اگرچہ نعت و مناجات مستقل عنوان کے تحت بھی موجود ہیں لیکن متعدد غزلوں میں بھی نعتیہ جذبات پر مبنی اشعار خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ جو دیگر اصناف اس کے دیوان میں شامل ہیں' ان میں ناصحانہ اور واعظانہ خیالات حاوی ہیں۔ اس کی مثنوی (گوہر نگار) تو بنیادی طور پر اخلاقی موضوع ہی پر مبنی ہے اور اصلاحی و ناصحانہ مقصد کی حامل ہے۔ اس کا آغاز حمد و نعت اور صفت اہل کبار' صفت اہل بیت اور صفت سید احمد شہید سے ہوتا ہے۔ اس مثنوی کی تخلیق کے محرک قائم کے احباب : منشی ظہور علی اور شہامت خاں تھے۔ مثنوی کے سبب تصنیف کے تحت قائم نے لکھا ہے :

سبب اس کے کہنے کا ہے اک دگر
سناتا ہوں میں تجھ کو اے خوش سیر
کیا جب کہ دیوان میں نے ختم
مرے دوست ہیں ایک عالی ہم
بڑے مہرباں ہر طرح ہیں شفیق
محبت کے دریا میں ہیں وہ غریق
مروت میں یکتا شرافت کی کان
سبھی جانتے ہیں انہیں بے گمان

خرد ان کے دم پر سے قربان ہے
ملائک صفت بس وہ انسان ہے
ہے دلشاد حق کی اطاعت میں وہ
رکھے ہے بھرا دل عبادت میں وہ
تواضع میں رہتے ہیں قائم مقیم
سبھوں سے وہ جھکتے ہیں بے خوف و بیم
غریبوں سے الفت ہے ان کو زیاد
ملا ان سے جو ہو گیا شاد شاد
ہے نام ان کا منشی ظہور علیؔ
بزرگی رکھے ہے خفی و جلی
وہ فرمانے مجھ سے لگے ۔ اس طرح
میں لکھتا ہوں اس کو یہاں جس طرح
کہ قائم ہے تو دوست میرا تمام
تو اس واسطے یہ کروں ہوں کلام
تو اس مثنوی کو بھی تیار کر
رکھے خوش خدا تجھ کو شام و سحر
شہامت خاں ہیں میرے مہرباں
انہوں نے بھی دی اس میں ترغیب ہاں
ہے منشی کی خاطر مجھے بس عزیز
کہ وہ صاحب ہوش ہے اور تمیز
جو ارشاد ایسا انہوں نے کیا
تو فوراً میں ۔ اس مثنوی کو لکھا

مثنوی ۔ ۱۲ ۔ ۱۳

مثنوی کے قصہ کا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے جس کا نام خطا ہے اور جس پر ایک نیک دل اور رعایا پرور بادشاہ عبدالرحیم حکمراں ہے۔ یہ ایسا خوش خصال ہے کہ ملک میں سب ہی اس سے خوش اور مطمئن ہیں۔ اس کے دربار میں کئی وزیر ہیں دو اس کے زیادہ قریب ہیں' ایک ماہ رخ اور دوسرا زمیری۔ یہ علی الترتیب خیر اور شر کی علامتیں ہیں۔ دونوں بادشاہ کا زیادہ سے زیادہ قرب اور اعتماد چاہتے ہیں اور اسی لئے ان میں ایک کشمکش رہتی ہے۔

ایک دن بادشاہ زمیری سے خواہش کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کا طلبگار ہے' جس میں یہ تین صفات ہوں۔ وہ حسین ہو' نیک و پرہیز گار ہو اور پھر خوش آواز بھی ہو۔ زمیری بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسی عورت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ ایسی عورت تو اسے کوئی نہیں ملتی لیکن وہ خود ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر دربدر پھرتا اور ناکام و نامراد واپس آ جاتا ہے۔ اس کے ناکام آنے کے باوجود بادشاہ اس خدمت پر اس کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ جب زمیری نے یہ دیکھا کہ بادشاہ نے اس کی ناکامی کے باوجود اسے انعام و اکرام سے نوازا ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ وہ بادشاہ کے لئے ہر حال میں پسندیدہ ہے' تو وہ مغرور اور خود پسند ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں اور ماہ رخ میں کشمکش اور رقابت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

بادشاہ کی خواہش دیکھ کر ایک دن ماہ رخ نے بادشاہ سے اپنی بیوی انجم فزا کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو بادشاہ کو مطلوب ہیں اور کہا کہ چونکہ ہم آپ کی اولاد کے برابر ہیں اس لئے آپ اسے اپنی کنیز کے طور پر قبول کر لیجئے۔ وہ بخوشی آپ کی خدمت بجا لائے گی۔ چنانچہ بادشاہ نے ماہ رخ کی مرضی دیکھ کر اسے بطور دختر اپنانا منظور کر لیا۔ زمیری یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے حسد میں بادشاہ سے کہا کہ ماہ رخ نے جو کچھ صفات اس عورت کی بتائی ہیں' وہ سب جھوٹ ہیں۔ یقیناً" وہ عورت حسین اور خوش آواز ہے لیکن دراصل آوارہ

ہے۔ اور اگر بادشاہ کو اس کی بات پر شک ہو تو اسے موقع دیا جائے تاکہ وہ اس عورت کی آوارگی کو ثابت کر سکے۔ وہ خود بادشاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ کسی طرح ماہ رخ کو کچھ عرصہ کے لئے گھر سے دور بھیج دیا جائے اور زمیری کو اجازت دی جائے کہ وہ ماہ رخ کے گھر جا کر اس عورت کو ورغلا کر لے آئے۔

زمیری نے جو کچھ کہا تھا' حسد میں کہا تھا اور غلط تھا۔ وہ عورت انجم فزا حسن اور خوش الحانی کے ساتھ ساتھ نہایت پرہیزگار اور عبادت گزار تھی۔ بادشاہ کی اجازت سے زمیری موضع قصر روانہ ہوتا ہے' جہاں ماہ رخ کا گھر تھا اور وہاں انجم فزا رہتی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ کٹنیوں سے مدد لیتا ہے اور مدعا بیان کرتا ہے۔ سب ہی کٹنیاں انجم فزا کی پرہیزگاری کے باعث اس کام سے ہاتھ کھینچ لیتی ہیں۔ لیکن بالآخر ایک کٹنی راضی ہو جاتی ہے اور فریب و مکر سے انجم فزا سے ملنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتی ہے۔ مگر ناکام رہتی ہے کیونکہ انجم فزا پردے کی اس قدر پابند ہوتی ہے کہ انجان عورتوں سے بھی ملنے سے گریز کرتی ہے۔ کٹنی ناکام ہو کر آخر انجم فزا کے والدین سے رجوع کرتی ہے ان کے پاس جا کر ان کی ہمدردی حاصل کرتی ہے اور پھر حالات سے واقف ہو کر واپس آتی ہے اور ایک جعلی خط انجم فزا کے نام اس کی ماں کی طرف سے لکھتی ہے اور اسے اس کے باپ کی فرضی بیماری کا حال لکھ کر اپنے پاس بلاتی ہے۔ لیکن انجم فزا اس بنیاد پر کہ اس کا شوہر وہاں نہیں تھا اور اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے نہیں نکل سکتی تھی' وہ ماں کو جواباً" معذرت کا خط لکھ کر آنے سے انکار کر دیتی ہے۔ تب کٹنی ایک دوسرا خط اس کی ماں کی طرف سے انجم فزا کو لکھتی ہے کہ اس کا باپ فوت ہو گیا ہے اس لئے اب وہ خود اس کے پاس آنا چاہتی ہے۔ انجم فزا کو اپنے باپ کے مرنے کا بہت دکھ ہوتا ہے' چنانچہ وہ اپنی ماں کو اپنے پاس بلا لیتی ہے۔ وہ خط پا کر خود وہ کٹنی انجم فزا کے پاس اس کی ماں بن کر پہنچ جاتی ہے۔ کم عمری میں بیاہے جانے کے باعث انجم فزا کٹنی اور اپنی ماں میں تمیز نہیں کر

پاتی۔ وہ کٹنی اس کے ساتھ رہنے لگتی ہے اور انجم فزا اس کو ماں سمجھ کر اس کی خدمت گزاری میں لگ جاتی ہے۔ وہ ایک خط اپنے شوہر کو بھی لکھ کر اپنے باپ کے مرنے کی اطلاع دیتی ہے۔

یہ خط جو فراق کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے' طویل ہے اور بارہ ماسہ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مثنوی نگار نے ایک اور قصہ کہانی میں شامل کیا ہے جو ایک عورت کی بے وفائی کے واقعہ پر مبنی ہے اور اس کا مقصد عورت کی فطرت کا مقابلہ کرنا ہے تاکہ انجم فزا کی وفا شعاری اور پاسداری زیادہ اجاگر ہو سکے۔

ماہ رخ وہ خط پڑھ کر بے چین ہو جاتا ہے اور بادشاہ سے اپنی بیوی کے پاس جانے کی اجازت طلب کرتا ہے لیکن عین اس وقت پڑوسی ملک ختن سے جنگ کا خطرہ بڑھ جانے کے باعث بادشاہ اسے گھر جانے سے روک دیتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنا سب سے معتبر وزیر سمجھتا ہے۔ چنانچہ ماہ رخ رک جاتا ہے۔ اس مقام پر مثنوی میں اولاً" شاہ خطا اور شاہ ختن کے درمیان مراسلت ہوتی ہے لیکن پھر جنگ چھڑ جاتی ہے۔ شاہ خطا کو فتح نصیب ہوتی ہے اور وہ ماہ رخ کو ملک ختن کے بندوبست کی ذمہ داری سونپ کر اسے وہاں بھیج دیتا ہے۔ ماہ رخ اس فوری ذمہ داری کی وجہ سے انجم فزا کے پاس نہیں جا سکا' لیکن وہ ایک خط لکھ کر اپنے جذبات فراق و الم بیان کرتا ہے۔ اس عرصہ میں وہ کٹنی انجم فزا کی ایک دل کش تصویر بنا کر زمیری کے پاس لے جاتی ہے۔ زمیری اس تصویر کو بادشاہ کے پاس لے جاتا ہے اور انجم فزا سے اپنے وصل کی جھوٹی کہانی سناتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ماہ رخ بادشاہ کی نظروں سے گر جاتا ہے اور وہ غصہ میں ماہ رخ کو ملک ختن سے واپس بلوا کر اس کا منصب و عہدہ زمیری کو دے دیتا ہے۔

ماہ رخ کو اصل حالات کا علم نہیں ہوتا۔ جب وہ واپس آتا ہے تو بادشاہ کا رویہ بھی بدلا ہوا پاتا ہے۔ بادشاہ اسے سبب بتا دیتا ہے اور ساتھ ہی ثبوت میں انجم فزا کی تصویر بھی دکھا دیتا ہے۔ ماہ رخ کو یہ تصویر دیکھ کر بے حد رنج ہوتا ہے۔ اس پر ستم

یہ ہوتا ہے کہ زمیری اس کے سارے مال و اسباب پر بھی قبضہ کرلیتا ہے۔ اور اسے اپنا تحت بنالیتا ہے۔ ماہ رخ ایک دن کچھ سوچ کر زمیری سے بہانہ کرتا ہے کہ اس کا بہت سامال واسباب ختن میں رہ گیا ہے جسے وہ وہاں سے لاناچاہتا ہے۔ زمیری اس کی لالچ میں اسے ختن جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ ماہ رخ ختن کے لئے روانہ ہوتا ہے لیکن راستہ میں اپنے گھر پہنچتا ہے اور بیوی کو دیکھ کر اس کے منہ پر کالک مل دیتا ہے۔ اور پھر بغیر کچھ کہے سنے واپس ہو جاتا ہے۔ انجم فزا کچھ سمجھ نہیں پاتی اور بے حد ملول ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے مقدر پر شاکر رہتی ہے۔ لیکن اصلیت کا کھوج بھی لگاتی ہے اور جب وہ اپنی ماں کو خط لکھتی ہے تو اس پر ساری حقیقت وا ہو جاتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ جب اس کی دنیا ہی بگڑ چکی تو وہ خود کیوں نہ اپنے آپ کو بدل کر کوئی تدبیر کر لے۔ چنانچہ وہ اپنا رنگ و روپ بدل کر اور ایک مطربہ کے بھیس میں بادشاہ کی توجہ حاصل کر لیتی ہے۔ بادشاہ اسے پسند کرنے لگتا ہے۔ اور یوں اس کی رسائی دربار تک ہو جاتی ہے۔ وہاں اس کو زمیری کی ساری سازش کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

بادشاہ اس کے لئے بے تاب رہنے لگتا ہے اور ایک دن اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا ہے مگر انجم فزا اس کی آتش شوق کو بھڑکانے کے لئے اس کے پاس جانے سے گریز ظاہر کرتی ہے اور بہانہ کرتی ہے کہ ایک امیر نے اسے ایک ہفتہ کے لئے اپنے پاس ملازم رکھ لیا ہے اور ابھی چار دن باقی ہیں' اس کے بعد ہی وہ بادشاہ کے پاس آ سکے گی۔ بادشاہ بے چین ہو جاتا ہے اور ان چار دنوں کے گزرنے کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ انجم فزا چار دان گزرنے کے باوجود بادشاہ کے پاس نہیں جاتی' پانچویں دن جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے گلہ کرتا ہے تو وہ اس سے کہتی ہے کہ جس شخص نے اسے ملازم رکھا تھا' اس نے تین لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب وہ مکر گیا ہے اور کہتا ہے کہ اسے کسی کا ڈر نہیں' وہ بادشاہ سے بھی نہیں ڈرتا۔ بادشاہ یہ سن کر غضب ناک ہو جاتا ہے اور اس شخص کا نام پوچھتا

ہے۔ انجم فزا زمیری کا نام بتا دیتی ہے۔ بادشاہ زمیری کو طلب کرتا ہے۔ زمیری حاضر ہوتا ہے مگر بادشاہ کو غصہ میں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس عورت کو نہیں جانتا اور اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ انجم افزا کہتی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے اور اگر سچا ہے تو اس سے کہیں کہ جو کچھ یہ کہتا ہے اس کا مچلکہ لکھ دے۔ بادشاہ اس تجویز کو پسند کرتا ہے اور زمیری بھی بخوشی مچلکہ لکھ دیتا ہے۔ یہ ساری باتیں ماہ رخ کو معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انجم فزا اسی مقصد سے یہاں آئی ہے۔ بادشاہ بھی حقیقت جان کر بہت خوش ہوتا ہے اور اسے اپنی بیٹی بنا لیتا ہے اور زمیری کو دیوار میں چنوا دیتا ہے۔ پھر بطور انعام ماہ رخ کو ختن کی حکمرانی بخش دیتا ہے۔

قائم نے اپنی اس مثنوی کو خود عجیب و مختلف داستان و قصہ سے تعبیر کیا ہے۔

عجب ہے فسانہ عجب داستاں
عجب نکتہ ہے دل کشا میری جاں

اور جس نکتہ کی طرف اس کا اشارہ ہے، غالباً" وہ اس کا اخلاقی و اصلاحی مقصد و موضوع ہے، جو اس مثنوی کی بنیاد ہے۔ اس مثنوی میں جا بجا اس قسم کے اشعار ملتے ہیں۔

سخن راستی مرد کا ہے شعار
بجز راستی کے وہ ہے خوار و زار
سخن راستی منہ کو روشن کرے
دل غنچہ کو مثل گلشن کرے
ہے جب تک کہ زندہ تو اے خوش صفات
سوا راستی کے نہ کہہ اور بات
ز کذب آدمی بشود بے وقار

بسا میشود خوار در روزگار
کن ہر لحظہ تو از دروغ اجتناب
کہ گردد زنہار کار خراب

(مثنوی ۔ ۲۹)

اس مثنوی کے اخلاقی پہلو کا محور عورت کی عصمت و عفت اور نیکی و پرہیزگاری اور خاص طور پر اطاعت و فرماں برداری ہے۔ انتہائی درد و الم میں کہ باپ کے انتقال پر بھی انجم فزا کا شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالنا اور ماں کے پاس نہ پہنچنا اس کی حد درجہ اطاعت کا مظہر ہے۔ قائم نے اس وصف کو یوں بیان کیا ہے۔

سخن سچ ہے یہ مادر مہرباں
کہ شوہر مجازی خدا ہے یہاں
پیمبر کی ہے اس طرح سے حدیث
اسے جو نہ مانے وہ ہے گی خبیث
کہ خاوند کا حکم لاوے بجا
رکھے حکم پر اس کے گردن جھکا
نہیں تو ہے دوزخ میں اس کا مقام
وہ جلتی رہے رات و دن لاکلام
بھلا جب نبی کا یہ فرمان ہو
نہ کیوں کر ہمارا وہ ایمان ہو

مثنوی کا قصہ، اس کے کردار، اس کی کہانی میں موجود خیر و شر کی کشمکش اور اس مناسبت سے اس کے کرداروں کی تخلیق اور پھر شر کے مقابلہ میں خیر کی فتح جیسے لوازمات اسے ایک روایتی مثنوی کی صف میں شامل رکھتے ہیں، لیکن اس کا موضوع اور اس کا اخلاقی و مقصدی پہلو اسے اردو مثنویوں کے ذخیرے میں ایک

قدرے مختلف اور منفرد مقام تک لے جاتا ہے۔ اس کا موضوع اور کہانی کا تانا بانا مثنوی کی روایتی اور اس وقت کی عام مروجہ ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ نہ اس میں فوق الفطرت عناصر و کردار موجود ہیں نہ یہ محیر العقول واقعات پر مبنی ہے۔ ماحول اور کہانی کا تعلق بہرحال اسی دنیا اور اسی زندگی سے ہے' لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تصور و تخیل میں تشکیل پائی ہے۔ سید احمد شہید کو اپنا پیر و دستگیر' قرار دینے والے شاعر سے ایسی ہی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔

تحریک مجاہدین کے تحت یا اس کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا ہے' نثر سے قطع نظر' نظم میں یہ بالعموم مثنوی ہی کی صنف میں تخلیق ہوا ہے۔ لیکن ایسی مثنویاں زیادہ تر رجزیہ ہیں یا راست تحریکی نظریے و مقصد کے ابلاغ کا نمونہ پیش کرتی ہیں' جن میں کہانی اور تمثیل کا عنصر قریب قریب ناپید ہے۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی تحریک مجاہدین کے ادب اور اردو مثنویوں کی عام تاریخ میں ایک مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ مثنوی نگاری کے فن اور شعری محاسن و خوبیوں سے قطع نظر' کہ اس پہلو سے یہ مثنوی شاید کسی امتیازی وصف کی حامل نہ سمجھی جائے' مگر اپنے مقصد اور مخلصانہ تخلیقی صفات کے باعث اسے اس حیثیت میں ضرور قابل ذکر شمار کیا جانا چاہیے۔

حواشی

۱۔ مثلاً" سید اصغر علی آبرو "حدیقہ راجستھان" مطبع ستارۂ ہند، آگرہ، ۱۳۱۸ھ، مقدمہ ص ۷، سید علی اصغر پیشکار "نجم الثاقب" مطبوعہ، بجنور، ۱۹۰۴ء، ص ۵

۲۔ بحوالہ۔ "Encyclopedia of Islam" نئی اشاعت، جلد دوم، لائیڈن، ۱۹۶۵ء، ص ۵۹۷، ۷۳۲

۳۔ بحوالہ۔ "Imperial Gazetteer of India" جلد ۱۸، آکسفورڈ، ۱۹۰۸ء، ص ۳۳

۴۔ بحوالہ۔ اے گھوش "An Encyclopedia of Indian Archaeology" جلد دوم، لائیڈن، ۱۹۹۰ء، ص ۲۹۶

۵۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ "یہ مدبر الملک منشی سید ظہور علی خاں صاحب اٹلوی اہل کار یا میر منشی دفتر کونسل عالیہ" عہد نواب ابراہیم علی خاں (۱۸۶۷ء۔۱۹۳۰ء) تھے بحوالہ اعجاز محمد خاں "تاریخ ٹونک" (ٹونک، ۱۹۸۳ء) ص ۹۵، ایک ہم عصر ماخذ کے مطابق ٹونک میں نائب اور مختار کل تھے۔ شاگرد غالب ہرگوپال تفتہ کے قدرداں اور "دیوان تفتہ" کی اشاعت کے مصارف میں شریک رہے۔ بحوالہ "اسعد الاخبار" دسمبر ۱۸۴۸ء، اقتباس مشمولہ، محمد عتیق صدیقی "صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات" (علی گڑھ، ۱۹۶۲ء) (ص ۱۵۱۔۱۵۲ ح) ڈاکٹر مہدی حسن (برادر ڈاکٹر ہادی حسن، علیگڑھ) کے مطابق یہ ان کے والد کے پھوپھا تھے اور ان کا تعلق اکبر آباد سے تھا مکتوب، حکیم محمود احمد برکاتی بنام راقم، مورخہ ندارد، موصولہ: ٹوکیو، ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ء، غالباً ان ہی کا توسط تھا کہ قائم کی تصانیف اکبر آباد سے شائع ہوئیں۔

مولوی محمد شاہ

تذکرہ "نگارستان سخن" کا ایک مولف

نواب صدیق حسن خاں (۱۸۳۲ء۔۱۸۹۰ء) انیسویں صدی کے نصف آخر کے علمائے ہند اور بالخصوص علمائے اہل حدیث میں اپنی علمی و تصنیفی حیثیت کے لحاظ سے ممتاز و معروف مقام پر فائز رہے۔ اپنے وقت کے اکابر علماء و فضلا سے بھی ان کا قریبی تعلق رہا اور نواب شاہجہان بیگم' والیہ بھوپال (۱۸۶۸ء۔۱۹۰۱ء) سے ۱۸۷۱ء میں نکاح کے بعد جاہ و ثروت اور اثر و فضیلت بھی انہیں حاصل ہوئی۔ جسے انہوں نے اپنے علمی مشاغل اور فروغ علمی میں خاصی فراغت سے استعمال کیا۔ ان کے حالات و آثار متعدد ہم عصر و متاخر ماخذ اور خود ان کی اپنی نوشتہ تصانیف میں ملتے ہیں' لیکن ان کے فرزند نواب محمد علی حسن خاں (۱۸۶۶ء۔۱۹۳۶ء) کی تصنیف "مآثر صدیقی"[۱]۔ مفصل و مبسوط ہے۔ اس میں ان کی تصانیف کی جو فہرست شامل ہے اس میں ان کی تحریر کردہ ۲۲۲ کتابوں کے نام درج ہیں[۲]۔ یہ فہرست اپنے موضوعات کے لحاظ سے متنوع ہے اور اس میں جہاں ان

کے اصل موضوع شہرت و دلچسپی ـــــ فقہ و حدیث، تفسیر اور رجال و تاریخ پر تصانیف شامل ہیں، وہیں فارسی شاعروں کا ایک ضخیم تذکرہ "شمع انجمن" بھی موجود ہے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور اس وقت کے اکابر شعراء، غالب، امام بخش صہبائی، صدرالدین آزردہ اور مصطفیٰ خاں شیفتہ سے انہیں صحبتیں حاصل رہیں۔ ان کا فارسی کلام خود ان کے اپنے مولفہ تذکرہ "شمع انجمن" میں اور ان کے فرزندوں علی حسن خاں اور نورالحسن خاں (۱۸۶۱ء-۱۹۲۳ء) کے مولفہ تذکروں، علی الترتیب "صبح گلشن"[3] اور "نگارستان سخن"[4] میں، اور ان کے ایک دوست اور مقرب مولوی محمد یوسف علی گوپاموی (۱۸۱۳ء-۱۸۹۱ء) مقیم بھوپال کے فرزند محمد مظفر حسین صبا (۱۸۴۲ء-) کے مولفہ تذکرہ "روز روشن"[5] میں شامل ہے[6]۔ یہ سب تذکرے معاصر ہیں اور ایک ہی شہر بلکہ ایک ہی حلقہ میں مرتب ہوئے اور محض چار برسوں کے فرق سے شائع ہوئے۔

ان کے فرزندوں کے مولفہ تذکرے "نگارستان سخن" اور "صبح گلشن" اگرچہ علی الترتیب نورالحسن خاں اور علی حسن خاں کے نام سے شائع ہوئے۔ لیکن خود علی حسن خاں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ تذکرے بھی ان کے والد کے تصنیف کردہ تھے[7]۔ نواب صدیق حسن خاں کا تذکرہ "شمع انجمن" اور ان کے فرزندوں کے مذکورہ دونوں تذکرے[8] آپس میں ایک سلسلہ کی کڑی ہیں اور تتمہ یا تکملہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "نگارستان سخن"، "شمع انجمن" کے تتمہ کے طور پر اس کے ساتھ ہی شائع ہوا تھا اور اس طرح کہ "شمع انجمن" کا صحت نامہ اس میں شامل کیا گیا[9] اور جن شاعروں کا حال و کلام "شمع انجمن" کی تکمیل کے بعد دستیاب ہوا تھا، اسے مرتب کر کے "نگارستان سخن" کی صورت دی گئی تھی۔ خود مولف تذکرہ نے یہ صورت حال بتاتے ہوئے "نگارستان سخن" کی تمہید میں اسے لمعہ "شمع"[10] اور خاتمہ میں تتمہ "شمع انجمن" بیان کیا۔

چوں تتمہ بہر شمع انجمن

کردہ شد انشا بصد حسن مقال

عیسوی تاریخ کو نورالحسن
تازہ حال شاعران باکمال"
(۱۸۷۵ء)

یہی صورت "صبح گلشن" کے ساتھ بھی رہی، جو "نگارستان سخن" کا تکملہ ہے۔ یہاں بھی مولف نے بیان کیا ہے کہ جن شعرا کے تراجم ان دونوں تذکروں میں جگہ نہ پا سکے یا ان میں اضافے کرنا ضروری سمجھے گئے، انہیں اس میں جگہ دی گئی ہے[۲]۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ ان تینوں تذکروں میں جو شاعر جگہ نہ پا سکے، یا ان تراجم کو، جن کی تالیف میں بے جا عبارت آرائی یا غیر ضروری طوالت نظر آئی، مناسب صورت میں ترتیب دینے کے لئے تذکرہ "روز روشن" وجود میں آیا۔ اس تذکرہ کے مولف محمد مظفر حسین صبا کے والد مولوی محمد یوسف علی گوپاموی، نواب شاہجہان بیگم کی سرکار میں بطور منشی وابستہ تھے اور اس لحاظ سے نواب صدیق حسن کے ماتحت بھی تھے[۳]۔ "روز روشن" کی اشاعت کے وقت اس کے مولف کی عمر محض ۱۷ برس تھی[۴]۔

نواب صدیق حسن خاں کے فرزند کی واضح شہادت کے باوجود بھی کہ ان کے اور ان کے بھائی کے نام سے شائع ہونے والے تذکرے ان کے والد ہی کی تصانیف تھے، یوں بھی ان تذکروں کی تالیف و اشاعت کے وقت ان دونوں کی کم عمری[۱۵]، ان کے تذکروں کے اصل مولف ہونے کو مشکوک ٹھہراتی رہی ہے[۱۶]۔ یہی شبہ تذکرہ "روز روشن" کے مولف کے ضمن میں بھی کیا جاتا رہا ہے[۱۷]۔ خود اس تذکرہ کے مولف نے اپنا واحد ماخذ تذکرہ "آفتاب عالمتاب"[۱۸]۔ مولفہ قاضی محمد صادق اختر[۱۹] کو قرار دیا ہے[۲۰] اور "صبح گلشن" کے مولف نے مولوی محمد یوسف علی گوپاموی کی معاونت کا اقرار کیا ہے اور تذکرہ "نشتر عشق"[۲۱] مولفہ آقا محمد قلی خاں

عاشق[۲۲] کو اپنا ماخذ بیان کیا ہے[۲۳]۔

یہ واقعہ ہے کہ نورالحسن خاں اپنے تذکرہ کی تالیف کے وقت اتنے کم سن تھے اور ان کے لئے یہ ایک ایسا وقت تھا' جب حصول علم میں مصروف رہنے کی وجہ سے شاعری بھی قریب قریب ممنوع تھی[۲۴] اور یہ ان کے لئے ذاتی اور آبائی شیوہ کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کی چیز بھی تھی[۲۵]۔ اس صورت میں اور اس مرحلہ میں ایک مبسوط تذکرہ' جس میں پختہ نثر' اشعار کے انتخاب میں بلندی ذوق اور حالات کی ترتیب میں تلاش و جستجو کی کدوکاوش اور جملہ اہتمام .... نمایاں ہوں' تخلیق کرنا امر محال سا نظر آتا ہے[۲۶]۔ پھر اس عمر میں ان کے لئے ان کی شاعری کی پختگی اور قطعات تاریخ کی مہارت بھی حیران کن لگتی ہے۔ ایسا ہی شبہ تو ان کے والد کے تعلق سے بھی بیان میں آچکا ہے کہ عربی اور فارسی کے فقہی' علمی اور دیگر کتابوں کی تصنیف سے انہیں اتنی فرصت کہاں ہو گی کہ تذکرہ شعرا مرتب کر سکیں[۲۷]" یہ بھی کہا جاتا رہا کہ قاضی محمد صادق اختر کا تذکرہ "آفتاب عالمتاب" انہیں دستیاب ہو گیا' جو نہ صرف "شمع انجمن" بلکہ "نگارستان سخن" اور "صبح گلشن" اور ساتھ ہی "روز روشن" کی تالیف میں کام آیا[۲۸]۔

ایک قریبی اور ہم عصر بیان محمد عباس شیروانی رفعت[۲۹] (۱۸۲۶ء–۱۸۹۸ء) کا بھی ہے' جن کے ایک روزنامچہ[۳۰] سے معلوم ہوتا ہے کہ "تذکرۂ روز روشن" .... مولوی یوسف علی لکھنوی نے تذکرۂ آفتاب عالمتاب سے لے کر اپنے بیٹے کے نام سے تالیف کیا ہے[۳۱]۔ رفعت ہی کا بیان ہے کہ "تذکرۂ شمع انجمن" نواب والا جاہ (صدیق حسن خاں) نے سرو آزاد[۳۲]' اور دو تین دوسرے تذکروں سے لے کر لکھا ہے۔ سرو آزاد' کی نظم و نثر اس تذکرہ میں بیشتر نقل کر دی گئی ہے[۳۳]۔ نگارستان سخن "بنام نورالحسن' صبح گلشن" بنام علی حسن پسران نواب صاحب ممدوح و "روز روشن" بنام پسر خود مظفر حسین صاحب مولوی یوسف علی نے لکھے ہیں اور یہ تینوں تذکرے اختر کے تذکرہ "آفتاب عالمتاب" سے

تالیف ہوئے ہیں .... [۳۴]

مولوی محمد یوسف علی کے ان تذکروں کے مولف ہونے کا قیاس بہ تکرار سامنے آیا ہے[۳۵]۔ خود "نگارستان سخن" کے خاتمہ میں مہتمم مطبع کا بیان ہے کہ ان دونوں تذکروں ("شمع انجمن" و "نگارستان سخن") کے مولف (صیغہ واحد!) کو ۱۲۹۲ھ اور ۱۲۹۳ھ میں سفر کلکتہ و دہلی درپیش رہنے کی وجہ سے "مولوی ابوالحامد محمد یوسف علی صاحب کا مدار آستانہ ولی عہد" نے ان کی ترتیب و تہذیب اور فہرست و صحت نامہ کی تیاری کا کام کیا ہے[۳۶]۔ ان دونوں' بلکہ چاروں تذکروں کے "آفتاب عالمتاب" سے ماخوذ ہونے اور ان کی تالیف کے پس پشت مولوی محمد یوسف علی کے ہونے یا نہ ہونے سے قطع نظر ـــــ یہاں تذکرۂ "نگارستان سخن" کے مولف کا تعین مقصود ہے۔ اس تذکرہ کے آخر میں مولف نے اپنے والد کے مولفہ تذکرہ "شمع انجمن" کے ماخذ تو تفصیل سے بیان کئے ہیں' جو اس کا منصب نہیں تھا' لیکن خود اپنے ماخذ کی نشاندہی سے صرف نظر کیا' جو تعجب خیز ہے! ویسے تمہید میں مولف کا یہ بیان معنی خیز ہے کہ اس کے والد کے تذکرۂ "شمع انجمن" کی تالیف کے دوران شعراء معاصرین ڈھاکہ و بنگال کے حالات و کلام کلکتہ سے " مولوی محمد شاہ صاحب متوطن نگینہ نزیل کلکتہ' متوسل واجد علی شاہ اودھ .... " بھیجا کرتے تھے جو مواد اس تذکرہ کی طباعت کے بعد موصول ہوا' اسے "نگارستان سخن" کا نام دے کر اس کے ضمیمہ کی حیثیت دی گئی[۳۷]۔ اس طرح یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ "نگارستان سخن" کا مواد مولوی محمد شاہ کا فراہم کردہ تھا' جسے تہذیب و ترتیب اور جملہ لوازم سے مولوی محمد یوسف علی گوپاموی نے آراستہ کیا۔ یہاں اب اس اصرار کی گنجائش کم ہے کہ خصوصاً اس "نگارستان سخن" کی تالیف خود اس کے موسومہ مولف یا ان کے والد کی کوشش کے بلوصف ہوئی۔ مولوی محمد یوسف علی گوپاموی ان تذکروں کے تعلق سے اور بھوپال میں اپنے قیام کے دوران اپنی علمی و تصنیفی خدمات اور نواب صدیق حسن خاں سے

اپنے روابط کے حوالہ سے معروف ہیں، لیکن مولوی محمد شاہ کے حالات و آثار معروف نہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مولوی محمد شاہ تذکرہ "شمع انجمن" کی تالیف و اشاعت کے عرصہ میں، جو ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء سے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء پر محیط ہے، کلکتہ میں مقیم تھے۔ ان کا وطن نگینہ ضلع بجنور تھا اور وہ ریاست اودھ کے معزول حکمران واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء-۱۸۵۶ء، متوفی ۱۸۸۷ء) کے متوسلین میں تھے۔ نگینہ سے تعلق رکھنے والے ایک محمد شاہ قلندر کا ذکر ملتا ہے، جن کے والد کا نام شیخ احمد علی تھا، جو لکھنؤ کے شاہی توپ خانہ میں گولہ اندازوں میں ملازم تھے۔ ان کے بارے میں محمد علی حیدر مصنف تذکرہ "مشاہیر کاکوری"[۳۸]۔ کا بیان ہے کہ انہیں بزرگوں کی خدمت میں اعتقاد نہ تھا، لیکن بعد ظہور کرامت ایک مجذوب کی خدمت میں ارادۂ بیعت سے تشریف لے گئے، لیکن انہوں نے کاکوری میں شاہ تراب علی قلندر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں شاہ تراب علی قلندر لکھنؤ میں میاں نظامی کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ چنانچہ یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلہ قادریہ میں بتاریخ ۱۷ ذی الحجہ روز دو شنبہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۵ء بیعت کی اور پھر ملازمت ترک کر کے اذکار و اشغال کی تعلیم حاصل کی اور آستانہ عالیہ کاکوری میں رہنے لگے۔ یہیں سو سال سے زائد عمر پاکر ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں انتقال کیا[۳۹]۔

لیکن ایک دوسرے ماخذ میں "شیخ احمد علی ساکن نگینہ" گولہ انداز توپ خانہ شاہی لکھنؤ کے فرزند کا نام شاہ محمد درج ہے[۴۰]۔ ان کے اور مذکورۂ صدر بزرگ کے حالات و واقعات بیعت و ذکر و اشغال میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان دونوں کے ساتھ قیام کلکتہ اور واجد علی شاہ کے متوسلین میں شامل ہونے اور ایسی علمی دلچسپی کی روایت منسوب نہیں کہ انہیں "شمع انجمن" وغیرہ کے لئے مواد فراہم کرنے والی شخصیت کے طور پر دیکھا جا سکے۔

ایک مولوی محمد شاہ کا ذکر خلفائے شاہ احمد سعید مجددی (۱۸۰۲ء-۱۸۶۰ء)

میں ملتا ہے[۴۱]۔ جنہوں نے مولوی سید قمرالدین احمد[۴۲] کے ساتھ مدینہ منورہ میں ان کی خدمت میں حاضری دی تھی اور ان سے بیعت کر کے دو سال ان کی صحبت میں رہے اور قرب حاصل کیا۔ مولانا محمد مظہر مجددی کی تصنیف "مناقب احمدیہ و مقامات سعیدیہ"[۴۳] کی یہ عبارت قابل توجہ ہے۔

"مولوی محمد شاہ و مولوی سید قمرالدین احمد سلمہم اللہ تعالیٰ:

از ساکنان شہر لکھنؤ، خوش استعداد از تلامیذ مولینا نواب صاحب از اوشان وصف حضرت قبلہ شنیدہ، مشتاق لقائی مبارک بودند، چوں آں حضرت بحرمین شریفین فائز گشتند، ایں ہر دو عزیزان بحسب اتفاق وارد آں مقام عالی گردیدند و بحضرت ایشاں رسیدہ بکمال شوق ملازم صحبت بابرکت شدندودوسال استفادہ نمودہ نسبت باطن تا بکملات بروند و خدمت ہائی شائستہ کردہ۔ کمال تقرب بحضرت قبلہ رسانیدند و ازیں نا اہل بنا برغلبہ محبت و شدت مناسبت بامر حضرت ایشاں توجہات بسیار گرفتند و ترقیات نمودند و وقت رخصت ایشاں حضرت قبلہ بسیار محزوں گشتہ۔ فرمودند کہ ایشاں ہر دو بازوئی من بودند۔ حالاً ازمن جدامی شوند و اجازت و خلافت ممتاز گردانیدند"[۴۴]

اس عبارت میں مولوی محمد شاہ کا شاگرد "مولینا نواب صاحب" ہونا، بہت سے اسرار وا کرتا ہے۔ یہ مولانا نواب صاحب بھی شاہ احمد سعید مجددی سے بیعت تھے اور ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں حرمین میں مقیم تھے۔ صوفی مشرب تھے اور وحدت الوجود ان کا محبوب موضوع تھا۔ علم کلام سے بھی خاص رغبت تھی چنانچہ ان کا شمار علمائے مکہ میں متکلمین میں ہونے لگا تھا[۴۵] ان کے شاگردوں میں مولوی محمد شاہ کے علاوہ حکیم سید فرزند علی، افسرالاطباء

بھوپال کا نام بھی ملتا ہے[۴۶]۔ یہاں مولوی محمد شاہ اور حکیم سید فرزند علی کی ہم مکتبی کا ایک ایسا رشتہ استوار ہوا جو بعد میں بڑھ کر قریبی و مثالی دوستی کی صورت میں تاحیات باقی رہا۔ ملا نواب کے علاوہ ان دونوں کا مفتی سعد اللہ (۱۸۰۴ء۔۱۸۷۷ء)[۴۷] کے درس میں بھی ساتھ رہا اور یہ دونوں ان کے علم و فضل سے مستفیض ہوئے۔ مولوی محمد شاہ نے بعد میں دہلی جا کر مفتی قصدر الدین خاں آزردہ سے، جو مفتی سعداللہ کے بھی استاد تھے، علم کلام اور بعض دیگر علوم کی تحصیل کی[۴۸]۔ حصول و فراغت علمی کے بعد ان کے واجد علی شاہ کی ملازمت اختیار کرنے اور واجد علی شاہ کے ساتھ لکھنؤ سے کلکتہ منتقل ہونے کی تصدیق حکیم سید فرزند علی کے توسط سے ہوتی ہے۔ حکیم سید فرزند علی کو بھوپال میں شاہی طبیب کی حیثیت میں افسرالاطباء ہونے کے باعث ممتاز مقام حاصل رہا۔ جب نواب شاہجہاں بیگم اپنے شوہر نواب صدیق حسن خاں کے ساتھ کلکتہ دربار میں، جو شاہ ایڈورڈ ہفتم کی ہندوستان آمد کے موقع پر ۱۸۷۵ء میں منعقد ہوا تھا، دیگر سربراہان ریاست کے ساتھ شرکت کے لئے مدعو کی گئیں، تو حکیم فرزند علی بھی کلکتہ میں ان کے ساتھ رہے۔ وہاں کے دوران قیام انہوں نے مولوی محمد شاہ کے توسط سے نواب صدیق حسن خاں کی واجد علی شاہ سے ملاقات کا اہتمام کروایا تھا[۴۹]

نواب صدیق حسن خاں کا کلکتہ کا غالباً یہی وہ سفر تھا، جب "شمع انجمن" زیر ترتیب تھا۔ یہاں ان کی مولوی محمد شاہ سے ملاقات خاصی سود مند ثابت ہوئی، جس کے فوائد انہیں بعد میں بھی حاصل ہوتے رہے۔ جس کا ایک ثبوت "شمع انجمن" اور "نگارستان سخن" کے لئے مولوی محمد شاہ کی جانب سے مواد کی فراہمی سے ملتا ہے۔

مولوی محمد شاہ کا آبائی وطن نگینہ اور والد کا نام احمد علی تھا۔ لیکن یہ وہ شیخ احمد علی نہیں، جن کا تذکرہ سطور بالا میں آیا ہے۔ مولانا احمد علی اپنے وطن نگینہ

سے نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء۔۱۸۳۷ء) کے عہد آخر میں لکھنؤ جا کر پچاس روپے ماہانہ پر مکانات شاہی کے بندوبست پر مامور ہوئے اور بعد میں دفتر انشا میں خدمت انجام دینے لگے۔ شاہی توپ خانہ کے گولہ اندازوں میں ملازم ہونے کی روایت ان سے منسوب نہیں۔ مولانا احمد علی نے اپنے ورثاء میں دو دختر اور دو فرزند یادگار چھوڑے۔ بیٹوں میں ایک مولوی محمد شاہ اور دوسرے مولوی عبدالحق[۵۰] تھے۔ بیٹیاں دونوں چھوٹی تھیں اور لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ مولانا احمد علی دفتر انشا میں۔ منشی بے بدل سمجھے گئے۔ چنانچہ مولوی محمد شاہ نے فن انشا پردازی میں اپنے والد کی پیروی کی اور خود بھی اس فن میں ممتاز و معتبر ہوئے۔ ان کی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی اور اولاً مفتی سعداللہ اور حکیم ملا نواب سے درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں دہلی جا کر علم کلام اور بعض دیگر علوم کی تکمیل مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی شاگردی میں کی۔ فراغت تعلیم کے بعد یہ واجد علی شاہ کی ملازمت میں دارالانشا سے منسلک ہو گئے اور انتزاع ریاست کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے۔ کلکتہ کے دوران قیام واجد علی شاہ مختلف نشیب و فراز اور سانحات سے گزرے اور اس وجہ سے ان کے مصاحب اور ملازم مقرر اور سبکدوش یا علیحدہ ہوتے رہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مولوی محمد شاہ کو کبھی علیحدہ نہ ہونے دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مولوی محمد شاہ واجد علی شاہ کے بعض مصاحبیں اور مشیروں کے حسد اور ریشہ دوانیوں کے باعث واجد علی شاہ کی ملازمت سے کشیدہ خاطر ہو کر بھوپال چلے گئے تھے، جہاں ان کے بچپن کے دوست حکیم سید فرزند علی نے نواب شاہجہاں بیگم سے سفارش کر کے انہیں ایک اچھے عہدہ پر ملازم رکھوا دیا تھا، لیکن جب مولوی محمد شاہ اپنے متعلقین کو لینے کے لئے کلکتہ گئے تو واجد علی شاہ اور ان کے مدارالمہام وزیر السلطان نواب محمد امیر علی خاں (۱۸۱۰ء۔۱۸۷۹ء)[۵۱] نے انہیں روک لیا اور بہ اضافہ تنخواہ بلا شرط خدمت، عہدۂ مشاورت پر فائز کر دیا، چنانچہ یہ بھوپال منتقل نہ ہو سکے[۵۲]۔ پھر ایک اور موقع پر انہوں نے ریاست حیدر

آباد میں نواب سالار جنگ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان کے ایک چچا زاد بھائی مولوی حسن رضا وہاں مفتی عدالت خورد اور رکن شوریٰ تھے۔ سالار جنگ ان کے بہت قدرداں تھے۔ ان کی سفارش پر مولوی محمد شاہ وہاں تین سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے تھے' لیکن وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی اور مرض بواسیر' جو انہیں لاحق تھا' اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ ہلاکت کا اندیشہ ہو گیا۔ نواب سالار جنگ ان کی لیاقت کے اس قدر معترف ہو گئے تھے کہ ان کی علیحدگی گوارا نہ تھی' چنانچہ یہ ان کی اطلاع کے بغیر واپس کلکتہ چلے گئے[۵۳]۔

انتزاع ریاست اودھ کے بعد' اودھ کا مقدمہ پیش کرنے اور دیگر معاملات کے تعلق سے جب معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ نے اپنی والدہ عالیہ ملکہ کشور (متوفی ۱۸۵۷ء) اور اپنے بھائی مرزا سکندر حشمت (متوفی ۱۸۵۷ء) اور ولی عہد کیواں قدر مرزا محمد حامد علی (متوفی ۱۸۷۴ء) کو لندن روانہ کیا تو اس شاہی قافلہ کے ساتھ جو افراد شامل تھے ان میں مولوی محمد شاہ کے شریک سفر رہنے کا بھی ذکر کیا گیا ہے[۵۴] اور یہ بھی کہ وہ لندن سے راست ہندوستان آنے کے بجائے راستہ میں حجاز مقدس رک گئے تھے اور وہاں تین سال قیام کیا اور اس عرصہ میں وہاں شاہ احمد سعید مجددی سے بیعت کی اور ان کی صحبت میں مقامات سلوک طے کیے[۵۵]۔

اگرچہ واجد علی شاہ کی ملازمت میں وہ زیادہ تر دارالانشا میں خدمات انجام دیتے رہے' جو بعد میں عہدۂ مشاورت میں مرتکز ہو گئی تھی' لیکن وہ محل خاص کے منشی اور ڈیوڑھی کے منصرم اور پھر شہزادہ مرزا محمد ہزبر علی (۱۸۴۵ء-۱۸۸۶ء)[۵۶] کے اتالیق و نگران اور وکیل مطلق پر مقرر ہوئے اور ساتھ ہی شہزادہ کے کلام پر اصلاح بھی دیتے رہے۔ مولوی محمد شاہ کے لئے' ان کی علمی و تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لحاظ سے' شاید یہی زیادہ اچھا رہا جب وہ شہزادہ ہزبر علی کے متوسل رہے۔ یہاں ان کی وابستگی کی نوعیت ایک درباری ملازم کے بجائے ایک اتالیق اور استاد سخن کی تھی۔ شہزادہ سے ان کا یہ ربط اس وقت مزید گہرا ہوا

تھا جب وہ وزیر السلطان نواب امیر علی خاں کے، ایک مذہبی رسالہ کے رد عمل میں کہ جس میں صحابہ کرام کی شان کے خلاف کچھ نازیبا کلمات شامل تھے اور اہل سنت میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا' ناخوش ہو کر واجد علی شاہ کی ملازمت سے علیحدہ ہو گئے تھے[۵۷] اور شہزادہ ہزبر علی نے انہیں اپنے دربار کے جملہ امور کا مختار بنا کر انہیں اپنے ساتھ زیادہ قریب کر لیا تھا۔ چوں کہ انتہائی ذہین اور لائق بیان کئے جاتے ہیں' اس لئے اپنی ذہانت اور لیاقت سے ایسے متعدد کام کئے' جو واجد علی شاہ اور شہزادہ ہزبر کو مطمئن کرنے اور انہیں مشکلات سے نجات دلانے کا باعث بنے[۵۸] ۔ ان ہی کی کوششوں کے بلوصف شہزادہ کے وظیفہ کی رقم میں اضافہ ہوا اور اس طرح معاشی فراغت کے سبب شہزادہ کے دربار کی رونق بڑھ گئی۔ اگرچہ ان کا اثر و رسوخ دیگر حاضرین دربار و مصاحبین کو شاق گزرتا اور وہ مذہبی تعصب کے تحت غلط اتہامات بھی ان پر لگاتے تھے اور وہ خود بھی ان ریشہ دوانیوں سے عاجز آ کر کنارہ کشی پر آمادہ تھے' لیکن ایک تو ان کا یہ احساس فرض کہ وہ ان سازشیوں میں کس طرح شہزادہ کو تنہا چھوڑ دیں اور دوسرے خود شہزادہ نے انہیں اپنے دربار سے الگ ہونے نہ دیا اور تا عمر ان کا پاس و لحاظ رکھا[۵۹] تنخواہ کے علاوہ سو روپیہ ماہوار اور باورچی خانہ مع مصارف ان کے سپرد تھا۔ چنانچہ مولوی محمد شاہ نے اپنے انتقال تک فراغت معاش کے ساتھ زندگی بسر کی[۶۰]۔ اس عرصہ میں ان کی توجہ اور کوشش کی وجہ سے شہزادہ کے دربار کی رونق کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ خود ان کا اپنا مکان کلکتہ میں اہل علم و کمال کی توجہ اور صحبتوں کا مرکز بن گیا۔ اور ان کی قابلیت اور مروت کی شہرت عام ہوئی۔

فن انشا میں مہارت تامہ کے ساتھ ساتھ مولوی محمد شاہ کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ ان کے بھتیجے مولوی فضل حق کا بیان ہے اور ان کے دستیاب کلام میں بھی نظر آتا ہے کہ انہوں نے تخلص اختیار نہیں کیا[۶۱] لیکن واجد علی شاہ کے " کلیات معلیٰ " میں ان کے قطعات تاریخ شامل ہیں' جن پر ان کے نام کے ساتھ "

فقیر" تخلص موجود ہے[۶۲]۔ مگر ان کا بیشتر کلام تخلص کے بغیر ہے، جس کے بارے میں ان کے بھتیجے کا بیان ہے کہ اس پر وہ کسی اور کا تخلص استعمال کر کے اس کے نام سے شائع کروا دیتے تھے۔ چنانچہ "دیوان ہزبر" بھی ان ہی کا تخلیق کردہ ہے[۶۳] جو "جودت تعشق" کے نام سے ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں شہزادہ کی ۲۱ سالہ عمر میں مرتب ہو گیا تھا اور ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء میں مطبع نظامی، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کی طباعت اور جملہ لوازم کا اہتمام مولوی محمد شاہ نے کیا تھا، چنانچہ خاتمہ میں ان کے ساتھ "فضائل و کمالات مآب مولانا مولوی محمد شاہ صاحب مینجر سرکار فیض آثار تحریر ہے، اور ان کے فارسی قطعات تاریخ بھی شامل ہیں[۶۴]۔ شہزادہ ہزبر علی آغاز شاعری میں اپنے والد سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے، لیکن پھر مولوی محمد شاہ سے اصلاح لینے لگے تھے۔

مولوی فضل حق کا بیان ہے کہ مولوی محمد شاہ اپنے کلام کی طرح اپنی نثری تصانیف کی جانب سے بھی خاصے بے نیاز تھے۔ جہاں اپنا متعدد کلام دوسروں کے نام سے شائع کروا دیا، ان کی کئی تصانیف بھی دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں[۶۵]۔ مثلاً" ان کے برادر نسبتی مولوی سید قمرالدین احمد کے نام سے شائع ہونے والی تصنیف "برہان لائح فی تحقیق امرالذبائح" جو اردو میں فقہی مسئلہ پر ہے، مولوی محمد شاہ کی لکھی ہوئی ہے[۶۶]۔ اسی طرح انہوں نے اپنی ایک تصنیف "تعلیم العبادات" کو کشتیا[۶۷] کے ایک علم دوست جج کے نام سے طبع کرایا[۶۸]

وزیرالسلطان نواب امیر علی خاں کی تصنیف "وزیرنامہ"[۶۹] بھی ان کے زور قلم کا نتیجہ تھی[۷۰]، لیکن خود ان کے نام سے بھی تصانیف موجود ہیں۔ جن میں سے ایک "حج انج مسمی بہ غایت الشعور" ہے، جو اولاً" کلکتہ اور دوسری بار لکھنؤ سے شائع ہوئی[۷۱]۔ اس کا تعلق مسائل و مناسک حج اور ان کے حوالہ سے سوالات و اعتراضات کے جواب و تشریح پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے اس کی نوعیت مناظراتی ہے[۷۲]، لیکن مولانا امداد صابری نے اسے "عیسائیوں کے شبہات کا بہترین جواب"

قرار دے کر اسے رد عیسائیت کے ذیل میں شمار کیا ہے[73]۔ ان کی دوسری کتاب "الجوبہ عجیبہ" کثرت ازواج و طلاق پر لگائے جانے والے الزامات کے جواب میں تحقیق تصنیف ہے[74] اور تیسری کتاب "فیض معظم" ہے، جس میں بہشت کی نعمتوں کا ذکر ہے اور یہ معترضین کے اعتراضات کے جواب میں ہے[75]۔

جب مولوی محمد شاہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے فرائض منصبی میں انتظامی ذمہ داریوں کے شامل ہو جانے کے باعث اور اپنی بیماری اور دیگر ذاتی معاملات و مسائل میں الجھنے کی وجہ سے کچھ لکھ نہ پاتے تو "ہر چہار طرف سے کوتاہ قلمی کی شکایتیں" ہونے لگتیں[76]، جو ان کی جانب سے دوسروں کی قلمی فرمائشیں پوری کرنے کا مظہر ہے۔ کلکتہ کے دوران قیام ان کے روابط وہاں کے اکابر و معززین سے استوار ہے۔ تذکرہ "شمع انجمن" اور "نگارستان سخن" میں کلکتہ و مرشد آباد اور اضلاع بنگال کے جن معاصر شعراء کے حالات شامل ہیں، ان کے فراہم کردہ ہونے کے باعث، وہاں ان کے روابط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس وقت کے ممتاز بنگالی مسلمان رہنما نواب خان بہادر عبداللطیف (۱۸۲۸ء۔۱۸۹۳ء) سے بھی ان کے قریبی مراسم تھے[77]۔ ان کے حالات اور ان کے مکاتیب سے، جو "گنجینہ سلیمانی" میں شامل ہیں[78]، ان کے اوصاف، شخصی خوبیوں، ان کی خدمات اور ان کی وضع داری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے انتقال پر، جو ۱۸ صفر ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء بروز دو شنبہ، بعارضہ اسہال کبدی و زیادتی بواسیر ہوا[79]، ایک زمانہ نے اس پر رنج و الم کا اظہار کیا۔ اخبارات نے تعزیتی شذرات شائع کئے اور شعراء نے مرثیے لکھے۔ ایک طویل مرثیہ اور قطعہ تاریخ مولوی صوفی فتح علی نے تحریر کیا، جو مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوئے[80]۔

مبینہ طور پر دوسروں کے لئے لکھے ہوئے ان کے کلام سے قطع نظر، مولوی محمد شاہ کی شعر گوئی کا اندازہ ان کے درج ذیل دستیاب کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔

حمد[81]

بنام خداوند نعم المعید
پدید آور ہر چہ شد نا پدید
گہے نو یزیدے پدید آورد
حسینے پئے آں یزید آورد
گہے تازہ فرعون پیدا کند
برو موسی نو ہویدا کند
خدائے کہ در عرصہ امتحاں
برو تیغ حکمش سر دوستاں
حلیمے کہ بیند بسا ظلم جور
جفا کارگازرا نگیرد بفور
خدائے توانا خدائے قدیر
خدائے سمیع و خدائے بصیر
بساں دوستاں را کشد بے گناہ
بسا دشمنا نرا دہد مال و جاہ
نجستہ نصیبے ز اہل شعور
کہ آید ز قہر و بلایش صبور

نعت[82]

پس از حمد حق است نعت رسول
شود تا کلامم قرین قبول
امام رسل خاتم الانبیاء

شہ ہر دو عالم وزیر خدا
رسول امم پیشوائے سبل
حبیب خدا باعث جزو کل
زہے عبد مقبول خاص خدا
کزاں بندگی شہ خداوند ما
رسولے کہ قرآن اعجاز اوست
امینے کہ جبریل ہمراز اوست
رسولے کہ اصحاب و آلش تمام
بود خلق را مقتداء انام

قطعہ ۸۳ تاریخ فکر صائب مولوی محمد شاہ متخلص .فقیر ملازم حضرت سلطان عالم اعلاء اللہ ملکہ۔

طبع المولفات لسط اننا الصفی
قد صار کاملا فهوالاجمل الوفی
عن عامه سئلت فقیرا فقط اجاب
للہ در جبهد ہذا المصنف

ولہ ایضاً

جان عالم خسرو ملک سخن
سایہ سبحان و ظل ذوالمنن
آنکہ در علم و ہنر استاد عصر
و آنکہ در شعر و سخن یکتائے فن
آنکہ باشد از کمال آب و تاب

ہر کلامش غیرت در عدن
و آنکہ خاقانی بہ پیشش آمدہ
در دبستان ادب زانو شکن
انوری را کے بود با او فروغ
کے زند دم پیش بلبل بوالحزن
صاحب لیلیٰ و مجنوں گشتہ است
گفتہ شیرین او را کوہکن
جملہ تصنیفات آں عالی جناب
از بلاغت ہست یکسر حرف زن
کلیاتش زیور طبع عجیب
کرد تا مثل عروساں زیب تن
از کمال زیب و زینت آمدہ
ہر سواد صفحہ اش رشک چمن
آفریں بر حافظ عبدالغنی
بخشی خاص شہ والائے من
کز پئے تعمیل حکم پادشاہ
خود چساں شد بہر طبعش قطرہ زن
یادگار سال طبعش از فقیر
ہست تصنیفات سلطان زمن

ولہ ایضاً

سلطان عالم شاہ معظم

حسان عہد و سحبان ثانی
دیوان نغزے تصنیف فرمود
خوشتر ز رنگ عہد جوانی
از راہ سالش ہاتف ندا کرد
شاہا گرفتی ملک معانی

(۱۲۷۸ھ)

تقریظ[۸۲] از نتائج افکار گہربار جناب فضائل و کمالات مآب مولانا مولوی محمد شاہ صاحب مینجر سرکار فیض آثار حضور پرنور عالی جناب حضرت مصنف معلی القاب۔

اگر بدیدۂ انصاف بنی ایں دیوان
دگر دلت نکشاید بہ سیر باغ جنان
نکوترین کلام سخنوران گزین
گزیں ترین دواوین شاعران جہان
اگرچہ شعر بحکمت ستودنی نبود
ولی سفینہ این نظم را ستود توان
ستودنی ست کلام و ستودنی شاعر
ہژبر بیشہ جود و کرامت و احسان
ستود خوی پسندیدہ گوی و عالی طبع
شگفتہ روی و کشادہ جبین و لب خنداں
بگفتہ گہرین کاسد بہای درست
بمنطق شکرین شہد راست کاسر شان
اگر ز صاحب دیوان سخن ہمی پرسے
دگر سوال کنی از فصاحت دیوان

هم انت فخر همه ناظمان روے زمین
هم اینت فخر همه نظمهائے اہل زمان
سخن سرائے ختم ست بر ہزبر چنانکہ
سخا بحاتم و ۔ گردی برستم دستان
مدیح او نبود کار کلک ہر مداح
توان شمارهٔ اوصاف او ولا نتوان
نہ ممکن ست کہ اوصاف او کنم تحریر
کہ نزد عقل محالست و خارج از امکان
تواں شمارهٔ عشری زمد حتش کردن
اگر شمرد توان ذره ہائے ریگستان
اگر شمرد توان موجہائے عمان را
دران زمان کہ وزد تند باد برعمان
وگر شمرد توان قطره ہائے باران را
درآن زمان کہ بہ تندی فرارسد باران
بنظم او نرسد نظم سعدی و حافظ
بہ شعر او نرسد شعر اعشی و حسان
اگرچہ کلک مرا نظم کار آسانست
ولیک نیست شمار کمال او آسان
دم از مدیحش اگر انوری زدی اورا
میان مردم دانا لقب شدی نادان
خجل شدی و بعجز اعتراف آوردی
زبان کشادی در مدح او اگر سحبان
ثنای او بنو یسم مرا کجاست مجال

مدیح او بسرایم مرا کجاست زبان
چو وصف او نتوانم کنم یکے ز ہزار
مرا بعجز و زبونی خود بدست ہمان
کہ دست عجز و ضراعت برآورم عابد
پے درازی عمرش بحضرت یزدان
خداش ملک سلیمان و عمر خضر دہاد
بقاش بادا وابستہ با بقائے جہان
ہمیشہ تا کہ بود ابر تیرہ و مظلم
ہمیشہ تا کہ بود مہر روشن و تابان
رخ عدوئے تو شاہا سیاہ چوں شب باد
دل حبیب تو بادا چو روز نور افشان
ہمیشہ دشمن تو باد با دل غم ناک
ہمیشہ خوش دل و مسرور باشی و شادان
ہمیشہ رحمت یزدان رفیق حال تو باد
کہ دولتے نبود بہ ز رحمت یزدان

تاریخ[۸۵] طبع دیوان بلاغت عنوان ایضاً" از جناب مولانا ممدوح

سخن دفتر دوا وینش فرامین
شہ فرماں روائش خسرو دین
ملک زادہ فریدوں قدر سلطان
سر و سر دفتر ارباب تمکین
شہ شاہان اقلیم فصاحت
ہژبر بیشہ خلق مضامین
بر آں جملہ دواوین است طغرا

گزیں دیوان آں شاہ خوش آئین
کہ طغرای دواوین گشت نامش
منزل ز آسمان مدح و تحسین
بجو تاریخ ۱۲۹۷ھ طبعش ہم ازیں نام
کہ سال ہجریش را ہست تبئین
الٰہی عمر و اقبال شہ ما
فزوں باد از حد و احصائے تعین
وزیں دیوان دواوین را بود زیب
لطغرا تا بود زیب فرامین

حواشی

۱۔ مطبوعہ : لکھنؤ' ۱۹۲۴ء خود نوشتہ کے لئے "اتحاف النبلاء المتقین" (کانپور' ۱۸۷۲ء) ص ۲۴۳۔۲۷۱' "شمع انجمن" (بھوپال' ۱۲۹۳ھ) ص ۴۷۴۔۴۸۶' و نیز : شاہجہاں بیگم' "تاج الاقبال تاریخ بھوپال" انگریزی ترجمہ H. C. BARSTOW (کلکتہ' ۱۸۷۶ء) ص ۱۴۹ ۔ ۱۵۹' سعید اللہ
"The Life and Works of Siddique Hasan Khan, Nawab of Bhopal"
(لاہور' ۱۹۷۳ء) رضیہ حامد "نواب صدیق حسن خاں" (بھوپال' ۱۹۸۳ء) بھی مفصل ہیں۔

۲۔ "مآثر صدیقی" ضمیمہ ص ۱۔۲۰' "ENCYCLOPEDIA OF ISLAM" (لائیڈن' ۱۹۳۴ء) جلد ۴' ص ۴۰۳' یہ فہرست عملی کی ۴۷' فارسی کی ۴۵ اور اردو کی ۱۰۳ کتابوں پر مشتمل ہے' جس میں ۲۵ غیر مطبوعہ ہیں۔

۳۔ مطبوعہ : بھوپال' ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء

۴۔ مطبوعہ : بھوپال' ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء

۵۔ مطبوعہ : بھوپال' ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء

۶۔ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے فرزند علی حسن خاں نے اپنے مولفہ اردو شاعروں کے تذکرہ "بزم سخن" (آگرہ' ۱۲۹۸ھ) میں ان کے چند اردو شعر بطور نمونہ درج کئے ہیں۔ ص ۱۱۷۔

۷۔ "مآثر صدیقی" ضمیمہ ص ۱۴' ۱۹' اور ایسی ہی مزید ۱۳ تصانیف ہیں' جو انہوں نے اپنے فرزندوں کے نام سے تصنیف کیں۔ جب کہ ایک تصنیف "حدث الغاشیہ من الفتن الخالیہ و الفاشیہ" (اردو) مطبوعہ بھوپال' میر عبدالحیٔ خاں کے نام سے لکھی۔ (ضمیمہ ص ۷) تذکرہ نگارستان سخن کے مہتمم مطبع نے اپنی اختتامی عبارت میں معذرت کی ہے کہ یہ دونوں تذکرے ("شمع انجمن" و "نگارستان سخن") مولف کی نظر ثانی کے بغیر شائع کئے جا رہے ہیں کیونکہ ان ہی دنوں "مولف" کو سفر کلکتہ و دہلی درپیش تھا۔ ص ۲۰۶۔ یہاں لفظ "مولف" صیغہ واحد میں استعمال کیا گیا ہے اور مولف نگارستان سخن نے اختتامیہ میں سفر پر اپنی روانگی کے باعث "شمع انجمن" پر نظر ثانی نہ کر سکنے پر

اظہار افسوس کیا ہے۔ ص ۲۴۲

۸۔ جب کہ نورالحسن خاں سے تذکروں میں شعرائے اردو کا بھی ایک تذکرہ "طور کلیم" (آگرہ' ۱۲۹۸ھ) اور ان کے بھائی علی حسن خاں سے بھی شعرائے اردو کا ایک تذکرہ " بزم سخن" یادگار ہیں۔ علی حسن خاں نے اپنے اس تذکرہ کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ یہ تذکرہ انہوں نے اپنے والد کی فرمائش پر لکھا ہے' ورنہ نہ وہ اس کے اہل تھے نہ اس جانب رغبت رکھتے تھے۔ ص ۳' ان دونوں بھائیوں کی مزید تصانیف کا ذکر ذیل میں آتا ہے۔

۹۔ ص ۲۰۷

۱۰۔ ص ۳

۱۱۔ ۲۰۴

۱۲۔ "صبح گلشن" ص ۲' ان دو تذکروں اور "مآثر صدیقی" کے علاوہ علی حسن خاں سے "خرمن گل" (فارسی دیوان) "نالہ دل" (اردو دیوان) کے علاوہ چار مزید اردو کتابیں " فطرت الاسلام" "سیرت الاسلام" المدنیہ فی الاسلام" اور "انتظام خانہ داری" اور ایک فارسی کتاب "البنیان المرصوص من بیان الحجاز الفقہ المنصوص" (مطبوعہ : ۱۲۹۹ھ) بھی موسوم ہیں۔ تفصیلات کے لئے ۔ سی ۔ اے ۔ اسٹوری

"Persian Literature A Bio-Bibliographical Survey" جلد اول' حصہ دوم (لندن' ۱۹۷۲ء) ص ۹۱۴-۹۱۵

۱۳۔ "کارپرداز آستانہ علیہ ولی عہد ریاست" "صبح گلشن" ص ۳' تفصیلی حالات کے لئے : ایضا" ص ۴۹'۳۲' "شمع انجمن" ص ۵۴۳-۵۴۷ "نگارستان سخن" ص ۱۵۲-۱۵۶' "روز روشن" ص ۷۹۹-۸۱۱' ونیز : سید عبدالحئ "نزہتہ الخواطر" جلد ۸ (کراچی' ۱۹۷۶ء) ص ۵۲۸' رضیہ حامد' تصنیف مذکور' ص ۱۸۰-۱۸۱۔

۱۴۔ "روز روشن" دیباچہ' ونیز خود اپنے احوال کے ذیل میں اپنی عمر ۱۷ سال بتائی ہے' ص ۳۸۰۔

۱۵۔ نورالحسن خاں' یکم رجب ۱۲۷۸ھ کو پیدا ہوئے اور ان کا تذکرہ ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوا' جب ان کی عمر ۱۵ سال تھی "شمع انجمن" ص ۴۸۶' اور علی حسن خاں ۷ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ کو پیدا ہوئے تھے اور ان کا تذکرہ ان کی ۱۱ سال کی عمر میں ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوا تھا۔ "صبح گلشن" ص ۲۰۸

۱۶۔ "روز روشن" (مطبوعہ : تہران، ۱۳۴۳) ص د، عطا کاکوی "تذکرہ شمع انجمن مع نگارستان سخن" تلخیص و ترجمہ، (پٹنہ، ۱۹۶۸ء) ص ۴، یہی مصنف، "صبح گلشن" تلخیص و ترجمہ (پٹنہ، ۱۹۶۸ء) ص ۴، علی رضا نقوی "تذکرہ نویسی فارسی در ہندوپاکستان" (تہران، ۱۹۶۴ء) ص ۶۰۶ ـ ۶۱۱، احمد گلچین معانی "تاریخ تذکرہ ہائی فارسی" (تہران، ۱۳۴۳) جلد اول ص ۷۵۷، جلد دوم، ص ۴۰۲۔۴۰۳

۱۷۔ ایضاً، جلد اول، ص ۱۷، و نیز عطا کاکوی، تصانیف مذکور، دیباچے۔

۱۸۔ ایک جامع تعارف کے لئے : شریف حسین قاسمی "تذکرہ آفتاب عالمتاب" مقالہ مشمولہ "غالب نامہ" (دہلی، جولائی ۱۹۸۲ء) و نیز احمد گلچین معانی، تصنیف مذکور، جلد اول، ص ۱۷۔۱۹۔

۱۹۔ حالات و آثار کے لئے : شریف حسین قاسمی، مقالہ مذکورہ، احمد گلچین معانی، تصنیف مذکور، جلد اول، ص ۱۷۔ ۱۹، و نیز متعدد ہم عصر ماخذ، مثلاً "شمع انجمن" ص ۴۳۔۴۴، "روز روشن" ص ۳۷۔۴۰، سعادت خاں ناصر "خوش معرکہ زیبا" مرتبہ مشفق خواجہ، جلد اول (لاہور، ۱۹۷۰ء) ص ۳۰۱۔۳۰۲، ۳۰۲، ذوالفقار علی مست "ریاض الوفاق" (تبریز، ۱۳۴۳) ص ۶۔۷، ابن امین اللہ طوفان "تذکرہ ابن طوفان" مرتبہ قاضی عبدالودود (پٹنہ، ۱۹۵۴ء) ص ۶۰۔۶۵، عبدالغفور نساخ "سخن شعراء" (لکھنؤ، ۱۸۷۴ء) ص ۱۶۔۱۷، احمد منزوی "ادبیات فارسی برمبنای تالیف استوری" (ترجمہ یو۔ا۔ برگل) جلد اول (تہران، ۱۳۴۳) ص ۶۷۹۔۶۸۰

۲۰۔ ص ۴۔

۲۱۔ تفصیلات کے لئے : علی رضا نقوی، تصنیف مذکور، ص ۵۱۵۔۵۲۰، احمد گلچین معانی، تصنیف مذکور، جلد دوم، ص ۳۵۷۔۳۶۰۔

۲۲۔ حالات کے لئے : ایضاً دونوں مصنفین، و نیز "نگارستان سخن" ص ۵۹، "صبح گلشن" ص ۲۷۱۔۲۷۳

۲۳۔ ص ۳۔

۲۴۔ اگرچہ وہ کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے "شمع انجمن" ص ۴۸۶

۲۵۔ پھر بھی ریختہ میں کبھی کبھی شعر موزوں کیا کرتے تھے، "نگارستان سخن" ص ۱۳۲، حالانکہ فارسی میں بھی ان کے متعدد قطعات "نگارستان سخن" کے آخر میں شامل ہیں، ص ۲۰۳۔۲۰۴

۲۶۔ خصوصاً" بعض قدیم اکابر شعرائے ایران و ہند کے بارے میں جو ذاتی تاثرات اس کم سن مولف نے قلم بند کئے ہیں' ان کے باعث ۔ احمد گلچین معانی' تصنیف مذکور' جلد اول' ص ۴۰۶' جب کہ اسی کم سنی کے دور میں ان کے نام سے صرف یہی ایک تذکرہ یا مذکورہ اردو تذکرہ نہیں' اور دیگر تصانیف بھی منسوب ہیں۔ اسٹوری (تصنیف مذکور ص ۹۱۳۔۹۱۴) نے مختلف ماخذ کے حوالہ سے ان پانچ اور تصانیف کی تفصیلات دی ہیں۔ (۱) "عرف الجدی من جنان اہدی الہادی" (مطبوعہ : بھوپال' ۱۲۹۶ھ) (۲) النہج المقبول من شرع الرسول" (مطبوعہ ۱۲۹۶ھ) (۳) الجوائز و الصلوۃ من جمع الاسامی والصفات (مطبوعہ دہلی' ۱۲۹۷ھ) (۴) الرحمت المہدی علی من یرید زیادۃ العلم علی احادیث المشکوۃ (عربی)' (مطبوعہ : ۱۳۰۱ھ) (۵) سلطان الاذکار من احادیث سید الابرار" (مطبوعہ : حیدر آباد' ۱۳۱۸ھ)

۲۷۔ عطا کاکوی' تصانیف مذکور' دیباچہ

۲۸۔ ایضاً" "شمع انجمن مع نگارستان سخن" ص ۵' جب کہ مولف "روز روشن" نے خود اس کو اپنے تذکرہ کا ماخذ بیان کیا ہے' ص ۴' "آفتاب عالمتاب" ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں مرتب ہوا تھا' لیکن اس میں مولف "روز روشن" کا ذکر شامل ہونے سے احتمال ہوتا ہے کہ مولف "آفتاب عالمتاب" بھوپال میں موجود تھے۔ احمد گلچین معانی' تصنیف مذکور' جلد اول' ص ۱۷

۲۹۔ حالات کے لئے "شمع انجمن" ص ۱۸۲۔۱۸۳ "صبح گلشن" ص ۱۸۰۔۱۸۲' سید محمد ممتاز علی حافظ "آثار الشعراء" (بھوپال' ۱۳۰۴ھ) ص ۱۱۱۔۱۲۶' مالک رام "تلامذہ غالب" (دہلی' ۱۹۸۴ء) ص ۲۱۴۔۲۱۵۔

۳۰۔ مملوکہ : کلی داس گپتا رضا (بمبئی)' جنھوں نے اس کے متعدد اقتباسات نقل کئے ہیں' مشمولہ "غالبیات' چند عنوانات" (بمبئی' ۱۹۸۲ء) ص ۸۵۔۱۰۷

۳۱۔ ایضاً" ص ۹۱

۳۲۔ معروف تذکرۂ شعرا و مشاہیر' مصنفہ' غلام علی آزاد بلگرامی' مطبوعہ' لاہور ۱۹۱۳ء

۳۳۔ "شمع انجمن" کے بارے میں بھی ان کا بیان تحقیق کا متقاضی ہے۔ کیونکہ مولف "نگارستان سخن" نے اختتامیہ میں "شمع انجمن" کے ماخذ کی ایک فہرست درج کی ہے' ص ۲۴۰۔۲۴۲' جو داخلی شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اگرچہ خود "شمع انجمن" میں اس کے ماخذ کی خصوصیت سے نشاندہی نہیں کی گئی ہے' لیکن چند تراجم کے ذیل میں بعض ماخذ

کا پتہ چلتا ہے' جو اس کی تالیف کے وقت مولف کے پیش نظر رہے۔ داخلی شہادت پر مبنی ایسے ماخذ کی نشاندہی' علی رضا نقوی' تصنیف مذکور' ص ۵۹۸ اور احمد گلچین معانی' تصنیف مذکور' جلد دوم' ص ۷۵۱۔۷۵۲ میں ہے۔

۳۴۔ "غالبیات' چند عنوانات" ص ۹۸' رفعت نے نواب صدیق حسن خاں کے معتمد الہامی پر فائز ہونے کی مناسبت سے ایک قطعہ تاریخ کہا تھا' جو "نگارستان سخن" میں موجود ہے۔ ص ۱۴۴' اور "نگارستان سخن" کی طباعت پر بھی دو قطعات کہے تھے' جو اس میں شامل ہیں' ص ۲۰۳' اخذ و استفادہ یا معاونت قلمی کا یہ عمل یہیں تک محدود نہیں رہا' اس روزنامچہ کے مطابق "طور کلیم' تذکرۂ اشعار اردو و نثر فارسی' نورالحسن (پسر نواب صدیق حسن خاں) محمد خاں شہیر نے لکھا ہے اور "بزم سخن" بنام علی حسن (پسر نواب صدیق حسن خاں) صابر حسین صبا سہوانی نے .... بحوالہ " غالبیات' چند عنوانات" ص ۹۸' محمد خاں شہیر' فرزند غلام حسین خاں' ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ غالب کے شاگرد تھے۔ اپنے وطن رامپور سے ۱۸۷۲ء میں بھوپال منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۹۰۰ یا ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ نواب صدیق حسن خاں کے مقربین میں تھے اور ان کی شان میں قصیدے لکھے۔ چند قصیدے "نگارستان سخن" میں شامل ہیں' ص ۱۲۶۔۱۷۲' ۱۸۶۔۱۸۸' نورالحسن خاں اور علی حسن خاں دونوں کے اتالیق تھے۔ نورالحسن خاں تو ان سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ "طور کلیم" ص ۵۹۔ حالات کے لئے "شمع انجمن" ص ۲۴۹۔۲۵۱ "صبح گلشن" ص ۲۳۰۔۲۳۸' "طور کلیم" ص ۵۹۔۶۰' "آثار الشعراء" ص ۱۴۳۔۱۴۵' مالک رام تصنیف مذکور' ص ۲۲۴۔۲۲۶' اور صبا سہوانی (۱۸۳۷۔۱۸۹۵ء) ۱۸۷۹ء سے اپنے انتقال تک بھوپال میں رہے۔ پختہ شاعر اور علم عروض کے ماہر تھے۔ نواب صدیق حسن خان کے مقربین میں شامل رہے۔ " صبح گلشن" ص ۲۴۵۔۲۴۶' "بزم سخن" ص ۴۷' "طور کلیم" ص ۴۳' محمد عبداللہ خاں ضیغم "یادگار ضیغم" (حیدر آباد دکن' ۱۳۰۳ھ) ص ۲۳۷

۳۵۔ جیسے عطا کاکوی "صبح گلشن" تلخیص و ترجمہ' ص ۵

۳۶۔ ص ۲۰۶

۳۷۔ ص ۲۔۳

۳۸۔ مطبوعہ لکھنؤ' ۱۹۲۷ء

۳۹۔ ص ۳۵۱

۴۰۔ شاہ محمد تقی حیدر "نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ معروف بہ اذکار الابرار" (لکھنؤ' ۱۳۵۷ھ) ص ۴۱۹۔۴۲۰ ۔

۴۱۔ احمد علی خاں شوق "تذکرہ کاملان رامپور" (دہلی' ۱۹۲۹ء) ص ۱۹

۴۲۔ مطبوعہ : دہلی' ۱۸۸۲ء

۴۴۔ ص ۲۳۲

۴۵۔ پورا نام محمد نواب خاں تھا۔ ۱۸۰۷ء کے لگ بھگ پشاور میں پیدا ہوئے' جہاں ان کے اجداد احمد شاہ درانی کے وقت سے جاگیر دار تھے۔ بیس برس کی عمر میں یہ ہندوستان آئے اور دہلی' لکھنؤ اور رامپور میں رہے۔ منطق و فلسفہ کی تعلیم مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۶ء۔۱۸۶۱ء) اور حدیث کی تعلیم مفتی صدر الدین خاں آزردہ جیسے جید علماء و فضلاء سے حاصل کی اور اپنے وقت کے ممتاز حکیم' امام الدین خاں (متوفی ۱۸۶۴ء) سے فن طب کی تحصیل کی۔ پھر لکھنؤ جا کر حکیم حسن علی مسیح الدولہ بہادر (متوفی ۱۸۵۸ء) طبیب شاہی کے ساتھ مطب کیا اور عطیہ شاہی سے سرفراز ہوئے۔ اور یہیں "ملا نواب" کے لقب سے ملقب کئے گئے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کی سفارش پر کچھ عرصہ کے لئے رامپور میں نواب کلب علی خاں (۱۸۶۵ء۔۱۸۸۷ء) سے منسلک ہوئے پھر بھوپال منتقل ہو کر نواب سکندر جہاں بیگم (۱۸۱۷ء۔۱۸۶۸ء) کے طبیب مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں وہاں سے ہجرت کی اور حرمین شریفین کو تازیست اپنا وطن بنا لیا۔ وہاں انہیں اپنی علمیت و فضیلت اور عبادت و ریاضت کے باعث عزت و تکریم حاصل ہوئی۔ شاہ احمد سعید مجددی کے علاوہ' جن سے دہلی میں بیعت کر چکے تھے' مکہ معظمہ میں طریقہ خضریہ میں ایک بزرگ شیخ ابراہیم رشیدی سے بھی بیعت کی۔ ان میں جرات و استقامت بہت تھی۔ نہر زبیدہ کی تعمیر میں معاونت کے لئے مستعد ہوئے۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل مصر و قسطنطنیہ کا سفر کیا اور اپنی فصیح بیانی سے وہاں بھی لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنا شروع کیا تو حکومت ترکی نے تحقیق حال کے لئے انہیں نظر بند کر دیا۔ لیکن بے قصور ثابت ہونے پر رہا کر دیا۔ یہ مکہ معظمہ واپس آ گئے' جہاں جمادی الاخر ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ ان کے جامع حالات مظفر حسین سلیمانی "گنجینہ سلیمانی" (علی گڑھ' ۱۹۲۷ء) ص ۸۔۱۱ میں ہیں' و نیز سید عبدالحئی "نزہتہ الخواطر" جلد ہشتم (کراچی' ۱۹۷۶ء) ص ۴۶۰۔۴۶۱

۴۶۔ ایضاً" و نیز ص ۱۵۹' حکیم سید فرزند علی کے لئے ایضاً" مفصل و مبسوط ہے

اور فی الاصل ان ہی کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ۸ رجماوی الاخر ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء کو شاہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید نظام علی عرف ضامن علی تھا۔ ان کے نانا کے ایک بھائی سید عبدالرزاق یمینی شاہ آبادی علم و فضل میں معروف اور شاعر تھے اور شاعری میں مرزا محمد فاخر مکین کے شاگرد تھے۔ (شمع انجمن' ص ۵۴۲-۵۴۴' "روز روشن" ص ۷۹۶-۷۹۷)' سید نظام علی بھی شاعر تھے اور اپنی ایک مثنوی میں انتزاع ریاست اودھ کے حالات نظم کئے تھے۔ ان کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ غالباً" یہ محمد نظام علی خاں ہوں' جن کی ایک مثنوی "گلزار معرفت" مطبع محمدی لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ بحوالہ "اے جے آربری

"Catalogue of the Library of the India Office Persian Books"

(لندن' ۱۹۳۷) ص ۷۴۱۔ حکیم سید فرزند علی نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن اور پھر لکھنؤ جا کر مفتی سعد اللہ (تفصیل بہ ذیل"۴۷) سے حاصل کی اور پھر طب ملا نواب کے علاوہ دہلی میں حکیم امام الدین خاں سے سیکھی۔ ۱۸۶۰ء میں بھوپال گئے اور نواب شاہجہاں بیگم کے طبیب خاص مقرر ہوئے اور بیس سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر نرسنگھ گڑھ چلے گئے اور ۱۹۰۱ء تک وہیں قیام کیا۔ اس سال واپس بھوپال آئے اور نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۰۱ء-۱۹۲۶ء) کے طبیب خاص کا منصب سنبھالا۔ یہیں ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔ حالات کے لئے' تصنیف مذکور کے علاوہ سید عبدالحیٔ "نزہتہ الخواطر" جلد ہشتم' ص ۳۵۹-۳۶۰۔

۴۷۔اپنے وقت کے اکابر علماء میں سے تھے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ-۱۸۳۲ء) سے اکتساب فیض کیا تھا اور شاہ غلام علی مجددی (۱۱۴۳ھ-۱۸۲۴ء) سے بیعت تھے۔ علوم کی تحصیل اکابر علماء و اساتذہ بشمول مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے کی۔ فراغت تعلیم کے بعد ابتداء" لکھنؤ کے مدرسہ شاہی میں استاد اور دفتر شاہی میں مترجم رہے' بعد ازاں مفتی عدالت کے عہدہ پر فائز کئے گئے۔ انتزاع ریاست اودھ کے بعد ریاست رامپور سے منسلک ہوئے اور مرافعہ عدالت و افسری مدارس پر مامور کئے گئے۔ علم و تصنیف سے انتہائی درجہ شغف رہا۔ ۳۸ کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ شاعر بھی تھے۔ تخلص آشفتہ تھا اور عربی و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ حالات و آثار متعدد ماخذ میں ملتے ہیں' خصوصاً" رحمان علی "تذکرہ علمائے ہند" (لکھنؤ ۱۹۱۴ء) ص ۷۴-۷۵' فقیر محمد جہلمی' "حدائق الحنفیہ" (لکھنؤ ۱۹۰۶ء) ص ۳۸۸ ونیز "گنجینہ سلیمانی"

ص ۶-۷' ۱۵۹-۱۶۰-

۴۸- ایضا" ص ۱۵۹-۱۶۰-

۴۹- ایضا" ص ۳۰' ایک اور موقع پر مولوی محمد شاہ' نواب شاہجہاں بیگم اور نظام دکن میر محبوب علی خاں (۱۸۶۹ء-۱۹۱۱ء) کے درمیان ملاقات کروا کے ریاست بھوپال کو ممنون کرنے کا باعث بنے- ریاست بھوپال کے حکمران یار محمد خان (۱۷۴۰ء-۱۷۵۳ء) کی مسند نشینی میں نظام دکن آصفؔ جاہ اول (۱۷۲۴ء-۱۷۴۸ء) نے معاونت کی تھی اور ان کی کوشش کی وجہ سے ہی یار محمد خاں کو ریاست کی حکمرانی حاصل ہو سکی تھی- چنانچہ ریاست بھوپال نظام دکن کی ممنون تو تھی لیکن رسمی تکلفات دونوں ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان ملاقات میں حائل رہے تھے- جنوری ۱۸۷۷ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کے خطاب قیصرۂ ہند اختیار کرنے کے موقع پر دہلی دربار منعقد ہوا اور تمام ریاستوں کے حکمران بھی جمع ہوئے تو اس موقع پر نظام دکن کو ان کے مشیروں نے نواب شاہجہاں بیگم سے ملاقات سے اس لئے روکے رکھا کہ ریاست بھوپال کے محسن ہونے کے رشتہ سے انہیں اس ملاقات میں پہل کرنے کے بجائے نواب شاہجہاں بیگم کو ان سے ملاقات کے لئے خود آنا چاہئے- چنانچہ جب نظام دکن کی طرف سے اس ملاقات میں تامل ہوا تو نواب شاہجہاں بیگم نے بھی سکوت اختیار کر لیا- یہ صورت حال اس وقت تبدیل ہوئی جب حکیم سید فرزند علی نے مولوی محمد شاہ سے مدد چاہی' جو اس وقت واجد علی شاہ کے فرزند شہزادہ ہزبر علی فریدون قدر کے وکیل مطلق کی حیثیت سے شہزادہ کے ساتھ دہلی آئے تھے اور جن کے نواب مختار الملک سالار جنگ میر تراب علی خاں (۱۸۲۹ء-۱۸۸۳ء) مدارالمہام ریاست حیدر آباد سے دیرینہ مراسم تھے- مولوی محمد شاہ نے سالار جنگ کو قائل کر لیا' جس کے نتیجہ میں سالار جنگ نے نظام کو اس ملاقات کے لئے آمادہ کر لیا- ایضا" ص ۳۰-۳۱- مولوی محمد شاہ اور سالار جنگ کے درمیان مراسم پر آگے روشنی ڈالی گئی ہے- شہزادہ ہزبر علی کا ذکر بھی آگے آتا ہے-

۵۰- ان کے ایک فرزند مولوی فضل حق ہجرت کر کے حجاز مقدس چلے گئے تھے- مولوی محمد شاہ کے بیشتر حالات' جو مظفر حسین سلیمانی نے تصنیف مذکور میں مرتب کئے ہیں' ان ہی کے فراہم کردہ ہیں- ان کے علاوہ ان کے دیگر اعزاء سید عبداللہ مہاجر' متین الدولہ بخشی حافظ عبدالغنی' جو لکھنؤ اور کلکتہ میں تازیست واجد علی شاہ کے بخشی

رہے اور مولوی محمد شاہ کے ہم مکتب تھے اور دیگر احباب و متعلقین نے بھی مصنف مذکور کو یہ حالات فراہم کئے تھے۔ تصنیف مذکور، ص ۲۶۷

۵۱۔ باڑھ نزد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۹ء میں کلکتہ میں سفیر اودھ کے نائب کے طور پر ملازمت کا آغاز کیا، ۱۸۴۵ء میں صدر دیوانی عدالت میں وکیل سرکار مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں کمشنر پٹنہ کے معاون خاص نامزد ہوئے۔ ۱۸۶۳ء میں "خان بہادر" کا خطاب پایا۔ ۱۸۶۷ء سے واجد علی شاہ کی ملازمت اختیار کی اور ۱۸۷۵ء میں وزیر السلطان مدارالمہام مقرر ہوئے۔ مصنف بھی تھے۔ تین تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ ۱۔ "وزیر نامہ" اس کا ذکر آئندہ سطور میں کیا گیا ہے۔ ۲۔ "امیر نامہ" خود نوشت حالات پر مشتمل ہے، جو کلکتہ سے اولاً ۱۸۷۰ء میں اور پھر ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی، ۳۔ "بیرنگ نامہ" Thomas George Baring وائسرائے ہند (۱۸۷۲ء-۱۸۷۶ء) کے حالات پر مشتمل ہے۔ کلکتہ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ شاعر بھی تھے۔ ان کا کچھ کلام "وزیر نامہ" میں شامل ہے۔ ونیز "شمع انجمن" ص ۴۳-۴۴، حالات کے لئے "امیر نامہ" سی۔ بک لینڈ "A Dictionaryof Indian Biography" (لندن، ۱۹۰۶ء) ص ۴، لوک ناتھ گھوش

"The Modern History of the Indian Chiefs, Rajas, Zamindars, Etc." حصہ دوم (کلکتہ، ۱۸۸۱ء) ص ۱۴-۱۸

۵۲۔ "گنجینہ سلیمانی" ص ۱۶۵، ونیز ان کا مکتوب بنام حکیم سید فرزند علی، مشمولہ "ایضاً" ص ۱۸۳-۱۸۴

۵۳۔ ایضاً" ص ۱۶۵، مولوی حسن رضا کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں انہیں نظامت فوجداری بلدہ سے رکنیت عدالت پر ترقی دی گئی تھی، جہاں وہ ۱۸۸۵ء تک کارفرما رہے۔ اس کے بعد وہ محکمہ انعام میں منتقل ہو گئے۔ "جوڈیشل رپورٹ" مطابق ۱۲۹۴، ص ۲۸، بحوالہ "میر باسط علی خاں "تاریخ عدالت آصفی" (حیدر آباد، ۱۹۴۳ء) ص ۲۴۶

۵۴۔ ایضاً" ص ۲۴۰-۲۴۲، لیکن اس قافلہ میں شریک افراد کی جو فہرستیں اور تفصیلات متعدد ہم عصر اور متاخر ماخذ میں ملتی ہیں ان میں مولوی محمد شاہ کا نام نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ان کے حالات کے فاضل مرتب مظفر حسین سلیمانی نے حکیم سید فرزند علی کے برادر خورد سید اولاد علی کے حالات میں جو مفصل کتاب "چمنستان مظفر"

(مطبوعہ ۔ علی گڑھ' ۱۹۴۷ء) لکھی ہے' اس میں سید اولاد علی کے اس قافلہ کے ساتھ جانے اور سفر اور قیام یورپ کے زمانہ کی تفصیلات شرح و بسط کے ساتھ تحریر ہیں۔ جن جن مقالات پر ان افراد کے نام یا ان کا حوالہ آیا ہے' ان میں مولوی محمد شاہ کا نام کہیں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ "فردا" فردا" تنخواہ و ادائیگی رقوم کی جو تفصیلات متعلقہ کاغذات میں درج ہیں' ان کی ایک نقل بھی اس میں موجود ہے' لیکن اس سے بھی مولوی محمد شاہ کے لندن جانے یا وہاں رہنے کا ذکر نہیں ملتا۔ ص ۵۴-۵۵' یہاں اس قافلہ کے شریک افراد کی تعداد ۱۱۰ درج ہے' جب کہ اس قافلہ کے وکیل مختار و قائد مسیح الدین کاکوری کی تصنیف "سفیر اودھ" (لکھنؤ' ۱۹۲۹ء) ص ۹۳ کے مطابق یہ تعداد ۱۳۰ افراد پر مشتمل تھی۔ ان شرکاء میں پانچ منشی شامل تھے۔ بحوالہ کمال الدین حیدر "قیصر التواریخ" جلد دوم (لکھنؤ' ۱۸۹۶ء) ص ۳۸۸

۵۵۔ "گنجینہ سلیمانی" ص ۲۴۳ "مقالات سعیدیہ" کی مندرجہ بالا عبارت میں یہ مدت دو سال تحریر ہے' جو ممکن ہے مولانا احمد سعید سے بیعت وارادت ہی پر مذکور ہو۔

۵۶۔ نواب معشوق محل کے بطن سے پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر میں خطاب جرنیل یا منصب سپہ سالاری تفویض ہوا۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں اپنے برادر بزرگ ولی عہد ریاست مرزا محمد حامد علی کے انتقال کے بعد خلف اکبر اولاد شاہی قرار دیئے گئے اور شہزادہ مقرر ہوئے۔ جب جنوری ۱۸۷۷ء میں دربار قیصری دہلی میں منعقد ہوا تو یہ بھی مدعو کئے گئے اور مولوی محمد شاہ کے ساتھ دہلی کا سفر کیا' ایضاً" ص ۱۷۰ ح۔ ۱۸۷۸ء میں حکومت نے مصارف ذاتی کے لئے پانچ ہزار روپے منظور کئے' جو مولوی محمد شاہ کی کوششوں کے باعث ہوئے۔ بحوالہ ایضاً" ص ۱۵۹ اور واجد علی شاہ کے مجموعی وظیفہ سے الگ کر کے دیئے گئے' جس پر واجد علی شاہ ان سے سخت برہم ہو گئے۔ حکیم نجم الغنی "تاریخ اودھ" جلد پنجم (لکھنؤ ۱۹۱۹ء) ص ۲۸۱' اس برہمی کا اظہار انہوں نے کئی جگہ کیا۔ یہاں تک کہہ دیا کہ :

پرستار زادہ نیاید بکار
اگرچہ بود زادۂ شہر یار
یہی اس کی ماں کی بھی قیمت تھی بس
وہ بنت جہانی یہ ابن الہوس

"چنچل نازنین" بحوالہ' مسعود حسین رضوی ادیب "سلطان عالم واجد علی شاہ"

(لکھنؤ، ۱۹۷۷ء) ص ۳۰۱۔ شہزادہ ہزبر علی نے، ۲۹؍ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء کو انتقال کیا۔ تفصیلات کے لئے "بزم سخن" ص ۲۰۔۲۲، ۲۳، "تلامذہ غالب" ص ۲۴، حکیم نجم الغنی، تصنیف مذکور، ص ۶۷، ۴۹، ۱۱۳، ۱۷۹، ۲۷۵، نول کشور ("تواریخ نادر العصر" (لکھنؤ ۱۸۶۳ء) ص ۲۷

۵۷۔ عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ خوذ واجد علی شاہ کی ایک تصنیف میں شامل کسی اور کی لکھی ہوئی ایک تقریظ میں کچھ ایسے الفاظ تھے کہ کلکتہ کے سینوں میں اشتعل پیدا ہو گیا تھا۔ "گذشتہ لکھنؤ" مرتبہ، رشید حسن خاں، (دہلی ۱۹۷۱ء) ص ۱۱۹

۵۸۔ ان کی تفصیلات "گنجینہ سلیمانی" ص ۱۵۸۔۱۶۰، ۲۱۳۔۲۱۵ میں اور کچھ خود مولوی محمد شاہ کے مکتوب مورخہ ۶؍صفر ۱۲۹۷ھ بنام حکیم فرزند علی، مشمولہ ایضاً" ص ۱۶۷۔۱۷۴، ونیز مکتوب دیگر، بلا تاریخ مشمولہ ص ۱۷۷۔۱۸۰ و بعدہ، میں ہیں۔

۵۹۔ ایضاً" ص ۱۵۸۔۱۵۹

۶۰۔ ایضاً" ص ۱۶۲، ۱۸۵

۶۱۔ ایضاً" ص ۲۱۱

۶۲۔ "کلیات اختری" (لکھنؤ ۱۲۷۲ھ) ص ۹۸۵ء۹۸۶

۶۳۔ "گنجینہ سلیمانی" ص ۲۱۱

۶۴۔ "دیوان ہزبر موسوم" "جودت تعشق" ص ۱۲۹۔۱۳۲۔

۶۵۔ مکتوب، مورخہ ۲؍ جمادی الاول ۱۳۲۷ھ بنام مظفر حسین سلیمانی، مشمولہ "گنجینہ سلیمانی" ص ۲۱۱

۶۶۔ یہ کتاب دو جلدوں میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ بحوالہ: مولانا عبدالرحیم "فہرست لباب المعارف العلمیہ فی مکتبہ دارالعلوم الاسلامیہ، پشاور" (آگرہ، ۱۹۱۸ء) ص ۱۰۳، اس لحاظ سے "دیوان ہزبر" کے آخر میں مولوی سید قمرالدین کی تقریظ بھی اپنے اسلوب کے لحاظ سے مولوی محمد شاہ کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ ص ۱۳۴۔۱۳۶۔

۶۷۔ ضلع نادیا، بنگال کی ایک تحصیل اور اسی نام کا ایک گاؤں بحوالہ
"Imperial Gazetteer of India" جلد ۱۹ (آکسفورڈ، ۱۹۰۹) ص ۵۶۔۵۷
مسودہ دیکھ کر اضافہ کریں۔

۶۸۔ یہ کتاب مطبع نظامی کانپور سے ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر بطور مصنف

سید محمد معظم حسین خاں تحریر ہے۔ خاتمہ میں یہ عبارت درج ہے "حصہ اول کتاب ہدایت مسمی بہ تقویم السعادت و تعلیم العبادت کا' جو کہ بیان اصول ایمان میں ایک عمدہ قصہ نافعہ ہے' منجملہ پانچ حصوں ارکان خمسہ اسلام' یعنی ایمان' نماز' روزہ' حج و زکوۃ کے تصنیف لطیف عالم بے عدیل' فاضل فقید المثیل' قاطع مبنیان شرک و بدعت دافع اسلام' فرض و سنت مقبول بارگاہ خالق کونین جناب مولوی سید محمد معظم حسین خاں صاحب بہادر جج کٹیا وغیرہ باہتمام عاجز خاکسار ذرۂ بے مقدار محمد یعقوب منصرم مطبع نظامی بتاریخ ۲ ر شوال ۱۲۹۳ھ مطبع نظامی جناب خان صاحب والا مناقب محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب واقع کانپور میں چھپ کر تیار ہوا۔ انشاء اللہ تعالیٰ بقیہ ہر چہار حصہ بھی اس کتاب کے عنقریب تیار ہو کر شائع ہوں گے۔ ص ۱۴۱' علم نہیں کہ بقیہ حصے شائع ہوئے یا نہیں۔ مصنف کے والد کا نام سید امداد علی تھا۔ ان کے اجداد نے بغداد سے آ کر پرگنہ مقیم پور واقع جہانگیر نگر ڈھاکہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ معظم حسین اضلاع بہار و بنگال میں منصفی صدر امینی' اعلیٰ صدر امینی' سب ججی اور ایڈیشنل ججی کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۸۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۸۸۷ء میں "خان بہادر" اور ۱۹۰۱ء میں "نواب" کا خطاب ملا۔ ان کے حالات کے لئے "صحیفہ زریں" مرتبہ نول کشور (متعلقہ بنگال) مطبوعہ لکھنؤ' ۱۹۰۲ء ص ۱۱۳۔۱۱۴۔

۶۹۔ مطبوعہ : مطبع نظامی کانپور' ۱۲۹۳ھ۔ چہار ابواب پر مشتمل ہے' جن میں حالات خاندان شاہی لکھنؤ' شاہی وفد کے مذکورہ بالا سفر لندن کے واقعات' واجد علی شاہ کی لکھنؤ سے کلکتہ منتقلی اور وہاں کے حالات اور واجد علی شاہ اور دیگر شعراء کا بشمول مصنف کلام شامل ہے۔ تفصیلات کے لئے : اسٹوری' تصنیف مذکور' ص ۴۷ ونیز عارف نوشاہی "فہرست کتابہای فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتابخانہ گنج بخش' اسلام آباد" جلد یکم (اسلام آباد' ۱۹۸۶ء) ص ۹۳۰۔۹۳۱

۷۰۔ مظفر حسین سلیمانی کا بیان ہے کہ جن لوگوں نے مولوی محمد شاہ کو "وزیر نامہ" تصنیف کرتے ہوئے دیکھا' خود انہوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔ بلکہ مولوی محمد شاہ نے بھی اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ بنام حکیم سید فرزند میں اپنی عدیم الفرصتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "درستی و تصحیح کتاب کہ متعلق من بود بخانہ خود نوشتہ سرانجامش میدہم" بحوالہ تصنیف مذکور' ص ۲۹

۷۱۔ مطبع نو لکشور' دسمبر ۱۸۷۳ء کتاب پر مصنف کا نام درج نہیں' جو اس کے انکسار کا

ایک مظہر ہے۔ تمت صفحہ ۴ پر مصنف کو ۱۲۸۳ھ میں بقید حیات اور قریب ایک سال سے "مبتلائے امراض معید" بتایا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی اس پر مصنف نے ضروری نظر ثانی کی تھی۔ قبل ازیں یہ کتاب کلکتہ سے ۱۲۸۳ھ میں بہ حروف ٹائپ نسخ میں شائع ہوئی تھی، لیکن اس کی مقبولیت اور لوگوں کی فرمائش پر اسے مطبع سنگی میں چھاپا گیا۔ اس اشاعت میں محمد ظہیر بلگرامی کی طویل تقریظ اور کلام منظوم شامل ہے، جس میں انہوں نے بھی مصنف کے نام کا حوالہ نہیں دیا، ص ۱۔۲۰، لیکن "فہرست کتب موجودۂ مطبع نو لکشور واقع لکھنؤ و کانپور" مطبوعہ ۱۸۷۴ء ص ۴۸ پر اس کتاب کے نام کے ساتھ یہ عبارت درج ہے۔ "تصنیف مولوی محمد شاہ صاحب بزبان شستہ، محاورات پاکیزہ، تاریخ و حالات معتبرہ میں نہایت مستند ہے۔ ایک مرتبہ یہ بہ حروف ٹیپ طبع ہوئی تھی، اب بار دگر اس طرح طبع ہوئی" اس کتاب کا ذکر بلا حوالہ مصنف، ان فہارس میں بھی ملتا ہے۔ اے۔ جے۔ آربری

"Catalogue of the Library of the India Office - Persian Books"

(لندن، ۱۹۳۷ء) ص ۱۳۲، مولوی عبدالرحیم "لباب المعارف العلمیہ فی مکتبہ دارالعلوم الاسلامیہ" (پشاور)، (آگرہ، ۱۹۱۸ء) ص ۱۵۸۔

۷۲۔ اس کے ابواب و موضوعات کی تفصیل، عارف نوشاہی، تصنیف مذکور، ص ۴۰ میں بھی ہے۔

۷۳۔ امداد صابری، "فرنگیوں کا جال" (دہلی، اشاعت دوم) ص ۴۳۹

۷۴۔ ایضاً

۷۵۔ ایضاً

۷۶۔ مکتوب مولوی محمد شاہ بنام حکیم سید فرزند علی، مورخہ ۶ ر صفر ۱۲۹۷ھ، مشمولہ: "گنجینہ سلیمانی" ص ۱۶۸

۷۷۔ مکتوب مولوی محمد شاہ بنام حکیم سید فرزند علی، مشمولہ ایضاً" ص ۱۸۱

۷۸۔ ایضاً" ص ۱۶۷۔ ۱۸۳

۷۹۔ ایضاً" ص ۱۸۵، ان کی تدفین کلکتہ، ٹیا برج میں واقع مسجد حب دار خاں کے دروازے کے متصل ہوئی ایضاً"۔

۸۰۔ ایضاً" ص ۱۸۵۔۱۸۹، مولوی صوفی فتح علی، متقی اور پرہیز گار اور فاضل و عالم باعمل تھے۔ علم مناظرہ اور نعت گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ نعتیہ قصائد ایسے ذوق و

انہماک سے پڑھتے کہ "عاشق رسول اللہ" کہلاتے تھے۔ ان کی پیدائش چاٹگام میں ہوئی تھی، لیکن کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں محکمہ ایجنسی میں میر منشی تھے۔

ایضاً" ونیز "شمع انجمن" ص ۲۶۸

۸۱۔ مشمولہ : "گنجینہ سلیمانی" ص ۱۸۴

۸۲۔ مشمولہ : ایضاً" ص ۱۸۴۔۱۸۵

۸۳۔ مشمولہ : "کلیات اختری" (واجد علی شاہ) مطبوعہ، کلکتہ ۱۲۷۸ھ ص ۹۸۵۔۹۸۶

۸۴۔ مشمولہ : "دیوان ہزبر" ص ۱۲۹۔۱۳۱

۸۵۔ ایضاً" ص ۱۳۱ ۔ ۱۳۲

ایلیٹ اور سید احمد خاں

ھنری میرز ایلیٹ (Henry Miers Elliot)[1] بنیادی طور پر مورخ، ماہر لسانیات اور ماہر نسلیات تھا، لیکن اپنی مرتبہ "The History of India as told by its own Historians" کی وجہ سے خاصی شہرت کا حامل ہے[2]۔ یہ اس کی تالیف میں سرسید سے مدد لیتا رہا[3]۔ سید احمد خاں نے ۱۸۳۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی[5] وہ اس ملازمت کے دوران فروری ۱۸۳۹ء تک دہلی میں، جنوری ۱۸۴۲ء تک مین پوری میں، اس کے بعد فروری ۱۸۴۶ء تک فتح پور سیکری میں اور ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دہلی میں رہے[6]۔ اس ملازمت کے دوران ان کے روابط اعلیٰ مناصب کے انگریزوں سے استوار ہوئے، جن میں سے بعض اپنے علمی و تصنیفی مشاغل کی وجہ سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً" سر رابرٹ ہیملٹن (Rober Hamilton)، جس نے "آثار الصنادید" کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا[7] اور ایڈورڈ ٹامس (Edward Thomas) جو "آثار الصنادید" کی دوسری ترمیم شدہ اشاعت کا محرک تھا[8] اور اسی کی تحریک پر سید احمد خاں قیام لندن کے دوران اتھینیم کلب (Athenaeum Club) کے اعزازی رکن بنائے گئے[9] اور یہ ایلیٹ کی مذکورہ تاریخ ہند کی اشاعت کا مہتمم بھی تھا[10]" سید احمد خاں سے زیادہ قریبی روابط رکھتے تھے۔

ایلیٹ ۱۸۲۶ء میں ہندوستان آنے کے بعد ۱۸۴۷ء تک بریلی' مراد آباد اور دہلی میں تعینات رہا[۱]" ۱۸۴۶ء میں اس کی تالیف "Supplement to the Glossary of Indian Terms" کی پہلی جلد شائع ہوئی' جس کی تالیف میں ہندوستانی افسروں اور اداروں نے اس کی مدد کی تھی[۲]۔ سید احمد خاں کی اولین تاریخی تصنیف "جام جم" ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی' جو خاندان مغلیہ کے ۴۳ حکمرانوں' امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر اور سید اور افغان حکمرانوں کے تذکرہ اور تمام بنیادی معلومات پر مشتمل تھی۔ خاتمہ میں سید احمد خاں نے اس کتاب کے ماخذ کی ایک فہرست بھی درج کی تھی۔ چنانچہ ایلیٹ نے اپنے مبسوط منصوبہ تاریخ ہند کی تالیف کے لئے اس فہرست میں درج کتابوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس نے سید احمد خاں کی تصنیف "آثار الصنادید" کو بھی پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا تھا[۳]۔

"جام جم" کے ماخذ کے تعلق سے ایلیٹ نے سید احمد خاں سے اپنی نجی مراسلت میں ان ماخذ کے مندرجات اور ان کے مالکوں کے بارے میں استفسار کیا تھا' کیونکہ ایلیٹ کے خیال میں ماخذ کی فہرست میں درج بعض تصانیف سے مذکورہ حکمرانوں یا اس کے دور کی بیان کردہ تفصیلات اخذ نہیں ہوتیں[۴]۔ سید احمد خاں اور ایلیٹ کے درمیان ہونے والی مراسلت اب یکجا دستیاب نہیں' لیکن سید احمد خاں کے مذکورہ مکتوب میں ایلیٹ کے دریافت کردہ امر کی کچھ وضاحت موجود ہے۔ اور اس مکتوب سے ان دونوں کے علمی روابط کی ایک تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ یہ فارسی خط اور اس کے ساتھ ہم رشتہ غیر مطبوعہ تحریریں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں[۵]۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے ایک طرف سید احمد خاں اور ایلیٹ کے مابین روابط کا اندازہ ہوتا ہے اور سید احمد خاں کا تحریر کردہ اولین دستیاب خط سامنے آتا ہے[۶] اور دوسری طرف مخطوطات کی فہرست سازی میں سید احمد خاں کے

اسلوب اور معیار کا اندازہ ہوتا ہے' جب کہ اس وقت تک ہند فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست سازی کی محض اکا دکا مثال موجود تھی[۱۷]۔
(۷۰ الف) بندگان عالی متعالی جناب خداوند نعمت مناحرمان دام اقبالہم بعد عرض میرساند

دو قطعہ پروانہ کرامت شمہ یکی بحکم خرید حوالہ کردن کتاب "مخزن افغانی"[۱۸] لالہ چنی لعل[۱۹] و دوئی بارشاد بدست آوری کتب مندرجہ خاتمہ "جام جم"[۲۰] بارقہ ورود ا فگندہ معزز و ممتاز گردانید۔ حسب الحکم حضور فیض ظہور کتاب "مخزن افغانی" از حافظ برکت اللہ سوداگر خرید ساختہ حوالہ چنی لعل صاحب نمودم دیک قطعہ رسید قیمت آن حوالہ لالہ صاحب موصوف نمودہ۔ قطعہ ثانی لف عریضہ ھذا ارسال۔حضور بندگان عالی میدارم و فدوی عقیدت زین بدل جاں بل بہم تن قد تلاش و تجسس کتب ہائے مطلوبہ حضور عالی معروف است و ہرچہ بدست می آید اطلاع آں بحضور میسازد و سعادت ابدی ازاں می اندوزد و نیز لالہ چنی لعل صاحب حسب الحکم حضور از فدوی استفسار نشان و طریق دستیابی کتب مندرجہ خاتم "جام جم" نمودند۔ چنانچہ بابت کتاب "تاریخ فیروز شاہی" تصنیف مولانا ضیاء الدین برنی کہ از سہو کاتب در خاتمہ کتاب "جام جم" عزیزالدین تحریر شدہ و کتاب "تاریخ افغانان" تصنیف حسن خان افغان[۲۱] و مسودہ تاریخ مصنفہ مولوی خلیل اللہ خان صاحب[۲۲] و "اقبال نامہ جہانگیری"[۲۳] المشتہر بہ "چہار گلشن"[۲۴] و "تاریخ چغتائی"[۲۵] و "چنگنامہ"[۲۶] و شجرہ مولفہ مرزا عبیداللہ خاں و "فوائد الفواد"[۲۷] کہ جملہ ہشت کتاب شدند' پتہ و نشان آن از جائیکہ تردد فدوی (۷۰ ب) بہم رسیدہ بودند نویسایندہ دارم و فدوی نیز سعی دربہم رسانی آن منمایم و لالہ صاحب موصوف نیز سائی اندہرگاہ بدست می آیند فی الفور اطلاع آں بحضور می کنم و تاریخ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کہ از نزد مفتی اکرام الدین خاں[۲۸] صاحب بدست

فدوی آمده بود زبانی لالہ چنی لال[۲۹] صاحب معلوم شد کہ کتاب مذکور روانہ حضور بندگان عالی گردید و سوائے آن ہر قدر کتب کہ دریں عرصہ بدست فدوی آمده اند۔ فہرست آن مع نقل مقالات لف عریضہ ہذا روانہ حضور است و عنقریب فہرست دیگر روانہ خواھم ساخت و جملہ حالات کتب مندرجہ نقشہ ملفوفہ از ملاحظہ آں بحضور واضح خواهد شد۔ لیکن عرض حال بعض کتب ها مندرجہ نقشہ مذکور بحضور ضرور است۔ اول ایں کہ ہر چہار جلد "اکبر نامہ"[۳۰] بطریق و بعرض بیع نزد فدوی رسیده اند و کتاب مذکور اگرچہ نوشتہ جدید است لیکن خوش خط و واضح و اسلوب خوب نوشتہ و مالک آں میگوید کہ ایں کتاب از کتابی کہ منجملہ کتب ہائے کتب خانہ بادشاہی نقل شده بود و منقول عہد آں محررہ قریب قریب عہد جہانگیر بود واللہ اعلم۔

غرض کہ ایں چہار دفتر بسیار خوب اند و معلوم میشود کہ دفتر اول و دویم را مقابلہ ہم نموده اند و قیمت آں ہم مناسب بلکہ ارزاں است۔ یعنی مالک آن فروختن آن بقیمت پنجاه و پنج روپیہ راضی است۔ لہٰذا آن ہر چہار جلد را بانتظار رسیدن جواب عریضہ ہذا نزد خود داشتہ بحضور اطلاع نموده ام۔ امید کہ ہرچہ مرضی مبارک باشد باطلاع آن سرفرازی بخشیده آید۔ دویم ایں کہ ایں "چہار گلشن" کہ در نقشہ مندرج است آن نیست کہ ذکر آن در خاتمہ "جام جم" مندرج است۔ بلکہ این کتاب دیگر است و ہر گاه آن کتاب بدست خواہد آمد باطلاع حال آں خواہد پرداخت سویم این کہ "تاریخ سلاطین" کہ در نقشہ مندرج است از اول و آخر ناقص است۔ بتحقیق معلوم نیست کہ کدام کتاب است۔ لیکن ہر جلد آن ہمیں نام مندرج بود۔ لہٰذا از ہمیں نام بحضور اطلاع نمودم۔

امید دارم کہ جواب عریضہ ہذا مع نمبر اجزائے کتاب "آثار الصنادید" مرحمت شود تا بمالک کتاب "اکبر نامہ" جواب داده آید و بقیہ کتاب "آثار

الصنادید" (۱۷الف) بحضور اقدس روانہ شود۔ زیادہ حد ادب آفتاب حشمت و اقبال تاباں و درخشاں باد ۔ فقط

عرضہ

فدوی سید احمد خاں منصف خاص

شاہجہان آباد

معروضہ ہفتم ماہ ستمبر سنہ ۱۸۴۷ء

(۱۷۲الف) فہرست[۳۱] کتب تواریخ مطلوبہ جناب فیض مآب مسٹر ہنری میرز ایلیٹ صاحب بہادر دام اقبالہم سکر تر اعظم محکمہ محتشمہ نواب گورنر جنرل بہادر دام حشمتہ

مرسلہ سید احمد خاں منصف دہلی
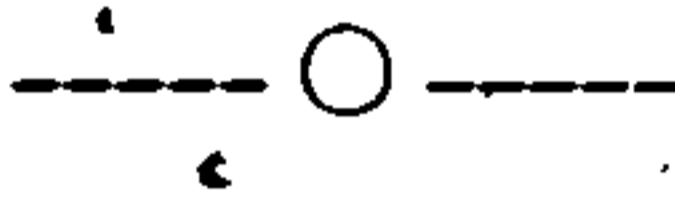
نام کتاب ۔ مرآت آفتاب نما قلمی

تقطیع ۔ طول ۹ انچ (کذا)

عرض ۶ انچ

حجم ۴ انچ

تعداد صفحہ ۔ ۱۰۴۰

تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۵

کامل یا ناقص ۔ کامل

نام مصنف ۔ عبدالرحمٰن الخاطب بہ شاہنواز خاں ہاشمی۔

سنہ تحریر کتاب ۔ بست یکم شہر شعبان سنہ ۲ جلوس اکبر شاہ ثانی مطابق ۱۲۲۳ ہجری۔

کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ۔

مقدمہ درباب فضیلت و حاجت علم تاریخ و ابتدائے زمان اختراع این فقط جلوہ اول مشتمل بر شش تجلی۔ تجلی اول دربیان ظہور آفرینش۔ تجلی دوم در ذکر انبیاء مرسل و غیر مرسل و اولوالعزم وغیرہ علیہ السلام۔ تجلی سوم در ذکر خاتم النبین و اشرف المرسلین و اولاد و امجاد و ازواج عصمت مزاج و خلفاء باصفا و دیگر اصحاب باصواب آنحضرت رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ تجلی چہارم در احوال صوفیہ صافیہ و علماء و حکماء و شعراء و گروہی کہ خود را در درویشان می شمارند و باایشان نسبت ندارند و صاحب مذاہب باطلہ آمد مثل مداریان و جلالیان و غیرھا۔ تجلی پنجم دربیان ملوک عرب و عجم و راجہاے ہند۔ تجلی ششم در اوصاف سلاطین گورگانیہ خلد اللہ ملکہم و امراء و وزراء ایشان و نغمہ پردازان۔

جلوۂ دوہم مشتمل بر ہشت تجلی ۔ در ہفت تجلی ذکر اقالیم سبع ۔ در تجلی ہشتم ذکر بحار سبعہ۔

خاتمہ دویم عجایب و غرایب و نوادر تحایف و فواید متفرقہ۔

نام کتاب ۔ خلاصہ التواریخ قلمی

تقطیع ۔

طول ۔ ایک فٹ

عرض ۔ ٦ انچ (کذا)

حجم ۔ ۴ انچ

تعداد صفحہ ۔ ۸۳۳

تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۹

کامل یا ناقص ۔ کامل

نام مصنف ۔ سبحان رائے کھتری

سنہ تحریر کتاب۔ یازدہم شعبان سنہ ۴۵ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۱۹۷ ہجری۔

کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ ۔

از ابتدائے راجہ جدھشتر لغایت حکومت رائے پتھورا و ذکر سلاطین مسلمان از ابتدائے ناصر الدین سلطان سبکتگین لغایت وفات اورنگ زیب عالمگیر یعنی لغایت بست ہشتم ذیقعدہ سنہ ۱۱۸۱ ہجری۔

———○———

(۷۲ ب)

نام کتاب ۔ تکملہ خلاصہ التواریخ قلمی

تقطیع۔

طول ۔ ایک فٹ۔

عرض ۔ ۶ انچ

حجم ۔ ۴ انچ

تعداد صفحہ ۔ ۵۰

تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۹

کامل یا ناقص ۔ کامل

نام مصنف ۔ جسپت رائے کھتری۔

سنہ تحریر کتاب ۔ بست یکم شعبان سنہ ۴۵ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۱۹۷ ہجری نوشتہ دست مصنف

کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ ۔

حالات از جلوس محمد معظم بہادر شاہ لغایت سلطنت محمد شاہ بادشاہ تا وقت دفن

———○———

نام کتاب ۔ دفتر اول اکبر نامہ قلمی

تقطیع ۔
طول ۔ ایک فٹ
عرض ۔ ۸ انچ
حجم ۔ ۴ انچ
تعداد صفحہ ۔ ۹۰ے
تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۱
کامل یا ناقص ۔ کامل
نام مصنف ۔ شیخ ابوالفضل
سنہ تحریر کتاب ۔ ۱۸۴۴ء عیسوی
کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ
ذکر ولادت اکبر و بیان نسب او از حضرت آدم علیہ السلام لغایت آخر سلطنت نصیر الدین ہمایوں شاہ۔

—— ○ ——

نام کتاب ۔ دفتر دویم اکبر نامہ قلمی
تقطیع ۔
طول ۔ ایک فٹ
عرض ۔ ۸ انچ
حجم ۔ ۴ انچ
تعداد صفحہ ۵۵ے
تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۱
کامل یا ناقص ۔ کامل
نام مصنف ۔ شیخ ابوالفضل

سنہ تحریر کتاب ۔ ۱۸۴۴ء عیسوی
کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ
از ابتدائے جلوس اکبر لغایت آخر سال ہفتدہم جلوس از دور دوئم معہ خاتمہ آں دفتر۔

———O———

نام کتاب ۔ دفتر سوئم اکبر نامہ قلمی
تقطیع
طول ۔ ایک فٹ
عرض ۔ ۸ انچ
حجم ۔ ۴ انچ
تعداد ۔ صفحہ ۔ ۲۱۲
تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۱
کامل یا ناقص ۔ کامل
نام مصنف ۔ شیخ ابوالفضل
سنہ تحریر کتاب ۔ ۱۸۴۴ عیسوی
کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ۔
از ابتدائے سال ہجدھم جلوس از دور دوئم لغایت آخر سال چہل و ہشتم سال دی از دور چہارم۔

———O———

نام کتاب ۔ دفتر چہارم اکبر نامہ کہ آنرا تکملہ اکبر نامہ نیز می گویند قلمی۔
تقطیع ۔
طول ۔ ایک فٹ

عرض ۔ ۸ انچ
حجم ۔ نیم انچ
تعداد صفحہ ۔ ۲۰۲
تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۱
کامل یا ناقص ۔ کامل
نام مصنف ۔ عبدالصمد ابن افضل محمد جامع انشاء ابو الفضل
سنہ تحریر کتاب ۔ ۱۸۴۴ء عیسوی
کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ
از ابتدائے سال چہل و ہفتم جلوس یعنی سال بہمن از دور چہارم لغایت وفات اکبر
راجہ جد ہشتر تا شاہجہاں

-----○-----

(۴۷ الف)
نام کتاب ۔ چہار گلشن
تقطیع ۔
طول ۔ ۱۱ انچ
عرض ۔ ٦ انچ
حجم ۔ ۱ انچ
تعداد صفحہ ۔ ٦۴۲
تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۴
ناقص یا کامل ۔ کامل
نام مصنف ۔ رائے چترمن

سنہ تحریر کتاب ۔ یاز دہم شہر رجب سنہ قطع شد
کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ
گلشن اول ۔ در احوال راجہ ہا و بادشاہان
گلشن دویم ۔ در بیان صوبجات جنوب یعنی مملکت دکن
گلشن سویم ۔ دربیان مسافت و منازل چہار سوے از شاہجہاں آباد دہلی۔
گلشن چہارم ۔ در ذکر سلاسل فقرا و درویشان

—— ○ ——

نام کتاب ۔ مخزن الفتوح قلمی
تقطیع ۔
طول ۔ ۸ انچ
عرض ۔ ۶ انچ
حجم ۔ ۱ انچ
تعداد صفحہ ۔ ۲۳۰
تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۱
کامل یا ناقص ۔ کامل
نام مصنف ۔ بھگوان داس 'پنڈت' شیو پوری
سنہ تحریر کتاب ۔ تاریخ تحریر از آخر کتاب مندرج نیست لیکن در زمان تصنیف نوشتہ شدہ باشد و چہ عجب کہ در زمانہ مصنف کہ در عہد اکبر شاہ ثانی بود نوشتہ شدہ باشد
کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ ۔
متضمن حالات جنگ جنرل لیک صاحب بہادر و جنرل لونی اختر[۲۲] صاحب بہادر یا مرہٹہ ہا

-----○-----

نام کتاب ۔ تاریخ سلاطین ہند یا بادشاہان ہند قلمی
تقطیع ۔
طول ۔ ۸ انچ
عرض ۔ ۵ انچ
حجم ۔ ۱ انچ
تعداد صفحہ ۔ ۴۵۳
تعداد سطر ہر صفحہ ۔ ۱۴
کامل یا ناقص ۔ از اول و آخر ناقص
نام مصنف ۔ نظام الدین احمد
سنہ تحریر کتاب ۔
کیفیت حالات از کدام سنہ تا کدام سنہ ۔

طبقہ اول از اول ناقص است ۔ لیکن از سلطنت سلطان رضیہ تا خسرو ملک موجود۔ طبقہ دویم در ذکر سلاطین دہلی از سلطان محمد معزالدین بن سام لغایت سلطنت اکبر شاہ ۔ طبقہ سویم سلاطین دکن از سلطنت علاء الدین حسن لغایت سلطنت محمد علی قطب الملک طبقہ چہارم سلاطین گجرات از سلطنت تاتار خان لغایت سلطان مظفر۔

طبقہ چہارم[۳۳] در ذکر سلاطین مالوہ از سلطنت دلاور خاں تا سلطنت باز بہادر۔ طبقہ پنجم در ذکر سلاطین بنگلہ از سلطان فخر الدین تا نصیب شاہ۔ طبقہ ششم در ذکر سلاطین شرقیہ از سلطان مبارک شاہ تا سلطان حسین ۔ طبقہ ہفتم در ذکر سلاطین کشمیر از سلطان شمس الدین الطاہر تا سلطنت علی یوسف۔

باقی ناقص[۳۴]

نقل مقالات از "مرآت آفتاب نما"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۴۷ الف) مقلی کہ خوشابی لالی تلالی الفاظ آبدارش آرائش افسر سلطان سخن تواند نمود ستائش صانعی کہ بر ناظران صحایف معارف از گردش صفائح لیل و نہار چون ورق گردانی رسایل ھا سیاقی مضمون بوقلمونی زمانہ عذار واضح فرمود و کلامی کہ شادابی جواہر و زواہر کلمات پر انوارش و زیبائش دیہیم خاقان بیان تواند فرمود نیایش عالمی است کہ بر باہران دفاتر حقائق از مشاہدہ رنگارنگی نسخہ روزگار چون مطالعہ کتب بدرالحلق معنی گونا گونی ایں کارخانہ بیمدار۔

امابعد

بندہ درگاہ آں فدوی بارگاہ بادشاہ اضعف العباد قادر قوی عبدالرحمٰن مخاطب بشاہنواز خاں ہاشمی بنیانی ثم الدھلوی بعرض ارباب دانش و اصحاب بنیش میرساند کہ چون سالہا این بے بضاعت بموانست کتب التواریخ نشستہ و مدتی ایں بے استطاعت بممارست۔ایں فن استخوان شکستہ ارادہ باستفادہ بدان متعلق داشت و عزم بالجزم بران میماشت کہ کتابی درین فن لطیف و رسالہ درین علم شریف ترتیب دہد کہ اشتمال داشتہ باشد بر احوال ابتدائے آفرینش و ارباب

از مقام جلوس شاہ عالم

ابوالمظفر جلال الدین محمد حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہم بن عزیزالدین عالمگیر بادشاہ ملقب بحضرت عرش منزل بن معزالدین بادشاہ باید دانست کہ ولادت باسعادت بتاریخ ہفتدہم شہر ذیقعدہ سنہ یکہزار و یکصد و چہل ہجری نبوی گردید جناب حضرت عرش منزل را از آنجا کہ ضمیر روشن و

دل آگاه بود انوار اقبال و آثار اجلال از جبین مبینش مشاهده فرموده رافت و شفقت از جملہ اولاد نسبت بان ذات قدسی صفات زیادہ و بیشتر میفرمودند کہ درین اثنا آمد آمد احمد شاہ درانی غلبہ انداخت دستور مقہور راہ فرار اختیار کردہ در بھرت پور پناہ برد چوں شاہ مذکور وارد (۴۷ ب) دارالخلافہ شد و رسم ملاقات بحضرت عرش منزل بمیان آمد آنجناب را کہ مبین پور خلافت بود ز طرف عرش منزل

نقل از آخر کتاب

الٰہی بحق محمد شاہ لولاک و بتصدیق احمد شہنشاہ ماعرفناک و بہ ارواح پاک اصحاب کبار باشتاح و ارواح آل اطہارین خزف ریزہ چند کہ با چندیں تردد و تلاش فقرہ فقرہ از صفائح کتب معتبرہ بہمرسیدہ آمد در نظر پسند جوہریاں رستہ (بہ) بازار نکتہ دانی درآمدہ بہمتاب لالی متلی بحر زخار معانی و ہمرنگ جواہر زواہر معدن ہمہ دانی یا دو این گلدستہ گلشن ہمیشہ بہار بابیاری استحسان سخن سنجان و غمخوار پسند سرسبز و شاداب بودہ معنبر ساز مشام مشتاقان نافہ سخن د معطر فرمائے دماغ طالبان شمایم معانی۔ سواد بالنون والصلو۔

نقل از کتاب "خلاصتہ التواریخ"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقاش نگار خانہ کائنات و مصور کارگاہ ممکنات چون اقتضائے آن کرد کہ صور پیرائے عجائب ابداع و چہرہ آرائے غرائب اختراع کردد لوحدت آرائے عناصر اربعہ را باوجود تضاد فطری تخالف نظری باہم امتزاج و اختلاط دادہ۔

نقل از خاتمہ کتاب

آخر الامر بتاریخ بیست ہشتم ذیقعدہ سنہ ۱۱۸۱ بعد انتظام ممالک روز جمعہ دو گھڑی از دوپہر گذشتہ حضرت بادشاہ جنت آرامگاہ در عمر نود یکسال و ہفتدہ او زود دو گھڑی پیمانہ ہستی لبریز نمودند مدت سلطنت پنجاہ سال و دو ماہ و بیست

ہشت روز بملک دکن در شہر احمد نگر اینی بوقوع آمدہ۔

نقل از تکملہ "خلاصہ التواریخ"

بادشاہ جنت آرامگاہ صلعد مصلعد قریب یزدان اکنہ الاعلی درجات الجناں حضرت خلد مکاں محی الدین (۷۵ الف) محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی بدانکہ چوں حضرت اعلیٰ از بے تدبیری بادشاہزادہ داراشکوہ در قلعہ اکبر آباد۔

نقل از خاتمہ

برقبر مبارک حضرت بادشاہ ہر سالہ مراسم عرس بقدر حال میشود وی ۳۰ سال کثری زیادہ بادولت وحشمت و کم آزاری خلق اللہ و آرام و آسائش تمام و عیش و عشرت ما لاکلام کہ مزیدے براں متصور نبود سلطنت نمود

منقول از دفتر اول "اکبر نامہ"

اللہ اکبر ایں چہ دریافتی است ژرف و شناختی است شگرف کہ حقیقت پذیران دقیقہ رس و روشن ضمیران صبح نفس کہ باریک بینان جداول آفرینش و ہرکار کشلیاں لوحہ دانش و بینش اند در ترکیب عنصری و پیکر ہمولانی۔

نقل از خاتمہ

و نوبت سخن بانچ ہر دو طائفہ مقصود حقیقی شناسند در رسید امید کہ درین کار شگرف کامیاب آرزو گردم۔ قطع۔

کلکم کہ سرش زبان غیب است
گنجینہ کشای۔ کان غیب است
زانکس کہ نگہ کند بہ تمکین
انصاف طلب کنم نہ تحسین

منقول از دفتر دویم "اکبر نامہ"

سلسلہ انتظام کارگاہ آفرینش کہ مظاہر حقیقت نمای شہود و شواہد قدرت

واجب الوجود است وابستہ بفرمانروائے بزرگ نہادی باید کہ بار عالم و عالمیان بازوے تائید الہی برسر تواند گرفت و کار جہان و جہانیان را بہ نیروے

منقول از خاتمہ

دریں دم کہ دوراں سخن خواہ بود
سخن از من و ہمت از شاہ بود
گرم ہمت امیدواری دہد
فلک فرصت و بخت یاری دہد
با ایں جنبش کلک گردون خرام
بپایاں برم ایں گرامی کلام

(۷۵ ب) منقول از دفتر سویم

سخن تازہ سازم بنام خداے
کہ نامش بمعنی بود رہنماے
بنامش تواں زیب گفتار داد
کہ مارا زباں بہر ایں کار داد
نگردد سخن تا گراں از سپاس
چہ وزنش نہد عقل یزداں شناس
و لیکن دریں دشت محمل فگن
نرفتند مرداں بپائے سخن
سخنور کہ بر آسماں کوس زد
دریں سر زمین بانگ افسوس زد

ہیہات ہیہات ذرہ امکان را کہ سرگردان بلا بہ حیرت

منقول از خاتمہ

و بست و پنجم بہادر خاں بسجود نیایش پیشانی بر افروخت ازاں سرتابی و

دستاں سرائے کہ در اسیر سپردن بکار بردہ بود لختی .قلعہ گوالیار برنشاوند و والا مہر شاہنشاہی اورا برخواند۔

منقول از دفتر چہارم[۳۵]

شب پنج شنبہ بست و ششم رمضان ہزار و دہ پس از ہشت ساعت و چہل و دو دقیقہ سرچشمہ را مجمل گذارہ شد و یازدہم سال از چہارم دور فرخی۔

نو روز شد و غم از جہاں برطرف است
شبنم بر برگ ہمچو در در صدف است

منقول از خاتمہ

مکش بخود قلم زور چین پیشانی
درین حریم ادب با قضا مجادلہ چیست[۳۶]
اگر جنازہ ان رہنماے کل بگذشت
مسافرانِ ابد را سبیلِ قافلہ چیست (کذا)[۳۷]

منقول از "چہار گلشن"

اجزاے چند مسمی بہار گلشن مولفہ مظہر دانش و بینش و منتخب نسخہ آفرینش مجموعہ فہرست معانی فہرست مجموعہ سخندانی برگزیدہ زمن راے چترمن کہ مشتمل است بر احوال اخیار رابجہاے تلدار و بادشاہان ذوی الاقتدار۔

منقول از خاتمہ

بعد فوت شدن ماتا سندری بر سجادہ لو جانشین گردید چنانچہ بعد یک سال او ہم فوت کرد ایں ہر دو در دہلی بودند (۷۶ الف) حالاھم سکہاں را جز ہستی سنگھ پسر اجیت سنگھ پرستش گاہ دیگر نماندہ و لو در متھرا بھعیت خوب با صد دو صد کس میماند۔

منقول از "مخزن الفتوح"

ثنائے صناعی کہ ستائش شمع وجود را در ظلمت شبستان عدم روشن کردہ اصناف بدائع مخلوقات را ....

منقول از خاتمہ

مر این نامہ خوبست یا آنکہ زشت
بپای قلم سر بسر در نوشت
مگر ماندم نام ازیں یادگار
ز خاکم پس آنکہ سازند خشت

منقول از "تاریخ بادشاہان ہند"

سلطنت او ششماہ و بیست ہفت روزہ سلطنت رضیہ بنت سلطان شمس الدین سہ سال و ششماہ سلطان معز الدین بہرام شاہ بن سلطان شمس الدین سلطنت او بیست سال و یکماہ سلطان علاؤالدین مسعود شاہ بن سلطان

- - -

منقول از خاتمہ

نظام الدین کہ اشتہار عام ندارد بلوازم حکومت قیام نمود مملکت سند را در ایام سلطنت او رونقی پدید آمد و او باسلطان لنگاہ والی ملتان ہم عصر بود و در زمان (کذا)[۳۸]

("تحقیق" سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۴)

حواشی

۱۔ ۱۸۰۸ء-۱۸۵۳ء اس کے حالات زندگی، اس کی مرتبہ
"The History of India as told by its own Historians"
کی پہلی جلد (لندن، ۱۸۶۷ء) ص xxxix-xxviii نیز
"Dictionary of Indian Biography" مرتبہ - سی ای بک لینڈ (Buckland)

(C.E.) (لندن، ۱۹۰۶ء) ص ۳۵-۱۳۶ میں شامل ہیں۔

۲۔ آٹھ جلدیں، مطبوعہ۔ لندن ۱۸۶۷ء-۱۸۷۷ء نیز عکسی اشاعت، لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۳۔ اس کے علاوہ ایلیٹ کی تصانیف یہ ہیں۔

Index to the Historians of Mohammadan India" (۱)

"Bibliographical

مطبوعہ۔ ۱۸۴۹ء اس کی آٹھ جلدوں میں ضخیم تاریخ ہند، اسی کی توسیعی صورت ہے۔

(۲) "Supplement to the Glossary of Indian Terms" مطبوعہ۔ ۱۸۴۶ء۔

(۳) "Memoirs of the History, folklore and distributions of the races of the N.W.P. مطبوعہ۔ ۱۸۶۹ء اسے جان بمز (John Beams) نے مرتب کیا تھا۔

۴۔ ۷ ستمبر ۱۸۴۷ء، مخزونہ "Elliot Collection" برٹش میوزیم، لندن، ۲۰۶۵، Or ص ۷۰ الف، ۷۱ الف۔

۵۔ حالی، تصنیف مذکور، ص ۴۲۔

۶۔ ایضاً، ص ۴۲-۴۶ اس عرصے میں صرف دو مرتبہ ۱۸۵۰ء میں اور ۱۸۵۳ء میں روہتک جانے کا اتفاق ہوا۔ ایضاً، ص ۴۶۔

۷۔ ایضاً، ص ۴۹-۵۰

۸۔ ایضاً، ص ۴۹، ۵۲، ۹۵۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۱۰۔ ملاحظہ فرمایئے، ایلیٹ کی تاریخ ہند، جلد ا میں اس کا تحریر کردہ پیش لفظ، ص ۷-۱۷۔

۱۱۔ جان ڈاؤسن، جلد اول، ص XXIX

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً، جلد ۸، ص ۴۳۱۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۳۰-۴۳۱۔

۱۵۔ قبل ازیں' محض اس خط کا ایک آزاد انگریزی ترجمہ "Muslim University Journal" شمارہ ۲' ۱۹۳۵ء' ص ۱۴۹۔۱۷۳ میں اشرف علی خاں نے شائع کیا تھا۔

۱۶۔ جب کہ مولوی سید بندہ علی کے نام ان کا تحریر کردہ خط مورخہ ۴ جنوری ۱۸۴۹ء اولین دستیاب خط تھا۔ مشمولہ "مکتوبات سر سید" جلد اول' مرتبہ اسماعیل پانی پتی (لاہور' ۱۹۷۶ء) ص ۱۵۰۔۱۵۱۔

۱۷۔ مثلاً" چارلس اسٹوارٹ(Charles Stewart) کی مرتبہ

"A Discriptive Catalogue of the Oriental Library of the Late Tippoo Sultan." (کیمبرج' ۱۸۰۹ء) یا ۱۸۳۷ء میں ظہور علی بریلوی کی مرتبہ

"فہرست کتب قلمی و مطبوع کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی ۔ ۔ ۔ مع کتب خانہ فورٹ ولیم ۔ ۔ ۔ کلکتہ ۔ ۔ ۔ " (کلکتہ' ۱۸۳۷ء) یا پھر متعدد قلمی فہارس' جن کی نشاندہی چارلس ریو(Charles Rieu) کی

"Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum"

جلد سوم (لندن' ۱۸۸۳ء) ص ۱۰۳۷ ب' ۱۰۵۹ ب تا ۱۰۶۲ ب سے ہوتی ہے۔

۱۸۔ مصنف خواجہ نعمت اللہ ہروی۔ ایلیٹ نے اس تصنیف کا نام "مخزن افغانی و تاریخ خان جہان لودی" تحریر کیا ہے۔ (جلد پنجم' ص ۶۷) جب کہ یہ "تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی" کے نام سے معروف ہے۔ (سی اے اسٹوری (C.A. Story)

"Persian Literature" جلد اول (لندن' ۱۹۵۳ء) ص ۳۹۳)' مطبوعہ' مرتبہ' ایس ایم امام الدین' دو جلدیں' (ڈھاکہ' ۱۹۱۰ء) اردو ترجمہ ۔ ڈاکٹر بشیر حسین (لاہور ۱۹۷۸ء)

۱۹۔ ایلیٹ نے اس شخص سے بھی امپرل لائبریری دہلی میں موجود چند تاریخی مخطوطات کے بارے میں استفسار کیے تھے' جوابات مخزونہ ذخیرۂ ایلیٹ' برٹش میوزیم لندن Or ۲۰۷۳' فولیو ۳۴۔۳۷' ممکن ہے یہ وہی شخص ہو جس کا نام بطور وقائع نویس اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران انگریزوں کے ایک مخبر

کی حیثیت میں ملتا ہے۔ مثلاً" چارلس بال (C. Ball) "History of Indian Mutiny" (لندن، سنہ ندارد) جلد اول، ص ۱۴۱، ایچ ایل او گیریٹ (Garret "H.L.O. "Trial of Mohammad Bahadur Shah" (لاہور، ۱۹۳۲ء) ص ۱۳۱-۱۳۲۔ میرزا حیرت دھلوی "چراغ دہلی" حالیہ عکسی اشاعت (دہلی، ۱۹۸۷ء) ص ۱۸۰-۱۸۱ و نیز اس کا روزنامچہ واقعات دہلی، ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء سے ۲۰ مئی ۱۸۵۷ء تک مشمولہ "ایضاً" ص ۷۹-۸۱، یہاں اسے پیشے کے لحاظ سے بساطی کہا گیا ہے۔

۲۰۔ تصنیف سید احمد خاں، مطبوعہ اکبر آباد، ۱۸۴۰ء

۲۱۔ حسین خان افغان، بحوالہ "جام جم" مشمولہ "مقالات سرسید" مرتبہ اسماعیل پانی پتی، جلد ۱۶، لاہور، ۱۹۶۵ء ص ۷۳۔

۲۲۔ صدر امین دہلی، سید احمد خاں کے خالو، "جام جم" ص ۷۴۔

۲۳۔ تصنیف معتمد خاں۔

۲۴۔ "چہار گلشن" "جام جم" ص ۷۳۔

۲۵۔ تصنیف شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

۲۶۔ "جنگ نامہ"

۲۷۔ تصنیف امیر حسن سجزی دہلوی۔

۲۸۔ اس وقت دہلی کے صدر امین تھے۔ بحوالہ مرزا نصیر الدین "وقائع نصیر خانی" مشمولہ "علم و عمل" (وقائع عبدالقادر خانی) مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۱ء ص ۵۳،۵۴۔

۲۹۔ سید احمد خاں نے اسے یہاں چنی "لال" لکھا ہے، جب کہ بیشتر چنی لعل لکھا ہے۔

۳۰۔ تصنیف ابوالفضل۔

۳۱۔ فی الاصل اس فہرست کی ترتیب افقی تھی، اسے یہاں سہولت کی خاطر عمودی ترتیب بنا دیا گیا ہے۔

۳۲۔ اختر لونی David Ochterlony (۱۷۵۸ء-۱۸۲۵ء)

۳۳۔ یہاں "طبقہ چہارم" دوبارہ لکھ دیا گیا ہے۔

۳۴۔ یہ کتاب "طبقات اکبری" ہے، جو ممکن ہے اس وقت تک سید احمد خاں

کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اگرچہ یہ پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی، لیکن اس کے متعدد قلمی نسخے عام رہے ہیں۔

۳۵۔ مشمولہ جلد سوم (طبع کلکتہ) ۱۸۷۷ء ص ۸۰۲۔

۳۶۔ یہ شعر مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتا۔

۳۷۔ قلندر روزسیہ بر سر جہان ورنہ
مسافران ابد را سبیل قافلہ چیست
اگر جنازۂ آں رہنمای کل بگذشت
بدان کہ عمر ابد یافت ست ولولہ چیست

(طبع کلکتہ ۔ جلد سوم ص ۸۴۲)

۳۸۔ "نظام الدین کہ اشتہار بجام نندا دارد بعد از جام سنجر بلوازم حکومت قیام نمود، و مملکت سند را در زمان حکومت او رونقی پدید آمد و او با سلطان لنگاہ والی ملتان معاصر بودہ و در زمان .... " "طبقات اکبری" طبع کلکتہ، جلد سوم ۱۹۳۵ء ۔ ص ۵۱۷۔

نوادر شبلی

شبلی کے مقالات، خطبات اور مکتوبات کی اب تک گیارہ جلدیں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے۔ "مقالات شبلی" آٹھ جلدیں، "خطبات شبلی" ایک جلد، اور "مکاتیب شبلی" دو جلدیں، ان کے علاوہ ان کی غیر مدون تحریروں کا ایک مجموعہ مشتاق حسین نے مرتب کیا، جو مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا۔ اس عرصہ میں ان کی بعض غیر مدون تحریریں رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں بھی شائع ہوئیں۔ پھر ان کے چند غیر مطبوعہ مکاتیب مجلہ "نقوش" (لاہور) کے "خطوط نمبر" میں شائع ہوئے۔ ذیل میں شبلی کی جو تحریریں پیش کی جا رہی ہیں وہ مذکورہ کسی مجموعہ یا مجلہ میں شامل نہیں ہیں۔ تمام حواشی مرتب کے تحریر کردہ ہیں۔

کتب خانہ خدا بخش، پٹنہ[1]

ایک مدت سے ہم اس کتب خانہ کا شہرہ سنتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں بعض تاجر ہیں جو قلمی نایاب کتابیں جا بجا سے بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو نہایت گراں قیمت پر بیچتے ہیں۔ ہم جب کبھی ان سے ملے اور کم یاب نسخوں کی فرمائش کی، تو

انہوں نے کہا کہ اس قسم کی کتابیں سب سے پہلے مولوی خدا بخش[۲] کے پاس جاتی ہیں، کیونکہ ہمارے ملک میں کوئی شخص ان سے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا۔ ان باتوں نے ہم کو کتب خانہ مذکور کا نہایت مشتاق بنا رکھا تھا۔ اسی شوق نے آخر پٹنہ پہنچایا اور چار دن وہاں رہ کر ہم نے اس نادر کتب خانہ کی سیر کی۔ اس بات کا افسوس رہا کہ فرصت نہایت کم تھی۔ سینکڑوں بیش بہا کتابیں تھیں اور ہمارا یہ حال تھا کہ۔

بداں پروانہ می مانم کہ افتد در چراغانی

ممالک اسلامیہ میں جو مقامات اسلامی تصنیفات کے مخزن سمجھے جاتے ہیں وہ حرمین، قاہرہ، دمشق، قسطنطنیہ ہیں۔ قاہرہ کے کتب خانہ خدیو کی فہرست تین جلدوں میں چھپ کر حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ قسطنطنیہ میں کم و بیش ۴۰ کتب خانے ہیں، جن میں سے اکثر کی فہرستیں کشف الظنون (مطبوعہ لندن) کے آخر میں ہیں۔ حرمین کے کتب خانے ہم نے خود دیکھے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ہندوستان میں بھی چند عمدہ کتب خانے موجود ہیں۔ اگرچہ ان کتب خانوں کی حیثیتیں اور خصوصیتیں مختلف ہیں اور اس وجہ سے ان میں موازنہ نہیں ہو سکتا تاہم اجمالاً" یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی خدا بخش خاں کا کتب خانہ، جس کا اس وقت ہم ذکر کر رہے ہیں، اپنی خصوصیات کے لحاظ سے روم و مصر و عرب و ہند کے نامور کتب خانوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ مولوی خدا بخش خاں نے جس اہتمام اور زر خطیر کے صرف سے کتابیں بہم پہنچائی ہیں اس کی نظیر سے تمام ہندوستان خالی ہے۔ کیا یہ کچھ کم تعجب کی بات ہے کہ ایک معمولی حیثیت کا وکیل، جس کے پاس کچھ جائیداد نہیں اور جس کی آمدنی صرف ضلع کی وکالت پر محدود ہے، ایک کتب خانہ کی تیاری میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف کر دے؟ بے شبہ ایسا اولوالعزم شخص ان نامور قدیم مسلمانوں کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے،
جن کی حوصلہ مندیوں کا ہم افسانہ سنایا کرتے ہیں۔

اس آرٹیکل میں ہم کتب خانہ کی ایک مختصر رپورٹ پیش کر کے ان خصوصیتوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں' جن کی وجہ سے کتب خانہ نے یہ ناموری حاصل کی ہے۔

کتب خانہ کی بنیاد اول مولوی خدا بخش خاں کے والد مرحوم' مولوی محمد بخش[۳] نے ۱۸۲۸ء میں قائم کی۔ ۱۸۷۶ء میں جب انہوں نے انتقال کیا' تو ایک ہزار چار سو کتابیں کتب خانہ میں موجود تھیں' جن میں اکثر قلمی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد مولوی خدا بخش خاں نے نہایت اہتمام سے ان پر توجہ کی۔ عرب' مصر' فرانس' لندن اور ہندوستان کے مختلف اطراف سے کتابیں بہم پہنچائیں۔ ۱۸۹۰ء تک وہ ایک پرائیویٹ کتب خانہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۲۴ر نومبر ۱۸۹۰ء کو ایک عام جلسہ اس مکان میں منعقد ہوا' جس کو مولوی خدا بخش خاں نے لائبریری کی غرض سے تعمیر کرایا ہے۔ نواب احمد علی خاں[۴] جلسہ کے پریسڈنٹ تھے اور شہر کے بڑے بڑے امراء و بزرگ شریک تھے۔ سیکرٹری نے اول اس خط و کتابت کا مضمون پڑھا جو کتب خانہ کے انتظام کی بابت گورنمنٹ سے ہوئی تھی۔ پھر باتفاق رائے طے ہوا کہ کتب خانہ پبلک قرار دیا جائے اور فلاں فلاں اشخاص اس کتب خانہ کے ممبران انتظامی کمیٹی قرار پائیں (پٹنہ گزٹ' مطبوعہ ۵ر دسمبر ۱۸۹۰ء نے ان لوگوں کے نام تفصیلاً لکھے ہیں) دوسرا ریزولیشن یہ پاس ہوا کہ "سر اسٹوارٹ بیلی[۵] لفٹیننٹ گورنر نے کتب خانہ کے ساتھ جو ہمدردی ظاہر کی ہے اور اس کو مدد دی ہے' اس کے شکریہ کی چٹھی ان کی خدمت میں ارسال کی جائے۔"

کتب خانہ کی ماہوار آمدنی جو اس کے انتظامی مصارف کے لئے درکار ہے' اس وقت تک سوا سو روپیہ کے قریب ہے۔ اس میں ۵۰ روپیہ ماہوار گورنمنٹ کی امانت ہے جس کو لیفٹیننٹ گورنر سر اسٹوارٹ بیلی نے بذریعہ ایک باضابطہ چٹھی کے منظور کیا ہے۔ باقی ۲۵ روپیہ ماہوار کی جائیداد میر ابو صالح زمیندار کڑا ضلع گیا

نے وقف کی ہے۔ اس کے علاوہ چندہ کا سرمایہ ہے' جس کی تعداد وصول شدہ اس وقت تک سات ہزار آٹھ سو روپیہ ہے۔ اس سے پہلے ایک پبلک کتب خانہ کے لئے عام چندہ ہوا تھا۔ جس میں دو ہزار پانچ سو روپیہ جمع ہو گئے تھے۔ وہ روپیہ گورنمنٹ میں جمع تھا۔ گورنمنٹ نے وہ رقم بھی اسی کتب خانہ کو عنایت کر دی۔ کتب خانہ کی بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ پٹنہ کے بڑے بڑے معزز رئیس اس کے حامی ہیں' جن میں جناب قاضی سید رضا حسین کا نام بھی شامل ہے' جو اپنی قومی فیاضیوں کی وجہ سے ہر ایک قسم کی عزت اور شہرت کے مستحق ہیں۔ کتب خانہ کا مکان نہایت خوبصورت اور عالیشان ہے۔ ایک طرف کے برآمدہ کا تمام فرش سنگ مرمر کا ہے۔ باقی فرش سنگ سپید و سنگ سیاہ کی منبت کاری ہے۔ الماریاں نہایت قرینہ سے سجائی گئی ہیں۔ میز' کوچ اور بہت سی خوبصورت کرسیاں ہر کمرہ میں موجود ہیں۔

جس قدر کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں' ان کی تین قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔

وہ کتابیں جو ہندوستان میں نایاب ہیں اور اپنے باب میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہیں' ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

فن حدیث و رجال میں ۔ اطراف مزی تمام و کمال درچار جلد' النکت الظرف علی الاطراف لابن حجر' الادب المفرد بخاری' الالمام فی احادیث الاحکام لابن دقیق العید' کتاب العلل دار قطنی' کتاب الاسماء والصفات بیہقی' مستدرک حاکم' جمع بین الصحیحین لعبدالحق الاشبلی الاندلسی المتوفی ۵۸۲ھ تلخیص الجبیر لحافظ بن حجر و کاشف ذہبی ۔بغیتہ العلماء والرواۃ السخاوی' طبقات ابو یعلیٰ' طبقات اللغتہ ابن رجب حنبلی' تاریخ ابن عساکر دمشقی ناقص' مراتب الاجماع لابن حزم الظاہری۔

ادبیات میں ۔ تہذیب اللغات ازہری' جمہرہ ابن درید فی اللغتہ' خصائص ابن جنی'

شرح دیوان متنبی از ابن جنی' الجامع الکبیر لابن الاثیرالجزری' شرح حماسہ از مرزوقی' شرح سبعہ معلقہ از ابن نخاس' شرح مفتاح سکاکی از سید شریف و علامہ تفتازانی نزہتہ الالباب' کتاب المصادر لابی بکر محمد بن عبداللہ البتی' برہان فی اعجاز القرآن لزکی الدین ابن الاصبع۔

فلسفہ و طب میں ۔ شفاء بو علی سینا تمام و کمال' مجموعہ رسائل فارابی' رسائل ارسطو مترجمہ در عربی' منطبقات افلاطون' کلمات افلاطون' رسالہ یعقوب کندی' رسالہ اسکندرا فردوسی' اثولو جیالارسطو' مااختصرہ حکماء الاسکندریہ من کتب ارسطو' مباحث مشرقیہ امام رازی' کتاب سنان بن ثابت فی حرکات الشمس' کتاب ارشمیدس تعلیقات بن سینا' تلویحات شیخ الاشراق خمسہ باقر داماد' شرح تلویحات لابن کمونہ' کنزل الفوائد حنین بن اسحاق' من لا یحضرہ الطبیب لابی بکر الرازی' کناش بقراط' شرح عبداللطیف بغدادی برفصول بقراط' کتاب الادویہ لدیا سقوریدوس مترجمہ اصطفن بن سبیل' کتاب التشریح و آلات ابن زہرلوی مصور' رسائل ابوریحان بیرونی و ابراہیم بن سنان بن ثابت بن قرہ فی سایر اعمال الہندسہ۔

اس کے علاوہ فقہ و اصول و قرات میں اور بہت سی نایاب کتابیں ہیں جن کو ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

دوسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جو نہایت قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں اور بلحاظ قدامت کے ایک یادگار خیال کی جاسکتی ہیں۔ قیسری کا ایک رسالہ ہے جو ۴۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک قرآن ہے جس پر سنہ کتابت نہیں لکھا ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ خط کوفی ہے اور کاغذ نہایت قدیم ہے۔ جا بجا حرف اڑ گئے ہیں۔ بہت بڑا قرینہ یہ ہے کہ تمام قرآن میں زیر زبر رکوع نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بہ ترتیب بھی نہیں ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود کے نسخہ کی نقل ہے۔ ان کے علاوہ اور متعدد کتابیں ہیں جو آٹھ آٹھ سو برس کی لکھی ہوئی ہیں۔

تیسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جو کسی مشہور کاتب یا خود مصنف کی یا مصنف کے زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں یا بڑے بڑے علماء کے استعمال میں رہی ہیں اور ان کے دستخط و اجازہ سے مزین ہیں۔ ہمارے ملک میں تو اس قسم کی چیزوں کی چنداں قدر نہیں ہے لیکن یورپ میں ان چیزوں کو یادگار سمجھا جاتا ہے اور ان کے بہم پہنچانے میں لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے کہ لندن میں ایک قلمی کتاب ۱۴ ہزار روپیہ کو بکی جس کی خوبی صرف یہ تھی کہ وہ نہایت قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی تھی۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہندوستان میں صرف مولوی خدا بخش خاں ایسے شخص ہیں جنہوں نے ان چیزوں کے لئے زر خطیر صرف کرنے میں یورپ کے حوصلہ مندوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں ایک قرآن ہے جو یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یاقوت مستعصم باللہ عباسی کے عہد کا مشہور خطاط تھا۔ دعائے سیفی کا ایک نسخہ بھی یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس نسخہ پر کتب خانہ شاہجہانی و عالمگیری کی مہریں ہیں۔ شاہجہاں کی مہر کے نیچے لکھا ہے "سی صد و پنجاہ و پنج روپیہ" قصیدہ بردہ نوشتہ قاضی ظہرائے حنبلی جو انہوں نے بایزید یلدرم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ شاہنشاہ نامہ جس کو محمد ثالث نے لکھوایا تھا۔ تمام مطلا و مذہب اور کل معرکوں کی طلائی تصویریں بنی ہیں۔ تاریخ تیموریہ اس نسخہ پر شاہجہاں کے دستخط ہیں اور لوح پر لکھا ہے کہ حکم والا صادر شد کہ قیمت این کتاب یکصد و پنجاہ مہر قرار یافت۔ اس میں بھی تمام معرکوں کی طلائی تصویریں بنی ہیں اور مختلف مصوروں کے ہاتھ کی ہیں۔ ہر موقع پر مصور کا نام بھی لکھا ہے۔ مولوی خدا بخش خاں نے یہ دونوں نسخے تین ہزار پانچ سو روپیہ کو خریدے ہیں۔ بہت سی حدیث و فقہ کی کتابیں ہیں جن پر حافظ بن حجر' جلال الدین سیوطی ابن فہد ہاشمی' جمال الدین محدث اور بڑے بڑے اساتذہ کے دستخط ہیں اور عبارتیں ان کے ہاتھ کی لکھی ہیں۔

ابن عساکر کی تاریخ دمشق نہایت کمیاب کتاب ہے۔ اس کی دو جلدیں

یہاں موجود ہیں اور مصنف کے نسخہ مفرد سے منقول ہیں۔ دیوان جامی خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ باقر داماد و بہاؤالدین عاملی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بیاضیں ہیں۔ نہایتہ ادراک پر خود مصنف و جلال الدین دوانی و غیاث منصور کے دستخط ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں کتابیں ہیں۔

یہ کتب خانہ جس فیاضی اور زر خطیر کے صرف سے تیار ہوا ہے اس کے اندازہ کرنے کے لئے ہم بعض کتابوں کی قیمت لکھتے ہیں' جو مالک کتب خانہ نے ادا کی۔

قرآن مجید و جوشن کبیر صماسہ ۔ حمائل شریف ۔ قرآن شریف سماء۔ جامع الاصول ۔ مجالس خمسہ سعدی مزین بدستخط شاہجہاں اسماء۔ کلیات خاقانی پونڈ ۔ شیوخ بخاری ما۔ کتاب سیبویہ ۔ ما۔ طبقات ابو یعلی نوشتہ ۷۲۳ھ ماللع۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتب خانہ' پٹنہ اور پٹنہ والوں کے لئے بڑے فخر کی چیز ہے۔ بلکہ ہندوستان کے عام مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس کیفیت کے بیان کرنے میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ جب اس کی فہرست' جو آج کل زیر طبع ہے' چھپ کر شائع ہو گی تو لوگوں کو اس کی خوبیوں سے پوری اطلاع حاصل ہو گی۔ ہم مولوی خدا بخش خاں صاحب کو ان کی اس کامیابی پر دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے شہر میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس دولت کی قدر کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

تقریظ[۶]

قدیم زمانہ میں شخصی سلطنت کے اصول نے فن تاریخ پر یہ اثر کیا تھا کہ تاریخی تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا صرف سلاطین کے واقعات اور حالات ہوتے تھے۔ ملک اور قوم کے حالات سے مطلق بحث نہیں ہوتی تھی۔ یہی سبب

ہے کہ سینکڑوں ہزاروں تاریخوں کو پڑھ کر اگر پتہ لگانا چاہو کہ اس زمانہ کا تمدن تہذب و معاشرت کیا تھی تو تم کو بالکل ناکامی ہو گی۔ لیکن اب مغربی تہذیب کے اثر نے یہ حالت بالکل بدل دی ہے۔ آج سب سے زیادہ جس چیز کی تلاش ہے وہ قومی اور ملکی معاملات ہیں اور موجودہ تصنیفات میں خصوصیت کے ساتھ ان ہی باتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ انداز صرف زمانہ حال کی تاریخ میں نبھ سکتا ہے کیونکہ قدیم ذخیروں میں یہ سامان بہت کم موجود ہے۔ اس لئے آج کتنی ہی کوشش اور کاوش کی جائے پوری کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں اگر کوئی مصنف غیر معمولی دیدہ ریزی سے اس قسم کے کچھ واقعات بہم پہنچائے تو بے انتہا قدردانی کا مستحق ہو گا۔ ہم جس کتاب پر ریویو کر رہے ہیں اسی قسم کی ایک کامیاب تصنیف ہے۔ ابتداء اسلام سے عرب و عجم کے سینکڑوں خاندان ہندوستان میں آ کر آباد ہوئے' جن کے کارنامے چہرۂ تاریخ کے خط و خال ہیں۔ ان ہی میں نوائط کا خاندان ہے جو آج سے سینکڑوں برس پہلے ہندوستان میں آیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ مدراس اور دکن کے حصوں میں پھولا پھلا۔ آج یہی خاندان امتیاز کے ساتھ قائم ہے اور اس کی یادگاریں ان ممالک میں ہر جگہ ایک خاص نام و نمود رکھتی ہیں۔ یہ کتاب اسی خاندان کے حالات میں نواب عزیز جنگ؎ بہادر کی تصنیف ہے۔ اگرچہ نواب صاحب کو اس مرحلہ کے طے کرنے میں بعض قدیم تصنیفات سے مدد ملی ہے' کیونکہ خود اسی خاندان کے مصنف نے "انساب النوائط" وغیرہ کے عنوان سے ایک دو کتابیں^۸ لکھی ہیں۔ جو اس مرحلہ میں گویا چراغ راہ ہیں۔ لیکن نواب صاحب نے جس قسم کے واقعات اور حالات بہم پہنچائے ہیں اور ان کے لحاظ سے یہ تصنیف گویا اس باب میں پہلی تصنیف ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں مضامین کی جو فہرست ہے اس سے بہ آسانی اس دعویٰ کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایسی تحقیقات کے بہم پہنچانے میں چونکہ ہر قسم کی تصنیفات کا اعتبار کرنا پڑا اس لئے ایک نکتہ چیں کو اعتراض کا موقع ہاتھ آ سکتا ہے۔ مثلاً

صفحہ ۲۹ میں محدث طبری⁹ کی جو عبارت نقل کی ہے وہ اصل کتاب سے نہیں بلکہ "گلستان نسب"¹¹ اور آزاد بلگرامی⁸ کے حوالہ سے ہے۔ اصل کتاب آج چھپ گئی ہے⁴ اور اس میں اس عبارت کا ہم کو پتہ نہیں ملتا۔ لیکن اس قسم کے امور میں ایک مصنف اوروں کی رائے کا پابند نہیں ہو سکتا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ جس شخص نے حوالہ دیا ہے وہ مثبت ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس نے طبری کی چودہ جلدوں میں سے کسی موقع پر یہ عبارت دیکھی ہو۔ جب تک اتنی بڑی کتاب کا لفظ لفظ مطالعہ نہ کیا جائے ایک معتبر ناقل کے حوالہ کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔

آج دلی اور لکھنؤ والوں نے زبان کی پابندی کا بڑا شور و غل مچا رکھا ہے۔ تذکیر و تانیث کے متعلق ان نخوت پرستوں کی خاطر ملحوظ رکھنے میں ایک مصنف کو بہت سی مجبوریاں ہیں جس کی مادری زبان دکھنی ہے۔ کسی دوسری زبان کے محاورہ میں علم کے ذریعہ سے کیسی ہی قابلیت بہم پہنچائی جائے لیکن کسی نہ کسی موقع پر مادری زبان کی جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے۔ مثلاً" نواب صاحب نے یادگار کو کہیں مونث لکھا ہے اور کہیں مذکر۔ لیکن دلی اور لکھنؤ والے اس کو عموماً" مونث لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں "فرہنگ آصفیہ" کی تحقیق نواب صاحب کے لئے کافی ہے۔ اسی قسم کے اور جزئیات بھی ہیں لیکن ایسی چھوٹی باتیں کتاب کی قدر و قیمت کو کم نہیں کر سکتیں۔ ہم بہرحال نواب صاحب کی تحقیقات اور تدقیقات کی داد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ تمام ملک ایسی نادر تصنیف کی قدر کرے گا۔

خاکسار۔ شبلی نعمانی (شمس العلماء)
ناظم سررشتہ علوم و فنون سرکار نظام و
معتمد انجمن ترقی اردو

دیباچہ[۱۳]

جدید تعلیم یافتہ کی نسبت عام شکایت ہے (اور وہ ناراض نہ ہوں تو غالباً" صحیح بھی ہے) کہ ان میں علمی مذاق نہیں پایا جاتا۔ ملک میں جس قدر تعلیم یافتہ ہیں' اس مناسبت سے تصنیفات و تالیفات کہاں ہیں؟ لیکن ہر کلیہ مستثنیات میں بھی ہوتے ہیں اور یہ چند ارباب علم ملک میں نظر آتے ہیں۔ انہی مستثنیات کی مثالیں ہیں۔ انہی قابل قدر لوگوں میں ہمارے مرحوم مترجم بھی ہیں جن کی کتاب کا ہم ریویو کر رہے ہیں۔

مرحوم کا نام منشی احد علی[۱۴] ہے' وہ کاکوری کے اس مشہور خاندان کے ممبر ہیں جس کی تاریخ ابتداء سے آج تک ہمیشہ روشن اور نمایاں رہی ہے۔ انہوں نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ ابتداء ہی سے وہ علمی مذاق رکھتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے "صحیفہ زرین"[۱۵] کی ترتیب میں شرکت کی' علمی مضامین بھی لکھتے رہتے تھے' لیکن ایک مستقل اور مشکل علمی خدمت جو انہوں نے اپنے ذمہ لی' وہ بکلز ہسٹری کا ترجمہ تھا' یہ وہ زمانہ ہے جب میں حیدر آباد میں تھا اور انجمن اردو کا سیکرٹری تھا۔ انہوں نے مجھ کو اپنے ارادہ سے اطلاع دی اور چونکہ مجھ کو ان کی قابلیت پر اطمینان تھا' میں نے بہت مسرت سے ان کے ارادے کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے ترجمہ کا معتدبہ حصہ میرے پاس بھیجا اور میں نے اور احباب کی شرکت کے ساتھ اس کا ایک ایک حرف پڑھا اور ان کی اجازت سے کہیں کہیں عبارت میں دخل و تصرف بھی کیا۔

کتاب کا موضوع اس قدر مشکل ہے کہ اس کے مطالب کا اردو میں ادا کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی موضوع پر کیزو[۱۶] کی جو کتاب[۱۷] ہے' اور بکل کی کتاب سے آسان ہے' اس کا عربی میں ترجمہ ہو گیا ہے[۱۸]۔ ہم نے اس کتاب کو دیکھا ہے اور ہم کو بے تکلف کہنا چاہئے کہ ترجمہ کے فن میں ہمارے ہندی دوست نے مصری

ترجمہ سے علانیہ بازی جیتی ہے۔

کتاب دو جلدوں میں ہے۔ مرحوم نے پہلی جلد کے سات بابوں میں سے چھ کا ترجمہ کر لیا تھا۔ ان میں سے دو باب کا ترجمہ اس وقت شائع کیا جاتا ہے۔ مرحوم نے کتاب پر ایک نہایت مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس سے ان کی قابلیت علمی کا اندازہ ہو سکتا ہے' وہ بھی اس ترجمہ کے ساتھ ہے۔ باقی ابواب میں سے چھ باب کا ترجمہ تو خود مرحوم نے کر لیا تھا' ساتویں باب کا ترجمہ مرحوم کی یادگار میں ان کے بعض اعزاء کر رہے ہیں' اور یہ سب ایک جداگانہ حصہ کی صورت میں شائع ہو گا' بشرطیکہ پہلے حصہ کے شائع ہو جانے پر اس بات کا ثبوت مل سکے کہ قوم کا علمی مذاق ایسی خشک اور علمی تصنیفات کے خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہے۔

کتاب کے مصارف طبع کی مشکل' ہمارے آنریبل سر راجہ علی محمد خاں صاحب رئیس محمود آباد نے حل کی ہے۔ جن کی فیاضیاں اس قسم کے کاموں میں ہمیشہ صرف ہوتی رہی ہیں۔

شبلی ـ ۵ مئی ۱۹۰۹ء
لکھنو

ادیب (الہ آباد[۱۹])

ادیب کے حسن ظاہری میں کیا شک اور حسن معنوی میں بھی اردو کے کسی رسالہ سے کم نہیں۔ یا یوں کہئے کہ کوئی رسالہ اس سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب ایک محدود دائرہ سے آگے قدم بڑھانا چاہئے۔ اب تک جو کچھ ہو رہا ہے' یا اپنی داستانیں ہیں یا یورپ کی نہایت سرسری معلومات۔ اس سے زبان کی ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھتا۔ کوشش کی جائے کہ ہربرٹ اسپنسر[۲۰] اور ہکسلے[۲۱] وغیرہ کا فلسفہ اردو زبان میں آئے۔ انگریزی سے اردو میں جو کچھ منتقل ہو

رہا ہے اوچھے اور ادنیٰ درجہ کے معلومات ہیں۔ ان کو کہاں تک بار بار پڑھئے۔ یورپین معلومات کے لحاظ سے آج سے دس برس پہلے ہم لوگ جہاں تھے اب بھی وہیں ہیں۔

تقریر۲۲

آج اس خوشی کے موقع[۲۳] پر جو مولانا صاحب[۲۴] کی تہنیت کے لئے آراستہ ہے اس میں مجھے بھی احباب کے اور مولانا کی طرف سے کہا گیا ہے کہ میں بھی کچھ کہوں۔ میں آپ صاحبوں کے اتحاد اور نیک رویہ سے اور اس سے کہ آپ صاحبوں میں ایک عمدہ بات یہ ہے کہ ایک شخص کا منتخب ہونا اور سب اس کی ہدایت اور رہنموئی سے فائدہ لیتا دیکھتا ہوں اتنا خوش ہوتا ہوں کہ آپ صاحبوں کی طرف سے تہنیت میں بھی شریک بلکہ ایک جداگانہ تہنیت جناب مولانا کو میں اپنی جانب سے دینے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

میں افسوس کرتا ہوں اور حسرت سے کہتا ہوں کہ یہ بات ہم میں نہیں پائی جاتی۔ مجھے اکثر مجلسوں میں تقریر کرنے کے موقعے ملے ہیں۔ جس میں مجھے کچھ کہنے سکھانے کا کام پڑا ہے۔ لیکن جب میں آپ کی مجلسوں میں آتا ہوں تو کوئی نہ کوئی بات سیکھ کر جاتا ہوں۔ میں اس کیفیت کو اکثر موقعوں پر' بلکہ اخباروں میں بھی' ظاہر کیا ہوں (کرتا رہا ہوں؟)

میں ٹالریشن' جو اسلام کا اصل ہے' آپ ہی میں پاتا ہوں۔ اسلام کی یہی خاص خوبی ہے کہ خواہ کوئی ہو چینی ہو یا زنگی' عرب یا عجم' غنی یا فقیر' غلام ہو یا آزاد' جب اس نے اسلام قبول کیا تو اسلام نے اس کو اپنے دامن میں لے لیا۔ پھر اس کے حقوق دوسرے اسلامیوں کے برابر ہو گئے۔ اگر کوئی غلام نماز کی صفوں میں جا کر بادشاہ کے برابر بھی کھڑا رہ گیا تو اسلام اس کو منع نہیں کرتا۔ اگر کسی غلام

یا موچی ڈھیڑ ادنیٰ ذات نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد علم کا شوق کیا تو اس کی تعلیم سے کوئی مسلمان عالم متنفر نہیں ہوتا' اس کو مساوات کے ساتھ تعلیم دیتا ہے۔ یہی سبب ہے جو اسلام میں بڑے بڑے مستند علماء وہ لوگ بھی ہو گزرے ہیں جو غلام تھے۔ نیز غلام ان کی (کذا) لیاقت کے سبب سے اسلام قبول کرنے کے بعد اس حد تک پہنچے ہیں کہ ان کی سرداری و شاہی کو مسلمان لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ محمود غزنوی فاتح ہندوستان اس کا باپ سبکتگین غلام جو بادشاہ بھی ہوا ہے۔ بلکہ یہ تو غلام در غلام تھا کیونکہ الپتگین بادشاہ خود غلام تھا۔ سلطان نورالدین کا اور مشہور متنبی شاعر بلیغ جس کو مولانا جانتے ہیں اس کا ممدوح کافور اخشیدی مصر کا بادشاہ ایک غلام تھا۔ ٹالریشن جو اسلام میں ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اسی ہندو دھرم کو لیجئے کہ ایک وقت ان کا یہ حال تھا کہ اگر ان میں سے کسی نے مذہبی علم کا شوق ظاہر کیا تو ان کے گوسائیں اور علماء اتنا ہی نہیں کہ اس کو علم نہیں پڑھاتے بلکہ اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈالتے تھے۔ اسلام نے غیروں کے ساتھ بھی کس طرح برادرانہ روش اختیار کی ہے۔ میں مختصر ایک دو واقعے مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ یہی قریش جو خود کو تمام عرب میں سے سب سے برگزیدہ قوم سمجھتے تھے' اپنے مقابل میں کسی دوسرے کی شرافت نہ سمجھنے میں ان کی یہ حالت تھی کہ جنگ بدر میں قریش کی طرف سے جب عتبہ و شیبہ اور ولید بن عتبہ تین شخص لڑنے کے واسطے نکلے تو مسلمانوں کی طرف سے ان کے مقابلہ کے لئے عوف و معوذ پسران حارث اور عبداللہ بن رواحہ برآمد ہوئے۔ کفار نے ان سے پوچھا تم کون ہو اور کس قبیلہ سے ہو۔ انہوں نے جواب دیا ہم انصار میں سے ہیں۔ کفار بولے ہمیں تم سے کیا کام۔ ہمیں تم سے جنگ کرنے میں ننگ آتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بنی عم آکے ہم سے لڑیں۔ حضور نے یہ بات سن کر حضرت حمزہؓ' حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ کو جانے کا حکم فرمایا۔ باوجودیکہ قریش کا یہ امتیاز تھا مگر اسلام کے بعد آپ نے زینب بنت جحش کو' جو قریش کے

خاندان سے تھی، ایک آپ کے پروردہ، غلام زید کے ساتھ شادی کر دی اور کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ میں نے آپ صاحبوں کا بہت سا وقت صرف کیا اور مجھے آج کے موقع میں شامل کرنے کا اعزاز بخشا ہے۔ اس کا میں ممنون و مشکور ہوں۔

موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن[۲۵]

موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ پر پہونچ گیا ہے اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافہ کئے ہیں اس کے اعتبار سے ہماری قدیم تصنیفات ہمارے مقصد کے لئے کافی نہیں۔

قدیم تاریخوں کو پڑھ کر اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں عہد میں طریق تمدن اور طرز معاشرت کیا تھا؟ حکومت اور فصل مقدمات کے کیا آئین تھے؟ خراج ملک کیا تھا؟ فوجی قوت کس قدر تھی؟ ملکی عہدے کیا کیا تھے؟ تو ان باتوں میں سے ایک کا پتہ لگنا بھی مشکل ہو گا۔ خود فرمانروائے وقت کے طور طریقے اور عام اخلاق و عادات کا اندازہ کرنا چاہو تو وہ جزوی حالات اور مفید تفصیلیں نہ ملیں گی جن سے ان کی اخلاقی تصویر ایک بار آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جن واقعات کو بہت بڑھا کر لکھا ہے اور ہزاروں صفحے اس کی نذر کر دیئے ہیں وہ صرف تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی، اندرونی بغاوتیں، عمال کے عزل و نصب کے حالات ہیں۔ یہ واقعات بھی کچھ ایسے عامیانہ طریقے پر جمع کر دیئے ہیں کہ ان میں اسباب و علل کا مرتب سلسلہ معلوم ہوتا ہے، نہ ان سے کسی قسم کے دقیق تاریخی نتیجے مستنبط ہو سکتے ہیں .... تاریخ عالم کا یہ واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلہ میں بندھا ہوا ہے۔ ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج کا مستنبط کرنا، یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے اور یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع و ایجاد پر زیادہ ناز ہے وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے۔ اس سے میرا یہ

مقصد نہیں کہ اگلے مصنفوں کی کوششوں پر نکتہ چینی کروں۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا موجودہ اور آئندہ نسلیں ہمیشہ اس کی ممنون رہیں گی لیکن زمانہ کا ہر قدم آگے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ترقی کی جو حد کل مقرر ہو چکی تھی آج بھی قائم رہے گی۔ اس کے علاوہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر زمانہ کا مذاق مختلف ہے۔ جن باتوں کو قدما نے اس خیال سے نظر انداز کر دیا کہ یہ ایک جزوی اور عام معمولی باتیں تصنیف کی متانت کے شایاں نہیں آج انہیں کی تلاش ہے کہ اس عہد کی عام معاشرت اور طرز زندگی کا ان سے اندازہ کیا جائے۔ آج جو زبان (اردو) ہماری عام ضرورتوں کی کفیل ہے اس کے خزانے میں قومی تاریخ کا جس قدر سرمایہ ہے ضرورت سے بہت کم ہے۔ اردو اگرچہ دیکھتے دیکھتے ترقی کے بہت سے زینے طے کر گئی اور قریب ہے کہ وہ ایک علمی زبان کے رتبہ تک پہونچ جائے' لیکن علماء کا گروہ جو عربی زبان اور عربی تصنیفات کا مالک تھا اور اس وجہ سے تاریخی ذخیرے بھی گویا خاص اسی کے قبضہ اقتدار میں تھے اس کی طرف مطلقاً" ملتفت نہ ہوا۔

تصنیف و تالیف تو ایک طرف' ہمارے علماء اس زبان (اردو) میں خط و کتابت کرنا بھی عار سمجھا کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کچھ ایسی تیزی سے بڑھی کہ بہت سے لوگ اور خصوصاً" یہ سادہ مزاج گروہ اس کی رفتار ترقی کا اندازہ بھی نہ کر سکا۔ چونکا تو اس وقت جب وہ (اردو) ملک کی انشاء پردازی اور عام تصنیفات پر پورے اقتدار کے ساتھ قابض ہو چکی تھی اور میرا تو یہ خیال ہے کہ ان میں بہت سے اب تک وہی صحرائے عرب اور بہارستان فارس کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ نسلیں جنہوں نے حال کی آب و ہوا میں پرورش پائی البتہ اردو کا حق سمجھتے ہیں اور ان کی دلی خواہش ہے کہ اپنی ملکی زبان کو ترقی کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچائیں۔ اسی کا اثر ہے کہ ملک میں اردو انشاء پردازی کا ایک عام جوش پھیل گیا ہے اور ہر طرف سے نئی تصنیفات کی صدائیں آ رہی ہیں۔ لیکن چونکہ زمانہ کی پر پیچ ضرورتوں نے اس نئے گروہ کو بہت کم موقع دیا کہ عربی زبان پر دسترس پا سکے۔

اس لئے عربی تصنیفات سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکا اور قومی تاریخ کے اصلی خزانے اس کی آنکھوں سے چھپے رہ گئے۔ مجبورانہ پرزور اور ایجاد پسند طبیعتیں جو کسی طرح نچلی نہ بیٹھ سکتی تھیں تذکروں اور ناولوں پر جھکیں جس سے اتنا ضرور ہوا کہ اردو کی وسعت کا ایک قدم اور آگے بڑھا۔ لیکن افسوس اور عبرت کی جگہ ہے کہ جو زبان عربی و فارسی کو ہٹا کر ہماری علمی اور قومی زبان بنی وہ اسی خاصہ سے محروم رہ گئی جو قائم مقامی کی حیثیت سے اس کا ذاتی حق تھا۔ یہی ایک چیز (تاریخ) ہے جو قومی فیلنگ اور قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے اور اگر یہ نہیں تو قوم قوم نہیں۔

مکتوب بنام نواب وقار الملک[۲۶]

مطاعی۔

والا نامہ پہونچا۔ مسودہ پر آپ کی اصلاح نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ اگرچہ بعض جزئیات سے مجھ کو اختلاف ہے۔ میرا قیام کالج ابھی یقینی نہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ شاید یہاں کا تعلق حیدر آباد میں ناپسند ہو۔ ایک صاحب نے میرے لئے یہ تحریک پیش کی تھی کہ مجھ کو صرف چھ مہینے کام کرنا پڑے۔ باقی زمانہ (۳) مہینہ تعطیل رہتی ہے اور (۳) مہینہ تک صرف دو کلاسیں پڑھتی ہیں، کیونکہ یونیورسٹی کلاسوں[۲۷] .... نکل نہیں سکتا۔ اس کے لئے اسکول کے کسی عربی مدرس کے دو گھنٹے لئے جا سکتے ہیں اور چونکہ میری تنخواہ میں سے (۶۰۰ روپیہ) سال کی بچت ہو گی اس لئے اگر مدرس کو کچھ معاوضہ بھی دینا پڑے تب بھی کالج کا نقصان نہ ہو گا۔ یہ تجویز بظاہر مناسب ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ "الفاروق" نہایت اہتمام کے ساتھ چھپ رہی ہے۔ والتسلیم۔

شبلی نعمانی

۲۹ اکتوبر[۲۸]

مکتوب بنام ملا عبدالقیوم[۲۹]

مولانا[۳۰]

سب سے پہلے یہ گزارش ہے کہ آپ اس عریضہ کو بتامہا ملاحظہ فرمالیں۔ اس خیال سے نظرانداز نہ کریں کہ یہ ایک معمولی آدمی کی تحریر ہے۔ آپ سے مجھ کو سابقاً" محض رسمی تعلق تھا۔ لیکن اب ندوہ کے رابطہ سے خاص تعلق ہو گیا ہے جو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ جو خیال خیرخواہانہ دل میں آئے وہ ظاہر کروں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ ایک کام کے حاصل کرنے کے اگر دو طریقے ہوں اور ایک ان میں بالکل صاف اور بے خطر ہو تو ایسے طریقہ کو اختیار کرنا چاہیئے۔ آپ کا کیا مقصود ہے۔ قوم کو صنعت و حرفت کی تعلیم۔ اس مقصد کو آپ بغیر اس کے حاصل کر سکتے ہیں کہ گورنمنٹ کی طرز تعلیم پر اعتراض کیا جائے۔ موجودہ طرز تعلیم کو خود بنگالی جو سب سے بڑی پیداوار تعلیم حال کے ہیں برا کہتے ہیں۔ لیکن برا کہنے کے طرز مختلف ہیں۔

ہم کو اس قدر کہنا کافی ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سب ضرورتوں کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے ہم کو ایسی تعلیم کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیئے جو علاوہ نوکری کے اور ذرائع معاش پیدا کر سکے۔

آپ کی حیثیت محض شخصی حیثیت نہیں ہے۔ آپ ندوہ کے رکن انتظامی ہیں اور اس لئے آپ کا ہر لفظ ندوہ پر خاص اثر رکھتا ہے۔

گورنمنٹ پر اس طریقہ سے اعتراض کرنا ندوہ کے مقصد کے خلاف ہے اور ندوہ پر برا اثر پیدا کرے گا۔

میں نہایت لجاجت اور تضرع سے درخواست کرتا ہوں کہ نکتہ چینی کا یہ

طریقہ استعمال نہ فرمائیں۔

ہم کو اپنا کام کرنا چاہئے کسی پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔ صنعت و حرفت کی ضرورت خود ملک تسلیم کرتا ہے' اس کی بات کی ضرورت نہیں کہ تعلیم موجودہ کو علی الاعلان برا کہہ کے اس کی خوبی ثابت کی جائے۔

زمانہ کی حالت کا آپ سے بڑھ کر کون اندازہ داں ہو گا۔ اس لئے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

شبلی

۱۴ ستمبر ۱۹۰۳ء

مکتوب بنام مولوی مسیح الزماں خاں[۳۱]

مکرمی مولانا[۳۲]

السلام علیکم!

والانامہ پہونچا۔ الحمدللہ کہ یہ بحث باسلوب احسن طے ہوئی۔ مسودۂ اشتہار میں نے پہلے سے تیار کر کے مولوی عبدالحیٔ[۳۳] اور شروانی[۳۴] صاحب کے پاس بھیج دیا ہے۔ اب آپ مولوی عبدالحیٔ صاحب کو تاکیداً لکھئے کہ سرکار میں درخواست دے دیں ورنہ اس وقت تک اشتہار بھی شائع نہیں ہو سکتا۔ مضامین بقدر دو رسالہ کے میرے پاس تیار رہیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو لکھا ہے کہ وہ بھی کچھ مضمون دے دیں۔ ایک ہی شخص کے مضمون نہ ہونے چاہئیں۔ ایک دو پرچہ نکلنے کے بعد اور علماء اور اہل علم بھی مضمون نگاری کی طرف انشاء اللہ متوجہ ہوں گے۔ والسلام

شبلی

۲۴ شعبان ۱۳۲۱ھ

مکتوب بنام منشی امیر احمد[۳۵]

اردو شاعری کے آخیر تاجدار دو شخص تسلیم کئے گئے ہیں' امیر و داغ۔ امیر' یعنی منشی امیر احمد صاحب مرحوم' شاعری کے علاوہ بہت سے کمالات کے جامع تھے' یعنی اگر وہ شاعر نہ ہوتے تب بھی ایک نامور شخص ہوتے۔ اس بنا پر اور نیز ان کے کمال شاعری کے لحاظ سے ضرور ہے کہ ان کی مفصل اور جامع سوانح عمری لکھی جائے۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے اس ضروری کام کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ افسوس اس لحاظ سے اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ منشی صاحب موصوف کا سلسلہ تلامذہ نہایت وسیع ہے' جس میں متعدد ایسے حضرات موجود ہیں کہ جو اس فرض کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔

ہم اپنے معزز دوست مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب[۳٦] کے ممنون ہیں کہ انہوں نے گو سوانح عمری لکھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی لیکن اس کے لئے ایک بہت ضروری مصالحہ مہیا کر دیا۔

سوانح کا بڑا ضروری اور دلچسپ حصہ اس شخص کے روز مرہ کے حالات و معاملات و خیالات ہوتے ہیں۔ انسان کے خیالات اور انداز طبیعت کا پتہ زیادہ تر اس کی خط و کتابت اور مراسلت سے لگتا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے جناب منشی صاحب کے خطوط جا بجا سے بہم پہونچا کر ایک خاص طریقے سے مرتب کئے ہیں۔ جن سے اگر کوئی چاہے تو سوانح عمری کا بہت کچھ سامان حاصل کر سکتا ہے۔

کسی مصنف کے سوانح کا دوسرا ضروری حصہ اس کے کلام کی تقریظ و تنقید ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے ان خطوط کے دیباچے میں مختصر حالات کے ساتھ کلام پر ناقدانہ ریویو کیا ہے اور اس فرض کو ایسے بے لاگ طریقے سے ادا کیا ہے کہ استادی کے حقوق بھی نظر انداز کر دیئے ہیں۔

میری رائے جناب منشی صاحب مرحوم کے کلام کے متعلق ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو' لیکن میں اگر ان کا شاگرد ہوتا تو ایسی بے لاگ' بیدردانہ تنقید نہ کر سکتا۔

منشی صاحب مرحوم کی لپیٹ میں مرزا داغ بھی آ گئے ہیں اور جب ہمارے دوست کو استادی کا حق اظہار حق سے مانع نہ ہوا تو داغ کا کیوں پاس کرتے' اس بنا پر داغ کی کمزوریاں اور غلطیاں دکھائی ہیں اور اس میں اس بات سے مدد لی ہے کہ داغ کا علمی سرمایہ کچھ نہ تھا۔

لیکن اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہو گا اسی قدر بڑا شاعر ہو گا۔ یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔

فارسی میں دیکھئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی' انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا' تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں:

که آراست زلف سخن چوں عروس

جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں۔ غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں۔

بہرحال جو خدمات ہمارے دوست نے اردو علم و ادب کی کی ہے' اہل زبان اس کے ہمیشہ مشکور ہوں گے اور اگر میں اہل زبان ہوتا تو یقیناً" میں بھی مشکور ہوتا۔

احب الشاعرین و لست منہم

شبلی

۱۹ جنوری ۱۹۱۱ء

حواشی

۱۔ ۲۳ ر فروری ۱۸۹۱ء کی ایک یادداشت ۔ مشمولہ "خدا بخش لائبریری جرنل" شمارہ ۶ (پٹنہ' ۱۹۷۸ء) ص ۱۷۷۔۱۸۰ ۔

۲۔ پیدائش ۲ ر اگست ۱۸۴۲ء' چھپرا (بہار)' ابتدائی تعلیم کلکتہ میں حاصل کی' پٹنہ سے ۱۸۶۸ء میں وکالت کا امتحان کامیاب کیا اور وکالت شروع کی۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار سے "سند فضیلت" اور ۱۸۹۳ء میں "خان بہادر" اور ۱۹۰۳ء میں سی۔ آئی۔ ای کے خطابات دیئے گئے۔ ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۸ء تک مملکت حیدر آباد میں عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس رہے اور وہاں سے واپسی کے بعد دوبارہ وکالت شروع کی۔ ۳ر اگست ۱۹۰۸ء کو انتقال کیا۔ تفصیلات کے لئے متعدد ماٰخذ موجود ہیں' خصوصاً جادو ناتھ سرکار ۔
"Khuda Bakhsh, The Indian Bodly, Life and Character"
مشمولہ "خدا بخش لائبریری جرنل' شمارہ ۳ (پٹنہ' ۱۹۷۷ء) ص ۷۷۔۸۶' صلاح الدین خدا بخش "My father, His life and Reminiscences." مشمولہ "خدا بخش لائبریری جرنل" شمارہ ۱ (پٹنہ' ۱۹۷۷ء) ص ۱۔۵۱' سچیدا نند سنہا
"Some Eminent Behar Contempararies." (پٹنہ' ۱۹۴۴ء) ص ۱۔۱۱

۳۔ پیدائش ۱۸۱۵ء' ممتاز وکیل اور صاحب ذوق عالم۔

۴۔ کرنال کے نواب تھے۔ حکومت برطانیہ کے خیر خواہ رہے' اور خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا' جس کے صلہ میں انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ تفصیلات کے لئے ٹی۔ ڈبلیو۔ بیل
"An Oriental Biographical Dictionary" (لاہور' سن ندارد) ص ۳۸' ونیز نظامی بدایونی' قاموس المشاہیر" جلد اول (بدایوں' ۱۹۲۴ء) ص ۶۹۔۷۰

۵۔ Steuart Colvin Bayley' پیدائش ۱۸۳۶ء' ۱۸۵۶ء میں ہندوستان آیا' ملازمت کا آغاز بنگال سے ہوا' جہاں ممتاز عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۰ء تک لفٹیننٹ گورنر کے منصب پر فائز رہا' پھر واپس انگلستان چلا گیا۔ تفصیلات کے لئے سی۔ ای۔ بک لینڈ "Dictionary of Indian Biography" (لاہور ۱۹۷۵ء) ص ۳۱

۶۔ مشمولہ تاریخ النوائط مصنفہ نواب عزیز جنگ ولا' مطبوعہ ۱۹۰۴ء ۔ یہ تصنیف " خاندان نا ید کے نسب' واقعات ہجرت' مذہبی خیالات و خصوصیات' رسم و رواج اور

مشاہیر اور القاب کے تذکرہ پر مشتمل" تھی۔ اس کے بعض حصوں پر مشتمل ایک نیا ایڈیشن "ولا اکیڈمی' حیدر آباد (بھارت) سے شائع ہوا ہے۔"

۷۔ ایک ممتاز عالم' محقق' مصنف اور شاعر' احمد عبدالعزیز نام' ولادت ۲۸۔ دسمبر ۱۸۶۰ء بمقام نیلور (مدراس) ۱۸۷۹ء میں حیدر آباد دکن گئے۔ فارسی کی تحصیل محمد حبیب اللہ ذکاء (شاگرد غالب) اور ان کے فرزند محمد میراں سہا سے کی۔ شاعری میں قدر بلگرامی اور سید علی کامل لکھنوی سے تلمذ رہا۔ ۱۸۷۴ء میں ملازمت میں اہلکار کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے آخری مدت میں اول تعلقداری پر تعینات ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد علاقہ پائیگاہ میں معتمدی اور صدر تعلقداری کا عہدہ تفویض ہوا۔ کچھ عرصہ تک مجلس قانون ساز کے رکن' بلدہ کے نائب میر مجلس اور صرف خاص میں صدر محاسبی اور رکن رہے۔ ۱۸۹۴ء میں حکومت نظام نے عزیز جنگ' اور ۱۹۰۷ء میں حکومت برطانیہ ہند نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو انتقال ہوا۔

تصانیف میں "آصف اللغات' (۱۷ جلدیں) "ولائے حافظ' (دیوان حافظ کی تضمین) "داستان غم" (ملا محتشم کاشی کی طرح پر فارسی مرثیہ) اور "تصویر نور" (سراپائے رسول اکرم) ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد فنی کتب' زراعت' حیوانیات' طب اور قوانین مالگزاری اور نظم و نسق پر تفصیلات کے لئے : عبدالجبار خاں ملکاپوری تذکرۂ محبوب الزمن' جلد دوم' حیدر آباد ۱۳۲۹ھ ۔ محمد عمر مہاجر "مرقع سخن" جلد دوم' مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور' حیدر آباد دکن ۔ ۱۹۳۷ء مجلہ "سب رس" (حیدر آباد دکن) "عزیز جنگ ولا نمبر" حسن الدین احمد' مقدمہ "تاریخ النوائط" اشاعت دوم' ۱۹۷۶ء و نیز یہی مصنف "انجمن" حیدر آباد دکن ۱۹۷۴ء تمکین کاظمی مجلہ "نقوش" (لاہور) "شخصیات نمبر" جلد دوم' ۱۹۵۶ء

۸۔ ان کتابوں کا حوالہ "تاریخ النوائط" میں بطور ماخذ درج کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر بعد میں جو کتابیں شائع ہوئیں' ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ ایس ڈی سوزا (S. De Soza) "Nawayat of Canara" مطبوعہ ۱۹۵۵ء' محمد یوسف کوکن عمری "خانوادہ قاضی بدر الدولہ" مطبوعہ مدراس ۱۹۶۳ء ۔ ان کے علاوہ محمد منیرالدین نے عزیز جنگ ولا کی " تاریخ النوائط" کے اہم حصوں کا اقتباس شائع کیا اور بعد کے زمانہ کے مشاہیر کے حالات کو اس میں شامل کیا۔

۹۔ مشہور مورخ (متوفی ۹۲۲ء) اور اس کی تصنیف "تاریخ طبری" کی طرف اشارہ ہے۔

۱۰۔ مصنف نواب نادر عظیم خان بہادر، قلمی، سال تصنیف ۱۲۳۰ھ (مطابق ۱۸۱۴ء)

۱۱۔ ۱۷۰۳ء - ۱۷۸۶ء - ممتاز مورخ اور شاعر، ان کی تصنیف "بحۃ المرجان" میں یہ موضوع شامل ہے۔

۱۲۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۴ء

۱۳۔ شبلی نے یہ دیباچہ ہنری طامس بکل (Henry Thomas Buckle) کی کتاب "History of Civilization in Europe" کے اردو ترجمہ "تاریخ تمدن" پر لکھا تھا۔ اس کے مترجم منشی محمد احد علی کاکوری تھے۔ یہ کتاب لکھنؤ سے پہلی مرتبہ ۱۹۰۹ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ ترجمہ انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر کیا گیا تھا، اس وقت شبلی اس کے معتمد تھے۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن مولانا عبدالماجد دریا بادی کے اضافی ترجمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔

۱۴۔ والد کا نام منشی محمود علی، ولادت ۱۵ رمضان ۱۲۸۶ھ (مطابق ۱۸۶۹ء) وفات ۱۰ جمادی الاول ۱۳۲۶ھ (مطابق ۱۹۰۸ء) بارہ بنکی۔ عربی و فارسی کی تعلیم شاہ علی انور سے حاصل کی۔ بی۔ اے کے بعد وکالت کا امتحان کامیاب کیا اور وکالت کرتے رہے۔ تصانیف میں "شباب لکھنؤ" معروف ہے۔ محمد علی حیدر "تذکرہ مشاہیر کاکوری" (لکھنؤ ۱۹۲۷ء) ص ۲۰-۲۱

۱۵۔ ہندوستان کے تمام صوبہ جات، مضافات و ملحقات کے والیان، روسا، خطاب یافتگان اور مشاہیر کے خاندانی اور ذاتی حالات کا مجموعہ - مرتبہ پراگ نرائن بھارگو، مطبوعہ نو لکشور، لکھنؤ ۱۹۰۲ء - لیکن مرتب نے معاونین کی فہرست میں ان کا ذکر نہیں کیا، ملاحظہ فرمایئے - ص ۱۰-۱۱۔

۱۶۔ پورا نام "Francois Peirre Guillaurne Guizot"

۱۷۔ "Histoire de la Civilization en Europe"

۱۸۔ "کتاب التحفۃ الادبیہ فی تاریخ تمدن الممالک الاوروبا ویۃ" مترجم حسنین نعمت اللہ، مطبوعہ الاسکندریہ ۱۸۷۷ء۔

۱۹۔ اس تحریر میں شبلی نے رسالہ "ادیب" (الہ آباد) کے بارے میں اپنا تاثر غالباً بصورت مکتوب بنام مدیر (نوٹ رائے نظر) بیان کیا ہے۔ یہ "ادیب" کے شمارہ اگست ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب حال ہی میں "خدا بخش لائبریری جرنل" شمارہ ۷-۸

۲۰۔ Herbert Spencer (۱۸۲۰ء - ۱۹۰۳ء) انگریز فلسفی۔

۲۱۔ Thomas Henry Huxley (۱۸۲۵ء-۱۸۹۵ء) انگریز فلسفی اور سائنس دان۔

۲۲۔ شبلی کی یہ تقریر "رسالہ تہنیت بگرامی خدمت مولانا سیدی المنسوب حضرت حاجی غلام حسین صاحب، ۱۳۳۱ھ" مرتبہ خورشید حسن، مطبوعہ، مطبع مصطفائی بمبئی، صفحات ۹-۱۱ میں شامل ہے۔

۲۳۔ یہ ایک جشن تہنیت تھا، جو حاجی غلام حسین کی تقریب منصوبیت کے سلسلہ میں مورخہ ۶ شوال ۱۳۳۱ھ مطابق ۶ ستمبر ۱۹۱۳ء کو بدر باغ بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کا اہتمام "ذخیرہ جماعت سلیمانی بمبئی" نے کیا تھا۔ اس تقریب میں اس جماعت سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ بمبئی کے عمائدین اور اہل علم و قلم اور بالخصوص شبلی، جن کا ان دنوں بمبئی میں قیام تھا، شریک تھے۔ (تہنیت نامہ، ص ۲) علاوہ ازیں بعض اہل جماعت بڑودہ اور ستارہ سے بھی اس جلسہ میں شرکت کے لئے آئے تھے۔

۲۴۔ حاجی غلام حسین کے بارے میں تفصیلات عام نہیں ہیں۔ والد کا نام ضیا علی تھا۔ آغاز تعلیم و تربیت تبحر اتالیق کی نگرانی اور بلند پایہ مدارس میں ہوئی۔ اس سلسلہ میں بڑودہ، حیدر آباد اور بمبئی میں قیام رہا۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں مولانا قاسم نانوتوی کے زمانہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بعد میں یمن گئے، جہاں فرقہ ناجیہ کے رؤسائے روحانی سے علم کی تحصیل کی۔ جدید علوم سے بھی دلچسپی رہی۔ بیدار مغز اور اچھے منتظم تھے۔ تقریب منصوبیت کے زمانہ سے بمبئی میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا تھا۔ " تہنیت نامہ" صفحات ۵-۷

۲۵۔ شبلی کا یہ مضمون رسالہ "عبرت" (نجیب آباد) کے شمارۂ اول، جنوری ۱۹۱۶ء، صفحات ۳۰-۳۲ میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ کو ممتاز مورخ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرتب کرتے تھے۔ یہ رسالہ اس لحاظ سے منفرد ہوتا تھا کہ اس میں تمام تر تحریریں تاریخ کے موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس کے پہلے شمارہ میں یہ التزام کیا گیا تاکہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اکابر سے تاریخ اور فن تاریخ پر مضامین لکھوائے گئے تھے۔ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ شبلی کا یہ مضمون، جو ان کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد شائع ہوا، اس رسالہ کے لئے کب اور کس طرح حاصل کیا گیا۔

۲۶۔ شبلی کا یہ مکتوب "خطوط وقارالملک" مرتبہ مشتاق احمد، مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۴ء، صفحہ ۱۳۳ پر شامل ہے۔

۲۷۔ کرم خوردگی کے سبب مرتب "خطوط وقار الملک" نے الفاظ نہیں پڑھے۔

۲۸۔ مرتب "خطوط وقار الملک کے مطابق .... "اصل خط پر صرف ۲۹ اکتوبر درج تھا' مگر اس کے قریب نواب وقارالملک نے موصولہ کی تاریخ پر ۹۷ء تحریر کیا تھا۔" ایضاً"

۲۹۔ شبلی کا یہ مکتوب "مجلہ نظامیہ" ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی حیدر آباد دکن کے خصوصی شمارہ بہ یادگار "یوم ملا" منعقدہ ۹ رمضان ۱۳۵۹ھ (مطابق ۱۹۴۰ء) صفحات ۸۲۔۸۳ میں شائع ہوا۔

۳۰۔ حیدر آباد دکن کے جید علماء میں شمار ہوتا تھا۔ پیدائش تقریباً ۱۸۵۳ء بمقام مدراس۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے' جو علم و فضل میں ممتاز تھے' حاصل کی۔ بعد میں دکن اور شمالی ہند کے مدارس سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت تعلیم کے بعد حیدر آباد میں مملکت آصفیہ کی ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ تعلقداری کے عہدے تک ترقی حاصل کی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ فلاحی اور علمی سرگرمیوں اور بالخصوص اشاعت تعلیم میں حصہ لیتے تھے۔ جبری تعلیم کے پرزور حامی تھے اور اس کے بارے میں ایک کتاب "استدعا تعلیم جبری" تصنیف کی تھی (۱۸۹۳ء) "کتب خانہ آصفیہ" (۱۸۹۲ء) اور "دائرۃ المعارف" (۱۸۹۱ء) کے قیام کے محرک تھے۔ تحریک اتحاد اسلامی سے موید رہے اور تحریک حجاز ریلوے اور انجمن ہلال احمر کے لئے چندہ جمع کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور مسلمانوں کی شرکت کانگریس کے بارے میں ایک کتاب "انڈین نیشنل کانگریس اور مسلمان" (۱۹۰۵ء) بھی تحریر کی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا۔ تفصیلات کے لئے "مجلہ نظامیہ" اشاعت خصوصی' مذکورہ بالا و نیز عبدالحیٔ "نزہتہ الخواطر" جلد ۸ (کراچی' ۱۹۷۶ء) ص ۲۸۰
"The Freedom Struggle in Hyderabad" جلد سوم (حیدر آباد دکن ۱۹۵۹ء)
این کے جین "Muslims in India, A Biographical Dictionary" جلد اول (دہلی' ۱۹۷۹ء) ص ۲۲۔۲۳ وغیرہ۔

۳۱۔ شبلی کا یہ مکتوب مولوی مسیح الزماں خاں کی سوانح "حیات مسیح" مصنفہ محمد مظفر حسین سلیمانی' مطبوعہ نو لکشور لکھنؤ ۱۹۱۱ء صفحہ ۳۸ پر شائع ہوا۔

۳۲۔ ولادت ۱۸۴۰ء بمقام شاہجہان پور ۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۸۶۳ء میں اپنے بھائی مولوی محمد زماں خاں کے پاس حیدر آباد دکن گئے' جو وہاں نواب افضل الدولہ

والی ریاست کے استاد اور ان کی رحلت کے بعد میر محبوب علی خاں (نظام دکن) کی اتالیقی پر مامور تھے۔ جب وہ ایک مہدوی کے ہاتھوں فوت ہوئے تو ان کی جگہ ۱۸۷۵ء میں مولوی مسیح الزماں خاں نظام دکن کی اتالیقی پر مامور ہوئے۔ اس زمانہ میں وہ حیدر آباد دکن کے ممتاز علماء میں شمار ہونے لگے تھے۔ سالار جنگ اول کے معتمد تھے اور نظام پر بڑا اثر رکھتے تھے۔ ان کا بیش قرار منصب مقرر ہو گیا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں اپنے وطن شاہجہاں پور چلے گئے۔ جہاں ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ "حیات مسیح" ان کے حالات پر مفصل تصنیف ہے۔ نیز "کارنامہ سروری" مصنفہ آغا مرزا بیگ سرور جنگ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۳۳ء ص ۲۰۷۔

۳۳۔ جلیل القدر محقق، مورخ اور عالم۔ ولادت ۱۸۶۹ء اور وفات ۱۹۲۳ء علمائے ہند کے تراجم پر مشتمل اہم اور مبسوط تصنیف "نزہتہ الخواطر" اور دیگر مفید اور معلوماتی کتابوں کے مصنف۔

۳۴۔ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی، صدر یار جنگ، ممتاز عالم اور مصنف، ولادت ۱۸۶۷ء اور وفات ۱۹۵۰ء۔ جامع الصفات شخصیت کے مالک، علمی و تمدنی سرگرمیوں کے سرپرست، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے روح رواں۔

۳۵۔ شبلی کی یہ تحریر، امیر مینائی کے خطوط کے مجموعہ "خطوط منشی امیر احمد" مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب (اشاعت اول، ۱۹۱۰ء) کے بارے میں تھی، جو اس کی اشاعت دوم (۱۹۲۲ء) میں شامل کی گئی۔ اس مجموعہ کی تیسری اشاعت لکھنؤ سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی، صفحہ ۳۱۶۔۳۱۸۔

۳۶۔ پیدائش ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء بمقام بدایوں اور وفات ۱۹۳۵ء بمقام رامپور۔ والد مولوی نصراللہ خاں، صدر الصدور دہلوی ثم اکبر آبادی۔ ثاقب نے علمائے عصر سے اکتساب علم کیا اور جدید علوم اور قانون کی تعلیم آگرہ کالج میں حاصل کی۔ ابتدا میں حکومت برطانیہ اور ریاستوں میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ پھر وکٹوریہ کالج گوالیار میں عربی و فارسی کے استاد ہو گئے۔ تیرہ برس کی عمر سے شعر گوئی شروع کی۔ پہلے محسن کاکوروی سے اور پھر امیر مینائی سے اصلاح سخن لی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ تصانیف میں فارسی و اردو کے دواوین، "شرح حسن و عشق" "علی شیرازی" "گوہرین نامہ" "آتش بے دود" اور "خطوط منشی امیر احمد" وغیرہ یادگار ہیں۔ رسالہ "قند پارسی" (علی گڑھ) کی ادارت کے فرائض بھی ایک عرصہ تک انجام دیئے

رہے۔ تفصیلات کے لئے "مکاتیب امیر مینائی" (خطوط منشی امیر احمد) اشاعت سوم، ص ۱۱۔۱۳، "تذکرۃ الشعرا" حسرت موہانی، حصہ اول، جزو پنجم، مطبوعہ ۱۹۱۵ء ص ۲۰، "مشاہیر اکبر آباد" مصنفہ انتظام اللہ شہابی، مطبوعہ کراچی، تاریخ ندارد، ص ۱۷۔۱۸۔

اردو کے دو گلدستے

اردو کے گلدستے اپنے زمانے کے اہم ادبی رجحانات اور شعری و تصنیفی کارکردگی کو ظاہر کرتے تھے۔ گذشتہ صدی کی ادبی صحافت میں ان کا ایک نمایاں مقام ہے۔ زیر نظر سطور میں دو گلدستوں کا تعارف مقصود ہے۔ ایک
"پیام یار" اور دوسرا "ریاض سخن" پیام یار ماہانہ گلدستہ تھا جو لکھنؤ سے بقول اختر شہنشاہی ۱۸۸۳ء میں نکلنا شروع ہوا۔ یہ پہلے مطبع قومی پریس میں اور پھر مطبع منشی گنگا پرشاد ورما' برادران امین آباد میں چھپتا تھا۔ اس کے مدیر منشی محمد نثار حسین نثار' نہایت باذوق اور ممتاز ادبی شخصیت تھے۔ اس وقت کے لکھنؤ کی اہم ادبی شخصیات ان کے حلقہ احباب میں شامل تھیں۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۱۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔ شرر نے ان کے انتقال کی خبر دلگداز' جنوری ۱۹۱۱ء میں دی[۲]۔
یہ ہر انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس رسالہ کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک میں نظم اور دوسرے میں نثر۔ نثر کے حصہ میں ناول بالا قساط شائع ہوتے تھے۔ بلکہ ایک اور رائے کے مطابق اس کے تین حصے ہوتے تھے۔ ایک مضامین کا' دوسرا نظم کا اور تیسرا ناول کا[۳]۔ نظم اور نثر کے دونوں حصے یکجا بھی شائع ہوتے تھے اور علیحدہ علیحدہ بھی۔ حصہ نظم عام طور پر بیس صفحات پر مبنی ہوتا تھا۔ اس میں طرحی' غیر طرحی کلام بھی چھپتا تھا۔ پوری غزل بلا انتخاب یا غیر طرحی فی شعر ۲ر آنے اجرت پر شامل اشاعت کی جاتی تھی۔ اس کے ایک شمارے کی

قیمت ڈھائی آنے اور سالانہ ایک روپیہ معہ محصول ڈاک عام افراد سے لی جاتی تھی۔ اور والیان ریاست اور رؤسا سے پانچ روپے۔ سرورق کی پیشانی پر نیم دائرہ کی شکل میں پیام یار انگریزی میں لکھا ہوتا اور اس کے درمیان نستعلیق میں پیام یار لکھا جاتا۔ اس کے نیچے شمارہ نمبر، جلد نمبراور تاریخ اشاعت مندرج ہوتی۔ پھر نیچے تک ایک چوحاشیہ میں، جس میں بیل بوٹے اور نقش و نگار بنے ہوتے، پہلے یہ شعر ہے

نالہ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

اور پھر "مرتبہ، منشی نثار حسین صاحب نثار مہتمم قومی پریس پیام، یار، لکھنؤ چوک، قومی پریس واقع لکھنؤ چوک میں بحسن زیبائش چھپا" تحریر ہوتا۔ سرورق کے دوسرے صفحہ پر دو کالم ہوتے۔ پہلے کالم میں خریداری اور غزلیات بھیجنے کی شرائط درج ہوتی تھیں اور دوسرے میں اشتہارات۔ آخری دو صفحات میں کتابوں اور مطبوعات کے اشتہارات چھاپے جاتے۔

پیام یار کا تعارف فضل حق خورشید صاحب نے "قومی زبان" اپریل ۱۹۷۲ء میں اور سید فضل المتین نے اردو ادب علی گڑھ، شمارہ ۲، ۱۹۶۴ء اور شمارہ ۱، ۱۹۶۶ء میں کرایا ہے۔ یہ تعارف پیام یار کے منجملہ ۳۱ شماروں پر محیط ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔ نومبر ۱۸۸۶ء، دسمبر ۱۸۸۶ء، مئی ۱۸۸۸ء، اپریل ۱۸۹۰ء، اکتوبر ۱۸۹۰ء، فروری ۱۸۹۱ء، اپریل ۱۸۹۱ء، مئی ۱۸۹۱ء، جون ۱۸۹۱ء، جولائی ۱۸۹۱ء، نومبر ۱۸۹۱ء، مارچ ۱۸۹۸ء، ستمبر ۱۸۹۸ء، فروری ۱۸۹۹ء، اپریل ۱۸۹۹ء، جون ۱۸۹۹ء، اگست ۱۸۹۹ء، مارچ ۱۹۰۰ء، اپریل ۱۹۰۰ء، مئی ۱۹۰۰ء، ستمبر، ۱۹۰۰ء، مارچ ۱۹۰۲ء، جولائی ۱۹۰۲ء، ستمبر ۱۹۰۲ء، اکتوبر ۱۹۰۲ء، دسمبر ۱۹۰۲ء[۴] اور مئی ۱۸۸۵ء، جون ۱۸۸۵ء[۵] جولائی ۱۸۸۵ء، اکتوبر ۱۸۸۵ء[۶]۔

یہاں ان شماروں کا تعارف مقصود ہے جو راقم الحروف کے ذاتی کتب خانہ

میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو حصہ نظم پر مبنی ہیں اور ایک حصہ نثر پر۔ حصہ نظم میں سے ایک شمارہ دسمبر ۱۸۸۶ء کا تعارف فضل حق خورشید کے مذکورہ تعارف میں شامل ہے۔ دوسرا شمارہ اکتوبر ۱۸۸۷ء کا ہے۔ اس میں طرحی کے علاوہ غیر طرحی غزلیات بھی موجود ہیں۔ طرح کے لئے یہ مصرعہ دیا گیا تھا۔

ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

اس طرحی مصرعہ پر جن شاعروں کا کلام ملتا ہے ان کا نام اور مطلع درج ذیل ہے، شعرا کے ناموں کے سلسلے میں مدیر نے جو الفاظ و القاب استعمال کئے ہیں، یہاں بعینہٖ وہی تحریر کئے جا رہے ہیں۔

جناب منشی امیر احمد صاحب امیر لکھنوی اوستاد حضور نواب صاحب رامپور خلد آشیاں۔

بتوں ہی میں ہے وہ بت کچھ تجھے خبر بھی ہے
چھپا ہوا انہیں فتنوں میں فتنہ گر بھی ہے

جناب مجید الدین صاحب اشہر شاگرد منشی جمیل احمد صاحب سہوانی وارد حال بھوپال۔

ہے جیسے درد میں دل مبتلا جگر بھی ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب میر سرفراز علی صاحب امجد رودلوی۔

ہجوم رنج ہے در دل مبتلا جگر بھی ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب مولوی محمد احسن اللہ صاحب احسن اہمد دیوانی نظامت ریٹی۔

اودہر تو ناوک مژگاں سے دل یہ ہے بسمل
تپ فراق سے مضطر ادھر جگر بھی ہے'

جناب سید احمد میاں صاحب اختر ابن سید ہاشم میاں صاحب منگلوری۔

کسی کے عشق میں کیا کیا نہ آفتیں جھیلیں
ہمارے حال کی اس شوخ کو خبر بھی ہے

جناب پانڈے منی لال صاحب آزاد گورکھپوری۔

کوئی یہ جا کے ذرا ان سے پوچھے اے آزاد
کسی کے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب محمد اظہر حسین صاحب اظہر سکنہ کانگڑہ از ضلع مظفر گڑھ۔

جگر میں درد ہے لب خشک چشم تر بھی ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب بقا غازی پوری شاگرد جناب شمشاد لکھنوی۔

یہ کس سے کہتے ہو کچھ عشق میں اثر بھی ہے
تمہارے دل میں ہمیں ہیں تمہیں خبر بھی ہے

جناب پنڈت شیشر ناتھ صاحب بصیر دہلوی وکیل ریٹی۔

میں ان کے کوچے میں جا کر جو روز روتا ہوں
تو ہنس کے کہتے ہیں کیوں جی تمہارے گھر بھی ہے

جناب اکھوری شیو نندن پرشاد صاحب بہار کوروی ہیڈ ماسٹر اسکول اردل۔

کسی کے عشق میں جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
ہمارے حال کی اس شوخ کو خبر بھی ہے

جناب منشی بدرالدین صاحب بیتاب ساکن بندر بھڑوچ۔

لبوں پہ نالہ ہے اشکوں سے چشم تر بھی ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب منشی محمد کبیر صاحب عقیل شاگرد جناب داغ دہلوی۔

غضب ہے دل ہی نہیں مضطرب جگر بھی ہے

ستم ہے درد ادھر بھی ہے اور ادھر بھی ہے

جناب مولوی محمد خیرالدین صاحب تابش ملتانی شاگرد جناب داغ دہلوی۔

تڑپ وہ دل کی ہے جس پر نثار ہے بجلی
مری وہ آہ ہے جس پر فدا اثر بھی ہے

جناب حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی۔

لگی ہے دل ہی کو کیا مضطرب جگر بھی ہے
ادھر بھی حشر ہے آفت بپا ادھر بھی ہے

جناب محمد عمر صاحب جنون ابن مولوی محمود میاں وکیل منگلور شاگرد جناب جلال لکھنوی۔

تپاں فراق میں دل کی طرح جگر بھی ہے
گواہ نالہ بھی ہے آہ پر شرر ابھی ہے

جناب منشی محمد مبین صاحب جلیس مچھلی شہری پروپرائیٹر "بہار سخن" شاگرد جناب یاس لکھنوی۔

تپاں ہے دل بھی ترے ہجر میں جگر بھی ہے
ادھر بھی درد محبت ہے اور ادھر بھی ہے
وہ رحم کیا کرے اس کو مری خبر بھی ہے
خبر بھی ہو تو کرم پر اسے نظر بھی ہے

جناب آغا مرزا صاحب شاغل برادر جناب داغ دہلوی۔

کدھر چلے ہو یہ دل لے کے کچھ بھی ہے
ہمارے پاس سوا اس کے اک جگر بھی ہے

جناب منشی شیخ احمد علی صاحب شوق مالک اخبار "آزاد" لکھنؤ۔

جو دل لیا تو یہ سوچی ابھی جگر بھی ہے
ٹٹول رہی ہے کہ کچھ ادھر بھی ہے

جناب شیخ محمد جان صاحب شوخ عظیمؔ آبادی ـ

کسی کی خستہ دلی پر تمہیں نظر بھی ہے
کسی کے حال کی افسوس کچھ خبر بھی ہے

جناب محمد رشید صاحب شمیم برادر و شاگرد جناب جلیس مچھلی شہری از گورکھپور ـ

تڑپ رہے ہیں شب ہجر نیم جاں کی طرح
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب رگھناتھ پرشاد صاحب شاد نائب قانونگوے تحصیل بھونگام ـ

نگاہ ناز کے مارے ہوئے تڑپتے ہیں
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب سید اسحاق حسن صاحب شرر پیرزادہ ساکن مارہرہ شاگرد جناب عیش لکھنوی ـ

صبا حضور میں حضرت کے عرض یہ کرنا
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب سید شمس الہدیٰ صاحب شمس ناظر عدالت منصفی مدھوبنی ـ

بصد نیاز و تمنا یہ شمس کہتا ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب منشی علی حسین صاحب صبر از للت پور شاگرد جناب یاس لکھنوی ـ

لبوں پر آہ بھی ہے اور چشم تر بھی ہے
تپ فراق سے سوزاں مرا جگر بھی ہے

جناب سید خدا بخش صاحب صادق ساکن منگلسی ضلع فیض آباد ـ

تب فراق بدن میں ہے درد سر بھی ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب پربھو نرائن صاحب صادق مختار رانچی ضلع لوہردگا ـ

غم فراق اٹھانے کو ایک دل ہی نہیں
کہ ساتھ دینے کو اس کا مرا جگر بھی ہے

جناب نواب سجاد علی خاں صاحب ضبط لکھنؤ۔

جفا شعار کچھ انصاف پر نظر بھی ہے
نگاہ مہر اسی طرح غیر پر بھی ہے

جناب سید ضامن علی صاحب ضامنؔ از گونڈہ۔

لگائیں شوق سے تلوار میرے سینہ پر
جو تیغ پاس ہے ان کے تو یاں سپر بھی ہے

جناب کرم الدین صاحب عشرت مدرس مڈل اسکول چار سدہ شاگرد جناب یاس لکھنوی۔

تڑپ رہا ہے دل زار انہیں خبر بھی ہے
ہماری آہ و بکا میں کہیں اثر بھی ہے

جناب میوا لال صاحب عاجز سب انسپکٹر پولیس لین دربھنگہ۔

اگر کہو تو ابھی پھونک دیں فلک کو ہم
ہمارے نالہ دلسوز میں اثر بھی ہے

جناب محمد یحییٰ علی صاحب عاصی کاکوروی اہلکار منصفی بجنور۔

وصال میں انہیں چھیڑا تو بولے شرما کر
نہ دیکھ لے کوئی کمبخت تجھ کو ڈر بھی ہے

جناب منشی رشید الدین صاحب عاصی مدرس سرکاری اردو مدرسہ اٹو درہ۔

دم آیا آنکھوں میں اب کوئی دم کے ہیں مہمان
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب رام روپ داس صاحب عاشق از للت پور۔

دعائے عاشق ناشاد میں اثر بھی ہے

کسی کے حال کی کچھ یار کو خبر بھی ہے

جناب سید نذیر احمد صاحب عروج ساکن موضوع کامگار شاگرد جناب ایجلو۔

مریض ہجر کی اب کوئی دم میں رحلت ہے
لبوں پہ جان ہے کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب محمد عبدالغنی صاحب غنی مرزاپوری مقیم رانچی۔

نہیں ہے دل ہی فقط تیغ ناز پر صدقے
تمہارے تیر ادا پر فدا جگر بھی ہے

جناب فیروز شاہ خاں صاحب فیروز رامپوری شاگرد جناب داغ دہلوی۔

تم ایسے ہو گئے بیباک اب تو کھل کھیلے
کسی کا خوف بھی ہے کچھ کسی کا ڈر بھی ہے

جناب سجاد حسین صاحب فسون طالب علم چھپرہ ضلع سارن۔

تسلیاں یہی کہہ کہہ کے دل کو دیتا ہوں
کہ ظلم و جور جو تجھ پر ہے غیر پر بھی ہے

جناب فضائل سنگھ صاحب فضائل ساکن چونیاں ضلع لاہور۔

ہمارے غم کا بیاں تیرے خال و خط کی طرح
کہیں ہے طول کہیں یار مختصر بھی ہے

جناب بالکرشن صاحب قمر لکھنوی شاگرد جناب امیر لکھنوی۔

تمہارے ہجر میں مضطر کوئی ادھر بھی ہے
کسی کے حال کی تم کو صنم خبر بھی ہے

جناب حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال خلف الصدق جناب جلال لکھنوی۔

چھپے ہیں دل میں وہ کیوں دل کو کچھ خبر بھی ہے
حجاب بھی ہے کسی سے کسی کا ڈر بھی ہے

جناب سید عبدالمجید صاحب مجید حلیم پوری شاگرد جناب نوارش مونگیری۔

اٹھاؤ تیغ کہ گردن جھکا چکا ہوں میں
لگاؤ تیر کہ حاضر مرا جگر بھی ہے

جناب محمد نبی داد خاں صاحب مشتاق وکیل عدالت دیوانی علی گڑھ ـ

فگار تیر نگاہ دل بھی ہے جگر بھی ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب سید احمد حسین صاحب منظور لاہرپوری شاگرد جناب وسیم خیر آبادی ـ

تمام عمر ہوئی تو مگر نہیں جاتی
شب فراق بتا دے تری سحر بھی ہے

جناب منشی محمد عبدالمجید صاحب مجید کرتپوری ملازم فوجداری علی گڑھ ـ

حسین کہتے ہو اپنی تمہیں خبر بھی ہے
تمہیں بتاؤ کہ تم سا کوئی بشر بھی ہے

جناب جگیشر پرشاد صاحب مقتول مختار عام جناب راجہ صاحب بہادر سنگرولی ـ

نگہ کی تیغ سے کرتے ہو قتل مجھ کو بتو
بھلا کہو تو تمہیں کچھ خدا کا ڈر بھی ہے

جناب عبدالمجیب صاحب مقصود گورکھپوری شاگرد جناب وفور گورکھپوری ـ

تمہارے حسن پہ اے مہ جبیں خدا کی قسم
جو دل فدا ہے تو صدقے مرا جگر بھی ہے

جناب عبدالقادر صاحب مشہور خلف محمد فاضل صاحب متوطن بھڑوچ ـ

گزرتی ہے دل مہجور پر صنم کیا کیا
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب حکیم محمد نعیم الزمان خاں صاحب نعیم لکھنوی شاگرد جناب امیر لکھنوی ـ

غرور حسن کو اس بت کے یہ خبر بھی ہے
کہ میرے عشق میں کچھ جذب کا اثر بھی ہے

جناب منشی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب نیر وکیل دہلی شاگرد جناب یاس لکھنوی ۔

بتوں کے کوچے میں اے دل کہیں گزر بھی ہے
اگر گزر بھی ہے تو سو طرح کا خطر بھی ہے

جناب محمد شفیع صاحب ناظم سب اور سیئر متوطن میرٹھ ۔

وہ میری لاش پہ سر کھول کر یہ کہتے ہیں
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب نوازش حسین صاحب نوازش مونگیری ۔

وہ جتنا دور ہے اتنا قریب تر بھی ہے
نہاں نظر سے ہے پر دل میں جلوہ گر بھی ہے

جناب مولوی محمد فصیح اللہ خاں صاحب نیر بنارسی شاگرد جناب فائز بنارسی ۔

قرار دل کو نہیں مضطرب جگر بھی ہے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب غلام محمد صاحب ناظم کلرک دفتر ریلوے اگزامینر لاہور ۔

تمہارے تیغ ادا کے جو وار کو روکے
سوائے سینہ ناظم کوئی سپر بھی ہے

خاکسار محمد نثار حسین نثار مہتمم پیام یار ۔

خدا ہی نے تو بنایا دل و جگر بھی ہے
ستانے والے تمہیں کچھ خدا کا ڈر بھی ہے

جناب میر ذاکر حسین صاحب یاس لکھنوی شاگرد جناب یاس لکھنوی ۔

خیال دل بھی ہے مد نظر جگر بھی ہے
نگاہ یار ادھر بھی ہے اور ادھر بھی ہے

جناب محمد عبدالغفور صاحب یتیم ٹیٹو ڈاکٹر جیل گونڈہ ۔

مجھی کو داغ محبت ملا مجھے تھا یہ ناز

مگر رقیب مرا ہائے یہ قمر بھی ہے

جناب سید فیاض احمد صاحب راز برادر حضرت ریاض شاگرد جناب امیر لکھنوی۔

عبث تلاش ہے پہلو میں کچھ خبر بھی ہے
جدھر ہے تیر ادودھر دل بھی ہے جگر بھی ہے

جناب سید محمد احسن صاحب شوق از تکیہ کلاں ضلع رائے بریلی۔

تڑپ تڑپ کے شب ہجر صبح کرتے ہیں
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب جے نرائن صاحب صانع لکھنوی شاگرد جناب قمر لکھنوی۔

شب فراق میں مر مر کے کی سحر ہم نے
ہمارے حال کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے

جناب سید نیاز احمد صاحب نیاز برادر ریاض شاگرد جناب امیر لکھنوی۔

نہ پوچھ کوئی پس مرگ نوحہ گر بھی ہے
کہ نوحہ گر مرا دل ہی نہیں جگر بھی ہے

جناب سید ضامن حسین صاحب ناظر برادر و شاگرد جناب وسیم خیر آبادی۔

نثار تم پہ مرا دل بھی ہے جگر بھی ہے
مرے عدو ہیں یہ دونوں تمہیں خبر بھی ہے

جناب سید محمد عسکری صاحب وسیم برادر حضرت ریاض شاگرد جناب امیر لکھنوی۔

ہے آئینہ میں ترا مثل کچھ خبر بھی ہے
کہ شوخ تیرے برابر یہ سیم بر بھی ہے

بی گلاب دلی صاحبہ اختر از دہلی۔

ہمارے حال پہ کچھ آپ کو نظر بھی ہے
کہ بے قرار ہے دل بھی تپاں جگر بھی ہے

اس کے بعد "غزلیات غیر طرح" کے عنوان کے تحت درج ذیل شعراء کا

کلام دیا گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عنوان کے تحت دیا گیا کلام' جو ایک ہی طرح میں ہے' گذشتہ ماہ کا بقیہ ہو۔ جیسا کہ اس رسالہ کے دیگر شماروں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ طرحی کلام کے بعد گذشتہ ماہ کا بقیہ طرحی کلام بھی شامل اشاعت کیا جاتا تھا۔ چند غزلوں کے علاوہ اکثر غزلیں اس اشاعت میں' ایک ہی طرح میں ہیں۔

جناب مولوی محمد خیر الدین صاحب تابش ملتانی شاگرد جناب داغ دہلوی ؎

آشفتگی حال کی میرے اوسے کیا قدر
جس شخص کے دل میں نہ محبت ہو کسی کی

جناب محمد احسان علی خاں احسان شاہجہاں پوری شاگرد جناب جلال لکھنوی ؎

آج رخصت نہ اگر ہوش ہمارے ہوتے
بام پر آئے تھے وہ خوب نظارے ہوتے

جناب مرزا علی محمد صاحب ارم لکھنوی شاگرد جناب احسان شاہجہاں پوری ؎

پر اثر نالہ فرقت جو ہمارے ہوتے
پھر یہ ممکن تھا کہ دشمن تمہیں پیارے ہوتے

جناب مرزا قاسم علی بیگ صاحب اخگر حیدر آبادی شاگرد جناب جولان ؎

کیوں تڑپتے ہوئے چھوڑا اسے پہلو میں مرے
دل کو اے کاش کہ تم لے کے سدھارے ہوتے

جناب سید محمد عظمت اللہ صاحب اقبال حسینی اورنگ آبادی ؎

ترے ابرو جو طرف دار ہمارے ہوتے
غیروں کے واسطے چلتے ہوئے آرے ہوتے

جناب مولوی محمد حبیب الحق صاحب حبیب شاہجہاں پوری شاگرد جناب احسان ؎

شمع کی طرح تھا منظور جلانا مجھ کو
ورنہ غیروں سے نہ محفل میں اشارے ہوتے

جناب منشی سید محمد ولایت حسین صاحب حقیر ردولوی شاگرد جناب فائز بنارسی ۔

سر کے دینے میں نہ ہمت کبھی ہارے ہوتے
چشم جوہر سے جو خنجر کے اشارے ہوتے

جناب بندہ علی خاں صاحب زیبا لکھنوی شاگرد جناب محمد حسن خاں شیدا مرحوم۔

کیا ملاتا کوئی آنکھ ان سے ہمارے ہوتے
غیر ممکن تھا کہ غیروں سے اشارے ہوتے

جناب حکیم عزیز احمد صاحب عزیز حکیم آبادی ۔

گر نہ اس ماہ سے بے پردہ نظارے ہوتے
نہ جگر کے نہ دل زار کے پار ہوتے

جناب فدا حسین صاحب فدا خیر آبادی ۔

اب نہ کرنا کسی عاشق سے حیا کے دعوے
غیر سے دیکھ لئے ہم نے اشارے ہوتے

جناب محمد اسحاق خاں صاحب مائل رئیس قصبہ برکہ ۔

کیا یہی شرط محبت ہے بتاؤ صاحب
غیر پر لطف و کرم واہ ہمارے ہوتے

جناب سید احمد حسین صاحب منظور و شاگرد برادر جناب وسیم خیر آبادی ۔

شیخ صاحب جو غم عشق کے مارے ہوتے
خواہش حور میں جنت کو سدھارے ہوتے

جناب سید اولاد احمد صاحب محشر مراد آبادی اشٹیشن ماسٹر خیر آباد شاگرد جناب مضطر

اگر اونچے میری آہوں کے شرارے ہوتے
نہ یہ گردوں نظر آتا نہ یہ تارے ہوتے

جناب سید محمد عسکری صاحب وسیم خیر آبادی شاگرد جناب امیر لکھنوی ۔

لاکھ احسان اگر ان پر تمہارے ہوتے
حضرت دل نہ تمہارے نہ ہمارے ہوتے

جناب حمید علی صاحب حمید محرر پیشی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سیتاپور۔

لب شیریں سے مجھ کو گالیاں دیں
ملا کر زہر دیتے ہو دوا میں

جناب سید مولوی مقصود علی خاں صاحب ضیاء دہلوی مدرس رینی۔

لگاؤ خون عاشق دست و پا میں
کہ وہ شوخی کہاں رنگ حنا میں

جناب امتیاز حسین صاحب ممتاز محرر لین پولیس ضلع سیتاپور۔

عجب لذت ہے تیری ہر جفا میں
نہ ایسی شوخیاں ہیں ہر ادا میں

جناب ناصر خاں صاحب ناصر عرف قلندر از بنگلور۔

پھنسا ہے جب سے دل زلف رسا میں
پڑی ہے جان مصیبت میں بلا میں

جناب مولوی محمد خیر الدین صاحب تابش ملتانی شاگرد جناب داغ دہلوی۔

کیوں ہم کو دوستو ہوس لالہ زار ہو
رشک چمن جو اپنا دل داغدار ہو

جناب محمد کبیر صاحب تحصیل شاگرد جناب داغ دہلوی۔

لالہ کی طرح دل نہ کوئی داغدار ہو
یارب یہ گل کسی کے گلے کا نہ ہار ہو

جناب محمد شفیع صاحب ناظم سب اور سیئر مین پوری۔

تیر نظر تمہارا جو سینے کے پار ہو
ہمراہ دل کے جان حزیں بھی شکار ہو

جناب محمد مبین صاحب جلیس مچھلی شہری شاگرد جناب یاس لکھنوی۔

یہی کہتا ہے چراغ سر بالین مزار
مجھ کو رونے کے لئے تا بہ سحر چھوڑ دیا

آخر میں آئندہ دو شماروں کے لئے یہ طرحی مصرعے دیئے گئے تھے۔
نومبر کے لئے۔

ستم ان کے اٹھاؤں میں کہاں تک

دسمبر کے لئے۔

کم میری جان ذرا درد جگر ہونے دو

حصہ نثر کا شمارہ بابت ماہ جنوری ۱۸۹۷ء کا ہے۔ اس کی طباعتی تفصیلات بھی وہی ہیں جو حصہ نظم کے تحت بیان ہو چکی ہیں۔ اس کی ضخامت سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارہ میں کسی ناول کا دوسرا حصہ اور اس کا پہلا باب اور دوسرے باب کا کچھ حصہ شامل ہے۔ اس ناول کا نام، سلسلہ اور حوالہ اور ناول نگار کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ یہ موضوع کے اعتبار سے ایک تاریخی رومانی ناول ہے۔ جس کی کہانی اورنگ زیب" کے دور کو بیان کرتی ہے۔ پہلے باب کا عنوان "جنگ کی تیاریاں" دیا گیا ہے۔ اور عنوان کے نیچے یہ شعر تحریر ہے۔

سرمہ آنکھوں میں نہ ہوتا تو مجھے روتے آپ
مہندی ہاتھوں میں نہ ہوتی تو تاسف کرتے

اس باب میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب اورنگ زیب" شیوا جی کی ریشہ دوانیوں اور بغاوتوں کو دبانے کی فکر کرتے ہیں اور ان کا سپہ سالار افضل خاں شیوا جی کو گرفتار کر کے پیش کرنے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ اس باب میں، جو گیارہ صفحات پر مشتمل ہے، افضل خان کی جنگ کی تیاریوں اور اس کے سفر نلدرک، افضل پور اور شولا پور کی داستان بیان کی گئی ہے۔ افضل خان کے علاوہ فاضل خاں بلونت راؤ اور پہاڑ سنگھ اس باب کے اہم کردار ہیں۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ رومان کی چاشنی

بھی موجود ہے اور اس کے لئے دو کردار لرلی خانم اور زینا کا ذکر بھی ملتا ہے۔
دوسرے باب کا عنوان "ذرا سنئے گا" ہے اور اس کے نیچے یہ شعر تحریر ہے

رقیبوں سے خلوت میں ہوتے ہیں مشورے
نیا کوئی طوفاں اٹھا چاہتا ہے

یہ باب صفحہ نمبر۱۹ پر اس ادھورے جملہ پر نامکمل رہتا ہے۔
"۔۔۔ ایک منس معہ کہاروں کے اور دو صبا رفتار گھوڑے شام ہی سے چمنا مندر کے قریب ایک پوشیدہ مقام میں لئے ہوئے بیٹھا تھا۔ جو گنگا کی افتراپردازیوں نے اسے دکھا دیا تھا۔"

پہلے باب کے مقابلے میں اس باب میں کہانی کے دیگر مختلف کردار داستان کے کسی اور رخ کو پیش کرتے ہیں۔ اس باب کے اہم کردار انند' تارا' رادھا' مورو ٹرل اور گنگا ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے سے شیواجی کی جنگی تیاریوں اور مغل افواج کے لئے ان کے اچھے اور برے دونوں طرح کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ذیل میں ناول کی اس قسط سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے ناول کے موضوع' مزاج' کردار اور انداز تحریر کا اظہار ہوتا ہے۔

(ا) "ہمیں آپ کو بیجاپور چھوڑے ہوئے گو ایسا کچھ بہت زمانہ تو نہیں ہوا مگر زمانے کی رفتار اور معاملات کی الٹ پلٹ نے وہاں ایک دوسرا ہی رنگ جما رکھا ہے۔ جدھر دیکھو جنگی تیاریوں کے سامان ہو رہے ہیں۔ جس سے سنو یہی کہہ رہا ہے کہ بھئی اس معرکے کو بھی جو اس میں شریک ہوا ہے زندگی بھر نہ بھولے گا۔ سب سے زیادہ فکر ہمارے بڈھے جنرل افضل خاں کو آپڑی ہے جس نے سیوا جی کو بادشاہ کے حضور میں باندھ کر حاضر کر دینے کا وعدہ تو کر لیا ہے مگر دل

میں اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے کہ اس کا ہاتھ آنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ مرہٹوں نے بھی پورے طور سے ہاتھ پاؤں سنبھال لئے ہیں۔ ان کی تلواریں بھی دشمنوں کا خون بہانے میں کسی طرح مسلمانوں سے کم نہ رہیں گی۔"

(۲) ۔ ۔ ۔ ۔ "لرلی خانم اور پیاری زینا نے بھی جب سے سنا ہے کہ ہم اس لڑائی کے میدان میں اپنے مردوں کے ساتھ ہوں گے' جامے میں پھولی نہیں سماتیں۔ خصوصاً" لرلی خانم جسے توپوں کے زنانٹے تلواروں کے سناٹے بندوقوں کی اور تمام لڑائی کی سختیاں ایک معمولی چیز ہو گئی ہیں' بہت ہی اشتیاق سے گھنٹوں زینا کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑائی کی باتیں کیا کرتی ہے۔ جس نے اور بھی زینا کو میدان جنگ کا مشتاق کر دیا ہے مگر نہیں سب سے زیادہ اس کی دلی مسرتوں کا سبب وہ خبر ہے جس نے چپکے سے اس کے کان میں آ کر کہہ دیا ہے کہ تیرا دلدادہ کلاس خان بھی میدان جنگ میں تیرے باپ کے ساتھ ہو گا۔"

(۳) ۔ ۔ ۔ ۔ "آج اماوس کی اندھیری رات اور مہینے کا وہ آخری دن ہے جس کے دوسرے ہی روز شام کو شوق میں بھری ہوئی نگاہیں۔ مغربی مطلع کی طرف اٹھ اٹھ کر اس قدرتی نشان کو ڈھونڈنے لگتی ہیں جو ہلال کے نام سے مشہور اور اسلامی مہینے کی ابتدا کا بہت ہی دلکش پتا ہے۔

دوسرا گلدستہ' جس کا تعارف مقصود ہے' "ریاض سخن" ہے جو رامپور سے ہر ماہ شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۰ر جنوری ۱۸۸۵ء کو منظر عام پر آیا۔ اس میں اس کے اجزاء کی دو تاریخیں درج ہیں ۔

(۱) گلدستہ انتخاب سخن کا ہے بے مثال
یکتائے روزگار ہے رنگیں ادائے دہر
تاریخ ہے مسیحی و ہجری بہم یہ شوق
مجموعہ ریاض سخن پر فضائے دہر

۱۸۸۵ء ۱۳۰۲ھ

۲۔ قطعہ تاریخ منشی محمد فیروز خاں' رامپور۔

طبع گلدستہ ہو گیا فیروز
جب ہوئی مجھ کو یہ خبر مسموع
عیسوی سال کی لکھی تاریخ
کہ ریاض سخن ہوا مطبوع

۱۸۸۵ء

اس گلدستہ کے مالک احمد علی خاں شوق تھے۔ ان کے والد اصغر علی خاں ریاست رامپور میں تحصیلدار تھے۔ شوق بڑے علم دوست' ادیب اور شاعر تھے۔ سفرنامہ ابن جبیر کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا[۸] اور "تذکرہ کاملان رامپور" میں علماء و فضلا کے حالات و آثار لکھے تھے۔

گلدستہ ریاض سخن طباعت کے اعتبار سے پیام یار سے بڑی مشابہت رکھتا ہے لیکن طباعت و کتابت پیام یار کے مقابلہ میں زیادہ نفیس ہے۔ تقطیع اور انداز ترتیب یکساں ہے۔ ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ پیام یار کی بہ نسبت اس میں عام طور پر کلام کا انتخاب کم کیا جاتا تھا۔ اور غزلیں بڑی حد تک مکمل شائع ہوتی تھیں۔

یہ ہر مہینہ میں ایک بار شائع ہوتا تھا۔ جس کے سولہ صفحے ہوتے۔ ان میں شعراء کا طرحی کلام شائع ہوتا اور غیر طرحی کلام کے لئے گنجائش رکھی جاتی تھی۔ نیز اگر طرحی کلام زیادہ موصول ہوتا تو اسے اگلے شمارے میں ضمیمہ کے طور پر چھاپا

جاتا۔ چنانچہ کلام غیر طرح بشرط گنجائش شامل اشاعت ہوتا۔ اشعار پر اصلاح فی شعر ایک آنہ کے حساب سے کی جاتی تھی۔

اپریل ۱۸۹۷ء سے نظم کے سولہ صفحات کے علاوہ آٹھ صفحات میں ناول قسط وار شائع ہونے لگی تھی۔ جیسا کہ جون ۱۸۹۷ء کے شمارہ پر آخری صفحہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شمارہ سے قبل ناول کے چار جزو شائع ہو چکے تھے۔ اسی عبارت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس گلدستہ کے ساتھ چار صفحے کلیات فارسی، حضرت سید شاہ صاحب عالم، سجادہ نشین درگاہ مارہرہ کے شائع ہوتے تھے۔ گلدستہ کی قیمت عام معہ ناول ۸/ سال مع محصول ڈاک مقرر تھے۔ ضمیمہ کلیات کے ۱۲/ سال ور معہ گلدستہ ۸/ سال مقرر تھی۔

سرورق کی پیشانی پر نیم منقش دائرہ میں "ریاض سخن" رومن حروف میں اور اس کے درمیان نستعلیق میں "ریاض سخن" لکھا جاتا۔ اس کے نیچے منقش چوحاشیہ، چوحاشیہ میں جلد نمبر شمارہ نمبر، تاریخ اشاعت مندرج ہوتی۔ اور پھر نیچے یہ شعر تحریر ہوتا۔

کدھر ہو تم اے عندلیبان معنی
چلو پھول لوٹو "ریاض سخن" کے

امداد صابری صاحب نے اس گلدستہ کے تعارف میں محض پہلے شمارہ سے مدد لی ہے[۹]۔ اس وقت تک اس گلدستہ کی طباعت مذکورہ طور پر ہوتی تھی۔ لیکن راقم الحروف کے کتب خانہ میں اس کا شمارہ جون ۱۸۹۷ء موجود ہے جس کی طباعت میں بڑی تبدیلیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے مہتمم کا نام احمد علی شوق کے بجائے وفا مارہروی ہے۔ اور مرقع عالم پریس سے چھپ کر مارہرہ سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مرتبین۔ جناب سید علی احسن صاحب احسن اور سید افتخار عالم صاحب آزاد مارہروی ہیں۔ سرورق پر مرقومہ بالا شعر کے بجائے یہ شعر درج ہے ۔

پھولے ہیں اب تو مردم دیدہ چمن کے پھول

آنکھوں سے چن رہی ہیں "ریاض سخن" کے پھول

زیر نظر شمارہ کے ورق کے دوسرے صفحہ پر ایک ناول "نیل کا سانپ" کا اشتہار ہے۔ سرورق کے تیسرے صفحہ پر مطبوعات مختلف کے اشتہارات ہیں۔ پہلے "مذاق سخن" کے عنوان سے ایک اشتہار ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نام کا ایک گلدستہ با اہتمام منشی اسلد علی صاحب شور و منشی رادھا موہن صاحب عاجز' متھرا سے ماہوار نکلتا ہے۔ دوسرا اشتہار "تذکرہ" کے نام سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مینجر "مہر منیر" بھوپال' قدیم شعرائے ہند کا ایک تذکرہ مرتب کر رہے ہیں۔ جس میں شعراء کو اپنا کلام اور اپنے حالات بھیجنے کے لئے کہا گیا ہے۔ سرورق کے آخری صفحہ پر "ریاض سخن" کی اشاعت کے قواعد دیئے گئے ہیں۔

یہ شمارہ بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ساڑھے چودہ صفحات پر مختلف شاعروں کا طرحی کلام شائع ہوا ہے۔ اس کے لئے مصرعہ طرح یہ دیا گیا تھا۔

مدتوں دل میں کسی کا غم رہا

صفحہ ۱۵ سے ۱۹ تک بقیہ کلام طرحی بابت ماہ مئی ۱۸۹۷ء شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۱۹ سے ۲۰ تک ایک غیر طرحی غزل شائع ہوئی ہے اور پھر آخر میں احمد علی شوق کی پانچ رباعیاں شامل اشاعت ہیں۔ مذکورہ مصرعہ طرح پر جن شعراء کا کلام درج ہے ان کا نام اور غزل کا مطلع ذیل میں درج ہے۔

احسان' جناب ابوالاعجاز منشی محمد احسان علی خاں صاحب شاہجہان پوری مہتمم ارمغان ۔

چین سے دل میں تمہارا غم رہا
خوش رہا راضی رہا خرم رہا

احسن' خاکسار' سید علی احسن' مینجر ریاض سخن شاگرد حضرت داغ مدظلہ ۔

عشق بت میں یہ نیا عالم رہا
آنکھ میں آنسو تو دل میں غم رہا

اعجاز، جناب ابوالفجر محمد عبدالحیٔ صاحب خلف ڈپٹی محمد وارث صاحب از جبلپور۔

میرے گھر وہ فتنہ عالم رہا
دشمنوں کو اور اس کا غم رہا

آفت، جناب مرزا منیر بیگ صاحب شاگرد حضرت جلال لکھنوی از پٹنہ۔

بوسے بازی کا مزا باہم رہا
وصل میں شب بھر یہی عالم رہا

امین، جناب منشی محمد امین خاں صاحب برادر خورد جناب بیدل از شاہجہانپور۔

کیوں لیا بوسہ کہ وہ برہم رہا
عمر بھر ہم کو اسی کا غم رہا

انوار، جناب سید محمد انوار احمد صاحب شاگرد حضرت امیر مینائی از شاہجہانپور۔

شوق وصل دلربا ہر دم رہا
جب تک اپنے دم میں باقی دم رہا

بدر، جناب منشی سید مصطفیٰ حسین صاحب شاگرد حضرت نسیم از بھرتپور۔

یار کے گھر مدتوں ماتم رہا
ہم سے بھی اچھا ہمارا غم رہا

بیباک، جناب سید حسین احمد صاحب شاگرد حضرت داغ مدظلہ، از شاہجہانپور۔

عمر بھر عشق بتاں میں غم رہا
خانہ دل خانہ ماتم رہا

باقی، جناب عبدالباقی خاں صاحب رئیس شاہجہانپور شاگرد جناب فضل۔

داغ جب شاہ دل میں جم رہا
کام آئے گا جو یہ درہم رہا

بیدل، جناب منشی نیاز حسن خاں صاحب رئیس شاہجہانپور شاگرد حضرت احسان شاہجہانپوری۔

مدعی اوس شوخ کا ہمدم رہا
بس یہی صدمہ ہمیں ہر دم رہا

بیدل، ابوالخیر جناب منشی بخش اللہ صاحب رئیس مارہرہ۔

خوب شغل میکشی باہم رہا
اپنا جام مے بھی جام جم رہا

جناب تائب شاہجہانپوری۔

میری تربت پر جو سبزہ جم رہا
وہ بھی اوڑھے چادر ماتم رہا

تسلی، جناب ابوالخیر منشی محمد قطب الدین علی صاحب تلمیذ جناب علوی از حیدر آباد دکن۔

خوش نہ میں دنیا میں کوئی دم رہا
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا

جناب، جناب حکیم عبداللطیف صاحب تلمیذ جناب نظمی از جلورہ۔

زندگی میں موت کا عالم رہا
عشق خاصیت میں ایسا پیہم رہا

دلیر، جناب منشی سید امیر حسن صاحب رئیس مارہرہ معاون گلدستہ شاگرد حضرت داغ مدظلہ۔

وہ اگر درہم تو میں برہم رہا
پھر کہو میں غیر سے کیوں کم رہا

رضا، جناب سید محمد رضا صاحب بھرتپوری شاگرد حضرت نسیم۔

ہجر کا جس کو ہمیشہ غم رہا
اے مسیحا اس میں پھر کیا دم رہا

رسا، جناب حافظ فصیح الدین صاحب از بھرتپور شاگرد جناب نسیم۔

دم مرا اولجھا ہوا ہر دم رہا
تیرے ملنے کا نہایت غم رہا

ریاضؔ، جناب محمد ریاض صاحب خلف جناب نائب از شاہجہاں پور ۔

بن کے مہمان دل میں اس کا غم رہا
گھر خدا کا خانہ ماتم رہا

سعیدؔ، جناب محمد سعید حسین خاں عرف اچھے صاحب رئیس بریلی خلف الصدق جناب مولوی فدا حسین صاحب پنشن یافتہ منصف از شاہجہانپور ۔

پھک گیا دل ضبط گریہ سے مرے
آگ اک بھڑکی جو آنسو تھم رہا

سلامتؔ، جناب سلامت اللہ صاحب تلمیذ جناب نائب از شاہجہانپور ۔

کہتی اس قد کی بلندی ہے یہی
اب قیامت کا زمانہ کم رہا

شوقؔ، عالی جناب منشی احمد علی صاحب از بھوپال ۔

قصر دل دنیا میں خالی کم رہا
یا خوشی اس میں رہی یا غم رہا

صبرؔ، جناب سید ایوب حسن صاحب رئیس مارہرہ شاگرد احسن مینجر گلدستہ ہذا ۔

دل میں جب تک ان بتوں کا غم رہا
اپنا دامن آنسوؤں سے نم رہا

عزیزؔ، منشی عزیز الرحمٰن صاحب شاہجہانپوری شاگرد حضرت احسان ۔

ہر بشر اس میں حریف غم رہا
دار دنیا خانہ ماتم رہا

نطرت کاکوروی از اورنگ آباد دکن شاگرد حضرت امیر مینائی و جناب آرزو لکھنوی

ہجر میں میں کیا کہوں کیا غم رہا
مردہ ارمانوں کا بس ماتم رہا

مضطر خیر آبادی استاد اعلیٰ حضرت ہزہائینس حضور نواب صاحب بہادر ٹونک ۔

دیکھ لینا تم جو دم میں دم رہا
یا تو میں ہی رہ گیا یا غم رہا

مضطر، جناب چودھری محمد عشرت حسین عرف منا میاں صاحب رئیس مارہرہ معاون گلدستہ شاگرد حضرت احسان شاہجہانپوری ۔

ایک مدت تک عجب عالم رہا
خانہ دل خانہ ماتم رہا

مکین، جناب محمد مکین خاں صاحب شاہجہانپوری شاگرد جناب نائب ۔

گر پڑا ہوتا کبھی کا آسماں
زور سے آہ رسا کے تھم رہا

نظمی، جناب مولوی سید محمد جلال الدین صاحب از جلورہ ۔

جوش شوق وصل وہ باہم رہا
صبح تک ان میں نہ مجھ میں دم رہا

ہمیرز خاقانی وفا مہتمم گلدستہ ۔

مدتوں دل میں ہمارے غم رہا
یہ ہمارا مہرباں ہر دم رہا

یحییٰ، جناب محمد یحییٰ خاں صاحب شاہجہانپوری شاگرد حضرت احسان ۔

مضطرب کمبخت دل ہر دم رہا
کس مصیبت میں تمہارا غم رہا

جن شاعروں کا کلام بشرط گنجائش بقیہ طرح ماہ مئی ۱۸۹۷ء شامل اشاعت کیا گیا ہے، ان کا کلام اور مطلع درج ذیل ہے۔

آشفتہ جناب منشی محمد عطاالٰہی صاحب مارہروی شاگرد حضرت داغ مدظلہ۔
ہاں جس کے دل میں عشق شہنشاہ دیں نہیں
دونوں جہاں میں اس کا ٹھکانہ کہیں نہیں
(مطبوعہ "اردو" کراچی' اپریل ۱۹۸۰ء)

حواشی

۱۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد سوم ص ۲۳۲
۲۔ ایضاً" ص ۲۳۸
۳۔ جناب دبیر' "زبان" دہلی' فروری ۱۹۱۰ء بحوالہ ایضاً" ص ۲۳۲۔
۴۔ فضل حق خورشید "پیام یار" قومی زبان اپریل ۱۹۷۲ء
۵۔ سید فضل المتین "پیام یار" اردو ادب شمارہ ا' ۱۹۶۴ء
۶۔ ایضاً" اردو ادب شمارہ ا' ۱۹۶۲ء امداد صابری صاحب نے "تاریخ صحافت اردو" حصہ سوم میں "پیام یار" جون ۱۸۸۳ء' مئی ۱۹۰۲ء جنوری سے دسمبر ۱۹۰۳ء' مارچ ۱۹۰۵ء کا ذکر کیا ہے۔
۷۔ بعض مقامات پر کچھ شعراء کے محض ایک یا دو شعر درج ہیں اور مطلع موجود نہیں۔
۸۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" حصہ سوم ص ۳۸۲
۹۔ ایضاً" ص' ۳۸۔۳۸۲

تنقیدات رنجور

محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی (۱۸۴۳ء-۱۹۲۳ء) اپنی علمی و ادبی حیثیت میں ہماری تاریخ کے ان اکابر میں گزرے ہیں، جنہیں ان کی اہمیت و خدمات کے لحاظ سے وہ ناموری حاصل نہ ہوئی، جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ متعدد کتابوں اور مضامین کے مصنف و مرتب ہیں اور ایک ایسے پرگو شاعر، جن کا متنوع کلام بیسویں صدی کے اوائل میں ادبی رسالوں میں چھپتا رہا۔ رباعیات کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا، لیکن کمیاب رہا اور مشہور نہ ہوا۔ کلکتہ یونیورسٹی میں انہوں نے چیف مولوی اور بورڈ آف اگزامنر کے رکن کی حیثیت سے کئی سال یہ خدمات انجام دیں اور وہاں فارسی کے استاد بھی رہے۔ ان سب صفات کے باوجود محض چند تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں انہیں جگہ دی، حکومت نے ضرور انہیں ان کی خدمات کے صلے میں "شمس العلماء" اور "خان بہادر" کے خطابات سے نوازا۔

غالباً" حکومت نے یہ خطابات ان کی خدمات سے قطع نظر ان کی اور ان کے خاندان کی تالیف قلب کے لئے دیئے تھے۔ کیونکہ ان کا خاندان (اہل صادق پور، پٹنہ) سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین میں نہایت فعال اور سرگرم رہنے کے باعث حکومت برطانیہ کا معتوب رہا تھا۔ اس تحریک کے دور دوم کے سرگرم مجاہد اور رہنما

مولانا یحییٰ علی (متوفی ۱۸۶۸ء) رنجور کے والد تھے۔ مولانا یحییٰ علی کے بھائی اور شریک کار مولانا احمد اللہ (متوفی ۱۸۸۱ء) رنجور کے چچا اور اس تحریک کے ایک اور سرگرم رکن مولانا عبدالرحیم (متوفی ۱۹۲۳ء) مصنف "تذکرۂ صادقہ" ان کے ماموں تھے۔ جب انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں حکومت کا رویہ مصلحتہ" قدرے تبدیل ہوا تو اس خاندان کی تالیف قلب کے لئے بھی اس کے کچھ افراد کو خطابات سے نوازا گیا۔ اس خاندان کی متاخر نسل نے جدید تعلیم میں دلچسپی لی اور کچھ نے مغربی طرز کو بھی اختیار کر لیا۔ اس کے ایک فرد مولوی محمد حسن نے علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر اپنے علاقہ میں پہلا جدید طرز کا محمڈن اینگلو عربک اسکول قائم کیا اور "پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے انداز پر اصلاحی جریدہ شائع کیا۔ یہ مولوی محمد حسن' جو خود بھی "شمس العلماء" کے خطاب سے سرفراز ہوئے' رنجور کے خالو تھے۔ رنجور ان کے زیر اثر رہے اور انہی کی تحریک پر علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور فراغت تعلیم کے بعد انہی کے قائم کردہ اسکول میں مدرس ہو کر ان کے جاری کردہ رسالے کی ادارت بھی کرتے رہے۔ پھر ۱۸۹۰ء کے بعد یہ کلکتہ چلے گئے جہاں کلکتہ یونیورسٹی کے بورڈ آف آگزامنر کے چیف مولوی کی حیثیت سے ۳۰ سال تک خدمات انجام دیتے رہے اور ۱۹۲۱ء میں سبکدوش ہو کر اپنے وطن مالوف پٹنہ منتقل ہو گئے اور وہیں دو سال بعد انتقال کیا۔

رنجور نے اپنی ساری زندگی اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں عزت و وقار کے ساتھ گزاری اور ہمہ وقت تخلیقی و تصنیفی مشاغل میں مصروف رہے لیکن ان کی سنجیدہ اور گوشہ گیر طبیعت نے انہیں وہ شہرت نہ دی جس کے وہ مستحق تھے۔ اب حالیہ چند برسوں میں ان کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کی اشاعت نے انہیں کسی حد تک گوشہ گمنامی سے نکالا ہے اور یہ بات عام ہوئی ہے کہ وہ مولانا کے لئے نہ صرف ایک بزرگ اور بھائی تھے بلکہ سید احمد خاں اور شبلی نعمانیؒ

کے بعد مولانا آزاد کی شخصیت اور ذہن و فکر کی تشکیل و تعمیر میں اگر کوئی اور نام بھی ہے تو وہ رنجور ہی کا ہے۔ مولانا آزاد سے ان کے روز مرہ کے روابط رہے اور وہ ان کے مشیر کی حیثیت سے "احسن الاخبار" اور متعلقہ امور کے شریک و معاون رہے تھے۔ مولانا آزاد نے انگریزی انہی سے سیکھی تھی اور اصلاح سخن بھی انہی سے لیا کرتے تھے۔

ان کا کلام پختہ اور شاعری کے محاسن و رموز سے آراستہ ہے۔ بالعموم غزل پر ان کی توجہ زیادہ رہی، لیکن منظومات، قطعات، رباعیات اور ریختی و گیت بھی ان سے یادگار ہیں۔ رباعیات کا ایک مجموعہ "گل صد برگ" مطبوعہ ہے اور متعدد غزلیں و منظومات مختلف رسائل میں ملتی ہیں، لیکن یکجا کلام شائع نہیں ہوا۔ ایک خاندانی روایت کے مطابق انہوں نے اپنا غیر مطبوعہ دیوان نذر آتش کر دیا تھا، لیکن اس کے باقیات میں سے ایک دو بیاضیں ان کے اخلاف کے پاس بچ گئی تھیں، جن میں سے ایک "خدا بخش لائبریری" (پٹنہ) میں محفوظ ہے۔ دو بیاضیں راقم کے ذخیرہ کتب میں بھی موجود ہیں، جن میں شامل کلام ایک قدرے تفصیلی تعارف کے ساتھ راقم نے مرتب کیا ہے۔

ان کی جو دیگر تالیفات، مضامین کے علاوہ، راقم کے ذخیرے میں موجود ہیں، یا نظر سے گزریں، وہ یہ ہیں۔

(۱) کلام اردو

مجموعہ مضامین نظم و نثر، مطبوعہ الہ آباد، ۱۹۰۸ء .... اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور اس میں شامل تمام تحریریں قدرے ترمیم کے ساتھ ترجمہ کی گئی تھیں۔ یہ خود رنجور کے اہتمام سے کلکتہ سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا۔

(۲) وزیر لنکران کی سرگزشت

یہ ایک ڈراما ہے، جسے رنجور نے میجر سی، فلوٹ، سیکرٹری بورڈ آف اگزامنر، کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ مل کر فارسی سے اردو میں منتقل کیا، اصلاً" یہ ڈراما آذر بائیجان ترکی میں مرزا فتح علی اخوند زادہ کا تخلیق کردہ تھا، جسے اس کی مقبولیت و دلچسپی کے باعث فارسی میں مرزا جعفر نے ترجمہ کیا تھا۔ رنجور کا یہ ترجمہ ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ "اردو روزمرہ" نامی کتاب میں شامل ہے، جو کلکتہ سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو فلوٹ نے نصابی ضرورت کے تحت ترتیب دیا تھا۔

فلوٹ کی مرتبہ اسی کتاب کا انگریزی ترجمہ "Annotated English Translation of Urdu Rozmarra" بھی اسی سال کلکتہ سے چھپا تھا اور اس کی تالیف میں رنجور نے اس کی مدد کی تھی، جس پر فلوٹ نے ان کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔

(۳) "Annotated Glossary to the Urdu Rozmarra"

مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۱۱ء۔ رنجور کی مرتبہ یہ کتاب فلوٹ کی مذکورہ سابق کتاب کے سلسلے میں تھی۔

(۴) نظم منتخب

رنجور نے اسے مولوی سید سجاد علی کے ساتھ مل کر مرتب کیا تھا۔ مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۰۹ء۔ یہ انتخاب نظم آنرز اردو کے نصاب کے لئے مرتب کیا گیا تھا اور اس میں انیسویں صدی کے اکابر اردو شعرا آتش، مومن، ذوق، غالب، انیس، امیر، داغ، حالی، اکبر کا منتخب اور نمائندہ کلام شامل کیا گیا ہے اور ان شعرا کے حالات اور ان کے کلام پر مختصر تبصرہ تحریر کیا گیا ہے۔

ان تالیفات میں سے "نظم منتخب" رنجور کی ایسی تالیف ہے جو ان کے

اپنے کلام سے قطع نظر' ان کے شاعرانہ خیالات کو اخذ کرنے میں قدرے معاون ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں جہاں ایک جانب ان کا ایک مکتوب بنام شوق سندیلوی مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۲۰ء (مشمولہ "اصلاح سخن" مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۶ء) شاعری کے تعلق سے ان کے نظریے کو پیش کرتا ہے' وہیں ان کے اپنے دیوان کو نذر آتش کرنے کی روایت بھی قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس اقدام کا سبب اس کے علاوہ شاید کوئی اور نہ ہو کہ ایک مجاہدانہ خاندانی پس منظر رکھنے والا شخص' جو وقتاً فوقتاً" اپنی خاندانی مسجد میں نماز کی امامت بھی کرتا ہو اور اپنی آمدنی کا کچھ حصہ انگریزوں سے برسرپیکار شمالی سرحدی مجاہد تنظیموں تک بھجواتا ہو' اپنے کلام میں معاملہ بندی و عاشقانہ موضوعات شعر اور ریختی کی تخلیق پر شرمسار ہو کر اس اقدام پر آمادہ ہوا ہو' یہ انتخاب اور اس میں تحریر کردہ ان کے شذرات شاعری کے ضمن میں ان کے خیالات کو اخذ کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

اگرچہ ان کے تحریر کردہ یہ شذرات مختصر ہیں' لیکن جو نکات ان میں ملتے ہیں' وہ قابل توجہ ہیں۔ ان میں وہ ایک ایسے فرد کی صورت میں بھی نمایاں ہوتے ہیں' جو ایک طرف عقائد کے لحاظ سے انتہائی راسخ العقیدہ ہے' لیکن غیر متعصب بھی ہے۔ آتش اور انیس کے بارے میں ان کے تاثرات کا واضح مظہر ہیں۔ انیس و دبیر کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے' وہ شبلی پر بھی ان کی ایک طرح کی تنقید کا پہلو رکھتا ہے۔

چونکہ ان کی تالیف "نظم منتخب" کمیاب ہے' اس لئے اس میں شامل ان کے تحریر کردہ شذرات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں' جنہیں تبرکات رنجور اور تنقیدات رنجور کے ذیل میں شمار کیا جانا چاہئے۔

آتش

خواجہ حیدر علی نام' آتش تخلص۔ ان کے والد خواجہ علی بخش دہلی کے رہنے والے تھے۔ آبائی پیشہ فقر و تصوف اور پیری مریدی تھا مگر طبیعت کے فطری رجحان نے شاعری سے آشنا کیا اور ساری عمر اسی شغل میں بسر کی۔ نواب مرزا محمد علی خاں متخلص بہ ترقی ان کے سرپرست تھے۔ اول فیض آباد میں رہے۔ پھر ان کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ اسی روپیہ ماہوار بادشاہ لکھنؤ کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا اور یہی ایک معین رقم ذریعہ معاش تھی' چونکہ طبیعت لا ابالی اور دست کشادہ تھا اس لئے اکثر اختتام ماہ سے پہلے یہ رقم خرچ بھی ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی ایک دو فاقے بھی گزر جاتے تھے۔ لیکن دل دولت استغنا سے مالا مال تھا۔ اس لئے دست سوال پھیلانے کی ذلت کبھی گوارا نہ کی۔

جس دور میں انہوں نے بار پایا وہ لکھنؤ میں شاعری کے عروج کا زمانہ تھا اور قدردانوں اور فیاضوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ لیکن انہوں نے کسی امیر کے ہاں امید انعام سے غزل سرائی کی اور نہ کسی رئیس کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ ان کا دیوان ایشیائی شاعری کے اس بدترین حصہ کلام سے پاک و صاف ہے اور یہ وہ وصف ہے جس میں ایشیا کے معدودے چند شاعر ہی ان کی ہم سری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ ان کے ہم عصر تھے۔ ان سے مدت العمر چشمک رہی۔ مشاعروں میں اکثر مقابلے ہوتے رہتے تھے اور طرفین کے شاگرد اپنے اپنے استادوں کے زیر علم رہتے تھے۔

سنہ ۱۲۶۲ھ مطابق سنہ ۱۸۴۶ء میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکا یک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ ان کا دیوان صفائی خیالات اور سلاست بیان کا ایسا عمدہ نمونہ ہے جس سے بہتر لکھنؤ کے خاص

شعرا میں مل نہیں سکتا۔ (ص: ۱)

مومن

نام مومن خاں، تخلص مومن۔ سنہ ۱۲۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد حکیم غلام نبی خاں شہر کے شرفا میں سے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ حکیم نامدار خاں، جو نجیب ہائے کشمیر میں سے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دہلی آ کر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ اور کئی مواضع انہیں جاگیر میں ملے۔ جب سرکار انگریزی نے جھجھر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی۔ نواب مذکور نے جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثۂ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ حکیم مومن خاں نے دہلی کے مشہور عالم مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے عربی اور اپنے والد اور چچا سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ پھر شاعری میں کمال حاصل کیا۔ اور اس فن میں کسی کو اپنا استاد نہ بنایا۔ ان فنون کے علاوہ نجوم میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے اور شطرنج کے بڑے شایق تھے۔ انتہا درجہ کے طباع و ذکی تھے۔ حافظہ بھی بلا کا پایا تھا۔ فن تاریخ گوئی سے طبعی مناسبت تھی۔ تعمیہ اور تخرجہ جو اس فن میں معیوب سمجھا جاتا ہے، ان کی طبع رسا نے اسے محسنات میں داخل کر دیا۔ مثلاً اپنی بیٹی کی ولادت کی تاریخ کہی:

نل کٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ دختر مومن

"دختر مومن" کے اعداد میں سے "نل" کے اعداد کو خارج کر کے

تاریخ نکلتی ہے۔ سید احمد صاحب شہید بریلوی کے مرید تھے۔ دل کے غنی اور خوشامد سے سخت متنفر تھے۔ کبھی کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں لکھا۔ ہاں ایک بار جب رئیس پٹیالہ نے انہیں ایک ہتنی عنایت کی تو شکریئے میں ایک قصیدہ مدحیہ اس کو لکھ کر دیا۔ نہایت نازک خیال اور قادر الکلام شاعر تھے۔ سنہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ ان کے ایک شاگرد نے ان کی وفات کی تاریخ "ماتم مومن خاں" کہی۔

(ص : ۱۴۳)

ذوق

شیخ محمد ابراہیم نام، ذوق تخلص، ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۴ھ مطابق سنہ ۱۷۸۹ء کو شاہجہاں آباد دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ اسی لئے شاعری ان کو ورثہ میں نہیں ملی۔ مگر جو طبیعت قسام ازل سے ملی تھی وہ اسی فن کی خدمت کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ تحصیل علم کے زمانے میں شاعری کا شوق ہوا اور پہلے حافظ غلام رسول شوق اور پھر شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے کہ اس دور کے کہنہ مشق اور مستند شاعر تھے۔ پہلے پہل مشاعرے میں جب غزل پڑھی تو تحسین و تعریف نے ایسی ہمت بڑھائی کہ پوری توجہ سے اس فن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ ایک دن مرزا رفیع سودا کی غزل پر غزل لکھی مگر شاہ نصیر نے اس پر سرزنش کی کہ ایسے استاد کے مقابلہ پر قلم اٹھانا دلیل عجب و غرور ہے۔ اس دن سے انہوں نے بھی شاہ نصیر سے اصلاح لینی بند کر دی، اور فطرت سلیم کی رہنمائی سے معراج سخن کو طے کرنے لگے۔

جب ان کے جوہر کمال کی شہرت پھیلی تو ان کا چرچا قلعہ معلیٰ، تک

بھی پہنچے۔ اکبر شاہ ثانی بادشاہ اور بہادر شاہ ولی عہد تھے۔ حسن اتفاق سے بہادر شاہ کی انہیں پر نظر پڑی اور اپنا استاد منتخب کر لیا۔ انہیں کے ذریعہ دربار تک رسائی حاصل ہوئی۔ ۱۹ برس کی عمر تھی کہ بادشاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور خاقانی ہند کے خطاب کے مستحق ٹھہرے۔

بہادر شاہ جب ولی عہد سے بادشاہ ہوئے تو ان کو خان بہادر کا بھی خطاب دیا اور ایک ہاتھی مع حوضہ نقرئی' مرحمت ہوا۔ تاریخ انتقال ۲۴ صفر سن ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء (ہے) مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا۔

افسوس آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ان کی شاعری کا اصلی کارنامہ قصائد ہیں۔ سودا کے بعد اس درجہ کا قصیدہ گو اردو میں کوئی نہ ہوا۔ عام لحاظ سے بھی ان کی شاعری انواع محاسن سے لبریز ہے۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ غدر سنہ ۵۷ میں تلف ہو گیا۔ جو کچھ بچا اس کو ان کے شاگرد رشید مولوی محمد حسین آزاد نے ایڈٹ کر کے چھاپا ہے۔

(ص: ۲۵)

غالب

مرزا اسد اللہ خاں نام' ابتدا میں اسد تخلص تھا' مگر جب سنا کہ یہی تخلص ایک مجہول الحال اور فرومایہ شخص کا ہے تو اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص رکھا۔ ان کا خاندان سلسلہ افراسیاب شاہ توران سے ملتا ہے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ مطابق سنہ ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبد اللہ خاں بیگ الور میں راجہ بختاور سنگھ کے ہاں ملازم تھے۔ وہاں کسی

لڑائی میں مارے گئے اور مرزا کو پانچ سال کی عمر میں یتیم اور بے کس چھوڑ گئے۔ ان کے بھائی نصراللہ خاں بیگ مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ اپنے یتیم بھتیجے کی پرورش انہوں نے اپنے ذمے لی۔ مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی نے ان کو بھی چھین لیا۔ نصراللہ خاں لارڈ لیک کے عہد حکومت میں صوبہ دار کشمیر ہو گئے تھے۔ سترہ سو ماہوار وظیفہ تھا' اور ڈیڑھ لاکھ کی سالانہ جاگیر۔ مگر وہ سب ضبط ہو گئی۔ گورنمنٹ نے ان کے وارثین کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ دیئے مگر متوسلین کی خود غرضی سے مرزا کو ایک حبہ نہ ملا۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ آئے اور چاہا کہ اپنی فریاد حکام اعلیٰ تک پہنچائیں مگر صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ نظر بر اعزاز' خاندانی ملازمت سرکاری کے ساتھ سات پارچہ خلعت تین رقم چغہ مرصع اور مالائے مروارید کے مستحق ٹھہرے۔ ان کی شادی دہلی میں ہوئی تھی۔ اسی تعلق سے دہلی آئے اور پھر اس طرح یہ خاک' دامن گیر ہوئی کہ آخر عمر تک وہیں رہے۔ قلعہ دہلی سے بھی چھ سو روپیہ سالانہ کی رقم سلاطین مغلیہ کی تاریخ لکھنے کے معاوضہ میں مقرر ہو گئی تھی اور نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب بھی ملا تھا۔ مگر جب غدر کے ہنگامے نے دہلی کی بساط الٹی تو بہت درماندہ و لاچار ہو گئے۔ مجبور ہو کر رامپور جانا پڑا۔ جہاں کے رئیس نواب یوسف علی خاں ناظم ان کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بارہ سو روپیہ سالانہ تنخواہ مقرر کر دی اور یہ آخر عمر تک ملتی رہی۔ ۷۳ برس کی عمر پائی' اور سنہ ۱۸۶۹ء میں مطابق سنہ ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔

مرزا غالب اپنا اصلی کارنامہ فارسی نظم و نثر کو سمجھتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ امیر خسرو اور فیضی کے بعد خاک ہند نے فارسی کا کوئی باکمال ایسا پیدا نہیں کیا مگر ان کی اردو شاعری اور نثاری بھی اپنی خصوصیات میں سب پر فائق ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو جو صرف حسن و عشق کے میدان میں محدود تھی۔ آزاد کیا اور اخلاق و تصوف اور فلسفہ و سائنس کی آمیزش سے باعظمت

بنایا۔ نثر اردو کی اصلاح کا تاج بھی انہی کے سر پر زیب دیتا ہے کہ اردوئے معلٰی کی سلاست اور صفائی کا جواب آج تک ممکن نہیں۔ ان کا کلیات نظم و نثر فارسی اور اردو بار بار چھپ چکا ہے۔

(ص: ۳۶)

انیس

میر ببر علی نام، انیس تخلص، سنہ ۱۲۱۶ھ مطابق سنہ ۱۸۰۱ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ خاندانی وطن دہلی تھا مگر تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی۔ اول تو شاعری کئی پشتوں سے وراثت میں ملی تھی، اس پر طرہ یہ کہ مرثیہ گوئی گھر کا فن تھا۔ اس لئے ابتدائے شاعری کی اس صنف خاص ہی پر متوجہ ہوئے، اور مرثیہ گوئی کو گمنامی سے نکال کر اس درجہ پر پہنچا دیا کہ وہ شاعری کا اعلیٰ ترین حصہ بن گیا۔

میر حسن ان کے دادا اور میر ضاحک پردادا تھے۔ یہ وہی میر ضاحک ہیں جن کی ہجو مرزا رفیع سودا نے لکھی تھی۔ میر حسن کا نام ان کی بے مثل مثنوی
"بدر منیر" نے ایسا چمکایا کہ کبھی ظلمت گمنامی میں چھپ نہیں سکتا۔ ان کے والد میر خلیق مصحفی کے شاگرد رشید اور مرثیہ گوئی میں جوہر فرد تھے۔ پس میر انیس کا شاعر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ طبیعت بھی مبدء فیاض سے ایسی ملی تھی جس نے انہیں از سر تا پا قدرتی شاعر بنا دیا تھا۔ ان کا موضوع گو مرثیہ تھا مگر اس محدود دائرے میں رہ کر انہوں نے اردو کی تنگنائے شاعری کو جس درجہ وسیع کیا اور حقیقی شاعری کو جو عدیم النظیر نمونے دکھلائے اس کے لحاظ سے جائز طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے اول درجہ کے شاعر صرف وہی

تھے' اور ان لوگوں میں سے ایک تھے جن کو دنیا صدیوں کے بعد پیدا کرتی ہے۔ مرزا دبیر ان کے ہم عصر' ہم فن اور ساتھ ہی حریف مقابل بھی تھے اور ایک بڑی جماعت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ دبیر کو انیس کا مدمقابل بنانا انیس کی شاعری پر سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس قدرتی شاعر سے کسی کو نسبت نہیں۔ وہ سب پر فائق ہے۔

میر انیس کا کلیات کئی جلدوں میں چھپ چکا ہے اور اردو شاعری کا اعلیٰ ترین ٹکڑا ہے۔ انہوں نے جس منظر کو لکھا ہے' دکھا دیا ہے۔ اور جس کیفیت کو نظم کیا ہے اس میں پڑھنے والوں کو رنگ دیا۔ درد و غم' خوشی و مسرت' یاس و ناامیدی' خوف و ہراس اور اسی قسم کے سینکڑوں واردات اور جذبات ہیں جن کو ان سے بہتر مغرب اور مشرق کے شعرا نے بہت کم لکھا ہو گا۔

(ص: ۴۱)

امیر

منشی امیر احمد مینائی نام' امیر تخلص تھا۔ شاہ نصیر الدین شاہ اودھ کے عہد حکومت میں تاریخ ۲۱ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق سنہ ۱۸۲۹ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام کرم محمد عرف محمد صاحب تھا۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف بزرگ شاہ مینا صاحب ان کے اجداد میں سے تھے۔ اسی وجہ سے یہ اپنے نام کے آخر میں "مینائی" کا لفظ ضم کرتے تھے۔ عربی و فارسی کے علم و ادب میں فارغ التحصیل تھے اور ان زبانوں کی تعلیم دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ میں حاصل کی تھی۔ نجوم جفر اور طب وغیرہ میں بھی دخل رکھتے تھے اور شاعری کے لئے تو ایسی طبیعت پائی تھی کہ ان کی نازک خیالی اور مضمون

آفرینی کو اہل دہلی اور اہل لکھنؤ سب تسلیم کرتے ہیں۔ اس فن میں منشی صاحب، تدبیر الدولہ مظفر الملک، منشی سید مظفر علی خاں متخلص بہ اسیر کے شاگرد تھے، جو مصحفی کے خاندان سے تھے اور اپنی شاعرانہ قابلیت کے اعتبار سے فخر خاندان تھے۔ انہوں نے ناسخ اور آتش کو دیکھا اور صبا، وزیر، انیس، دبیر وغیرہ نامی شاعروں کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ سنہ ۱۲۷۵ھ میں نواب محمد یوسف علی خاں والی رامپور کی سرکار میں ملازم ہو گئے، اور نواب نے انہیں نہایت اعزاز و احترام سے رکھا۔ سنہ ۱۲۸۱ھ میں جب نواب یوسف علی خاں نے انتقال کیا اور نواب کلب علی خاں کے ہاتھ میں عنان حکومت آئی تو نواب آخر الذکر نے نہ صرف منشی صاحب کو ان کی جگہ پر برقرار رکھا بلکہ ان کی شاگردی کا فخر بھی حاصل کیا۔ ان کے دو دیوان "مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" مشہور اور ہر دل عزیز ہیں۔ اردو کا ایک مبسوط لغت بنام "امیر اللغات" تصنیف کیا جس کی صرف دو جلدیں، جو صرف باب الف میں ہیں اور ساڑھے چھ ہزار الفاظ پر حاوی ہیں، ان کی حیات میں شائع ہو سکیں اور وہ لٹریچر کے اس بے بہا خزانے کے بڑے حصے سے اہل ملک کو مستفیض کرنے سے قبل اس جہان سے چل بسے۔ ان کے علاوہ منشی صاحب کی چند اور قابل قدر تصنیفیں بھی ہیں۔ "امیر اللغات" کی باقی جلدوں کی اشاعت میں حضور نظام سے امداد طلب کرنے کی غرض سے حیدر آباد گئے تھے کہ صرف ایک ماہ کے قیام کے اندر ہی شب یکشنبہ ۱۹ جمادی الاخری سنہ ۱۳۱۸ھ مطابق سنہ ۱۹۰۱ء کو بعمر ۷۴ سال راہی ملک بقا ہوئے اور حضرت یوسف و شریف صاحب کی درگاہ واقع حیدر آباد میں مدفون ہوئے۔

(ص: ۷۳)

داغ

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص، ۲۵ مئی سنہ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ کو دارالخلافہ شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نواب شمس الدین خاں بہادر تھا جو فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ کے چھوٹے بیٹے تھے۔ جنہوں نے بھرت پور کے مشہور محاصرہ میں انگریزی فوج کے ساتھ ہو کر ایسی داد شجاعت دی کہ مذکورہ صدر خطابات اور ریاست فیروز پور کے عطیہ کے مستحق ٹھہرے۔

نواب مرزا خاں کا شاعر ہونا موروثی نہیں مگر قدرتی طور پر ضرور تھا۔ ان کی کم عمری میں نواب شمس الدین خاں کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی والدہ نے مرزا صاحب عالم ولی عہد بہادر شاہ (آخر تاجدار دہلی) سے دوسرا عقد کر کے قلعہ معلیٰ، میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی تھی۔ اس لئے ان کو حداثت سن ہی سے وہ صحبت ملی جو اس زمانہ میں پایہ تخت کی سوسائٹی میں منتہائے عروج تھی، اور جس کی دوامی بے فکری اور فارغ البالی میں کوئی مصروفیت حارج تھی تو وہ صرف شعر و شاعری تھی۔ پس ان کو ہوش سنبھالتے ہی شاعری کا شوق دامن گیر ہوا۔ اور صحبت کی یک رنگی نے اس آتش شوق کو اور زیادہ بھڑکایا۔ خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق پادشاہ کے علاوہ اکثر امراء اور شاہزادگان قلعہ کے استاد تھے۔ ان کا زانوائے ادب بھی انہی کے سامنے تہہ ہوا اور فارسی زبان کی تکمیل کے بعد سے اسی فن کی تحصیل شروع کر دی۔

وہ جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شعر اردو کے انتہائے کمال کی طرف بڑھے اس سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ ان کو اپنے فن کے مشاہیر متقدمین سے بدرجہ اتم مشابہت تھی۔ غدر ۵۷ء سے پہلے جب کہ ان کی عمر نے دنیا کی پچیس گرمیاں بھی پورے طور پر نہیں دیکھی تھیں وہ بہ حیثیت ایک خوش گو اور معنی یاب شاعر کے اچھی طرح پہچانے جاتے تھے اور قلعہ

کے علاوہ شہر کے معزز مشاعروں میں ان کی موجودگی کی خواہش کی جاتی تھی۔ اس دور کے مشاعرے ہندوستان کے مستقبل میں ہمیشہ یاد رہنے والے واقعات ہیں، کیونکہ یہ اردو فارسی کے ان اساتذہ کے مجامع تھے جن پر شاعری کا در حقیقت خاتمہ ہو گیا۔

سنہ ۵۷ء کے تاریخی سال میں ان پر دو مصیبتیں آئیں۔ پہلی یہ کہ ولی عہد سلطنت کا انتقال ہو گیا جو ان کے ولی اور سرپرست تھے۔ دوسرے غدر کی تباہی جو ہندوستان کے لئے ایک بلائے عظیم تھی۔ یہ زمانہ ان پر اور ان کے متعلقین پر بہت سخت تھا۔ ہنگامہ بغاوت کے فرو ہونے کے بعد نواب کلب علی خاں جو درحقیقت مردم شناسی اور قدردانی میں جوہر فرد تھے، ان کو داروغہ اصطبل سرکاری کا عہدہ دیا اور مصاحب خاص بنایا۔ یہاں بھی امیر، جلال، منیر، تسلیم اور موجودہ دور کے تمام ممتاز شعرا کا جمگھٹا تھا اور یہ صحبت ان کی شمشیر طبع کے لئے ایک عمدہ صیقل کا کام دیتی تھی، مگر سنہ ۱۳۰۵ھ میں جب کہ نواب کلب علی خاں کے انتقال سے رامپور کی صحبت درہم برہم ہو گئی تھی، یہ بھی دل برداشتہ ہو کر نکلے اور مختلف مقامات میں پھرتے ہوئے حیدر آباد دکن پہنچے۔ یہاں قسمت نے ایسی یاوری کی کہ موجودہ نظام دکن نے انہی کو فن شاعری میں اپنا استاد منتخب کیا اور انعامات اور صلہ کے علاوہ ایک معقول تنخواہ بھی مقرر کی جو آخر میں ۱۲۰۰ روپے تک ترقی کرتی ہوئی پہنچی۔

ان کے انتقال کی جھوٹی خبریں دشمنوں نے کئی مرتبہ شائع کیں۔ لیکن آخری خبر ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۳۲۲ھ مطابق سنہ ۱۹۰۵ء کو شائع ہوئی جب کہ در حقیقت قضا و قدر نے اردو کے اس آخری شاعر کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کی شاعری کی حیات جاوید کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔

ان کی تصانیف سے چار مکمل دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہیں۔ جن کی مقبولیت کا یہ فخر صرف مرزا داغ ہی کو حاصل ہے کہ ان کو دو دیوانوں کے پچیس ایڈیشن ان کی زندگی میں چھپے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے۔

(ص :۔۸۱۔۸۲)

حالی

الطاف حسین نام، حالی تخلص، اردو کے اساتذۂ عصر میں سے ہیں اور شاعری کی بزم آخر کے یادگار۔ اصلی وطن ان کا پانی پت ہے مگر نشوونما اور تعلیم شاہجہاں آباد (دہلی) میں پائی اور ان ارباب فن سے مستفیض ہوئے جن میں سے ہر ایک فرد بزم فضل و کمال کا صدر نشین تھا۔ غدر سنہ ۵۷ء سے پیشتر کی وہ بزم کمال جس میں غالب، ذوق، مومن، شیفتہ، آزردہ، صہبائی، علوی اور نیر، و سالک، جیسے پیغمبران سخن جلوہ افروز تھے۔ انہوں نے آنکھوں سے دیکھی اور بالخصوص غالب اور شیفتہ سے مدتوں سرگرم استفاضہ رہے۔ ادب عربی میں مولوی فیض الحسن سہارنپوری ان کے استاد ہیں اور استاد کی باکمالی سے شاگرد کی اثر پذیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غدر سنہ ۵۷ء کے بعد جب کہ وہ صحبت درہم برہم اور شمع کمال ہمیشہ کے لئے بجھ چکی تھی، فکر معاش نے انہیں پنجاب پہنچایا اور کرنیل ہالرائیڈ کی جوہر شناسی نے سرشتہ تعلیم کے سلسلہ میں انہیں بھی منتخب کیا۔ مولوی محمد حسین آزاد مصنف "آب حیات" وہاں پیشتر سے موجود تھے۔ ان دونوں باکمالوں کے اجتماع سے اس شاعری کی تشکیل ہوئی جو موجودہ اردو شاعری کے لئے طرۂ افتخار اور مستقبل کے لئے ایک شاہراہ عظیم ہے اور جو کبھی نیچرل شاعری، کبھی قومی شاعری اور کبھی نئی شاعری کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ حالی ہی کی طبع

سحرکار تھی جس نے نئی شاعری کو پستی زمین سے فراز فلک تک پہنچا دیا۔ ان کا "مسدس قومی" درحقیقت ایک صحیفہ اعجاز ہے اور اس رنگ میں متعدد مثنویاں اور متفرق نظمیں جن میں سے اکثر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی گئیں' ان کے جوہر کمال کا مستحکم ثبوت ہیں۔ ان کی اردو نثر بھی نظم کی طرح کم مقبول نہیں۔ یہ انہی کے متحرک قلم کا نتیجہ ہے کہ اردو لٹریچر میں مغربی طرز تصنیف کی متعدد سوانح عمریاں فراہم ہو گئیں اور "حیات سعدی" اور "حیات جاوید" جیسی کتابوں سے اردو کی الماری رونق پانے لگی۔ ان کا شاعری پر مقدمہ بھی اردو میں ایک بالکل نئی قسم کی کتاب ہے۔ جس میں شاعری کے موضوع پر فلسفیانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور سچ یہ ہے کہ جواہر فوائد سے پر ہے۔

اردو شاعری کے اساتذۂ پیشیں کے تربیت یافتہ باکمالوں میں ان کا مبارک وجود اب تک باقی رہ گیا ہے۔ خدا ان کی حیات میں ترقی دے۔

(ص: ۹۳)

اکبر

سید اکبر حسین نام' اکبر تخلص' موجودہ دور کے مشہور شاعر ہیں۔ سنہ ۱۸۴۶ء کو بارہ' ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے چچا تحصیل دار تھے۔ جیسا کہ عموماً" خاص لوگوں میں دیکھا گیا ہے بچپن ہی سے آثار ذہانت و فرزانگی ان کے ناصیہ اقبال پر درخشندہ تھے۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں انہوں نے وکالت درجہ ادنیٰ کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیل دار مقرر ہوئے اور ایک سال کے بعد ہی ہائی کورٹ کے مسل خواں ہو گئے۔ ان کی ترقی خواہ طبیعت کے لئے یہ سہارا بھی کافی نہیں ہوا اور سنہ ۱۸۷۳ء میں ہائی

کورٹ کی وکالت میں کامیابی حاصل کی اور چند سالوں کے بعد ہی منصف مقرر ہو گئے۔

انگریزی انہوں نے پرائیویٹ طور پر سیکھی تھی۔ لیکن قانونی قابلیت کے لئے ایسے گراں قدر جوہر نمایاں ہوئے تھے کہ سب آرڈنٹ ججی کے لئے ان کو عمدہ طور پر پیش کیا گیا اور پانچ سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ڈسٹرکٹ سیشن ججی کے لئے ان پر نظر پڑی اور اس کی قائم مقامی انہوں نے سالہاسال کی۔ ہائی کورٹ کی ججی کے لئے بھی ان کا نام لیا جاتا تھا لیکن سنہ ۱۹۰۵ء میں وہ اپنے مستقل عہدہ' ججی عدالت خفیفہ الہ آباد سے ریٹائر ہو گئے' اور اس لئے یہ خیال ظہور میں نہ آسکا۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ نے جوڈیشل سروس کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا کہ ان کا نیک نام اور خاموش عہد ملازمت اس کا واقعی مستحق تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی منتخب ہوئے اور عدالت خفیفہ الہ آباد کے ہال میں ان کی تصویر کو بھی عزت کے ساتھ جگہ دی گئی۔

آج کل وہ الہ آباد میں مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں اور موجودہ عہد کے ان منتخب شعرائے اردو میں سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے زمانے کے میلان عام اور جدید اثرات سے موثر ہو کر شاعری کے لئے نئی نئی راہیں نکالیں۔ ان کے کلام میں سنجیدہ اور نتیجہ خیز ظرافت کی آمیزش ایک ایسا دلکش حسن ہے جو ان کو اپنے تمام ہمعصروں میں نمایاں کرتا ہے۔ ان کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جدید خیالات کے ساتھ اردو شاعری کی قدیم خصوصیات کا بھی پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ مغربی تعلیم کے پورے حامی ہیں۔ انہوں نے اپنے لڑکے کو انگلستان میں تعلیم دلائی۔ مگر ساتھ ہی مغرب کی مادہ پرستی اور بے اعتدالانہ روش کے سخت مخالف ہیں اور قومی خصائص اور اخلاقی اوضاع کی محافظت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی تالیفات سے مسٹر بلنٹ کی "فیوچر آف اسلام" کا

اردو ترجمہ اور متعدد قانونی کتابیں چھپ چکی ہیں اور کلیات نظم عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

(ص: ۵۴)

("قومی زبان" کراچی، ستمبر ۱۹۹۵ء)

احمد دین کی ایک نادر کتاب:

آئینہ جاپان

احمد دین اپنی تصانیف "سرگزشت الفاظ" اور "اقبال" کی وجہ سے اردو دنیا میں معروف ہوئے' لیکن ان کے علاوہ ان کی تصانیف میں متعدد کتب ہیں' جو ان سے یادگار ہیں۔ ان تصانیف میں سے "اقبال" کو اپنے مبسوط مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مشفق خواجہ نے مرتب کیا ہے اور ان کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے بارے میں مفصل معلومات یکجا کی ہیں[۱]۔ ان کے مطابق احمد دین نے کم و بیش ۲۵ کتب تصنیف یا تالیف و ترجمہ کیں' جن میں سے ۲۱ کتب مشفق خواجہ کو دستیاب ہوئیں' جب کہ ۴ کتب ان کی رسائی میں نہ آ سکیں۔ یہ واقعہ ہے کہ احمد دین اپنے متعدد معاصر مصنفین کی طرح کثیرالتصنیف تھے اور یہ بعید از امکان بھی نہیں کہ ان کی ساری تصانیف اب کہیں یکجا دستیاب ہو سکیں۔ اس صورت میں کہ مشاہیر علم و ادب کے حالات اور ان کے علمی و تصنیفی کاموں کی تفصیلات بالعموم معروف و معلوم رہتی ہیں' لیکن پھر بھی ان کی زندگی کے چند گوشے یا ان کے علمی و تصنیفی کام کلی یا جزوی طور پر بعد میں بھی دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے احمد دین کی کسی ایک یا زائد تصانیف کا بعد میں معلوم یا دستیاب ہو جانا کوئی

غیر متوقع امر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کی کتاب "آئینہ جاپان" بھی اسی ذیل میں آتی ہے' جو کارخانہ پیسہ اخبار لاہور سے ۱۹۰۱ء میں ۲۲x۱۳ س م سائز پر شائع ہوئی تھی۔ یہ جاپان کے بارے میں ایک انگریزی کتاب کا ان کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔ ایک منقش حاشیہ میں سرورق کی ترتیب یہ ہے:

حرکت میں برکت ہے

آئینہ جاپان

یعنی

ملک جاپان کے ہر قسم کے تعلیمی' معاشرتی' ادبی' حرفتی' اخباری' جنگی وغیرہ ترقی کے حالات مسٹر احمد دین صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ' کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کے لئے انگریزی سے ترجمہ کئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۰۱ء میں مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور باہتمام کار پردازان طبع ہوا' قیمت فی جلد ایک روپیہ

مصنف کے نام کے ساتھ ان کا ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول گوجرانوالہ لکھا ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وہ ۱۹۰۱ء کے آس پاس گوجرانوالہ میں پیشہ تدریس سے منسلک تھے' جہاں ان کے والد[*] الہ دین بھی بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ پیشہ تدریس سے ان کی وابستگی کی اور کوئی شہادت منظر عام پر نہ آئی تھی۔ مشفق خواجہ نے ۱۹۰۱ء کے بعد احمد دین کے ملازمت سے منسلک ہونے کا ذکر اور "ملازم دفتر اردو اخبار" ہونے کا حوالہ دیا ہے[۲]۔ اس بارے میں

بہرحال علم نہیں ہوتا کہ وہ دفتر "اردو اخبار" سے کب سے کب تک منسلک رہے[۳]۔ اب یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ احمد دین نے وکالت کے بعد ۱۹۰۱ء کے آس پاس تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

یہ کتاب "جامعہ ٹوکیو برائے مطالعات خارجی" (جاپان) کے مرکزی کتاب خانہ کے گوشہ نوادرات میں محفوظ ہے۔ گوشہ نوادرات میں' جو متعدد مشرقی و مغربی زبانوں کی قدیم و نایاب و کمیاب کتب و جرائد پر مشتمل ہے' اردو و فارسی و عربی کی قدیم و کمیاب کتابیں بھی ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ احمد دین کی تصنیف

"اقبال" کی اشاعت ۱۹۲۶ء بھی یہاں موجود ہے۔ اس ذخیرہ میں بیشتر کتابیں اس جامعہ کے شعبہ اردو کے بانی مبانی اور جاپان کے بابائے اردو پروفیسر ری ایچی گامو (Reiichi Gamo) (۱۹۰۱ء - ۱۹۷۷ء) کا عطیہ ہیں۔ اسی ذخیرہ میں جاپان کے حوالہ سے متنوع موضوعات پر اردو میں شائع ہونے والی ایسی متعدد کتابیں بھی موجود ہیں جو' اب پاک و ہند کے کتب خانوں میں بھی دستیاب نہیں[۴]۔ جاپان کے حوالہ سے چند کتب کا ایک توضیحی کیٹلاگ اس جامعہ کے شعبہ اردو کے پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے ترتیب دیا تھا' جو خود ان کی ملکیت میں ہیں[۵]۔ ان ذخائر میں موجود مطبوعات کی فہرستوں میں اندراج نہ ہونے کے باعث بھی احمد دین کی یہ تصنیف معروف نہ ہو سکی۔

کتاب میں کوئی اندرونی سرورق' پیش لفظ اور فہرست عنوانات وغیرہ موجود نہیں۔ مذکورہ سرورق اور متن مکمل ہے۔ کتاب کی پشت پر آدھے آدھے صفحہ میں "پیسہ اخبار لاہور" اور "انتخاب لاجواب" کے اشتہارات شائع ہوئے ہیں۔ سرورق کا دوسرا اور تیسرا صفحہ سادہ ہے۔ صفحہ ۱ سے پہلا باب شروع ہو جاتا ہے۔ کتاب کا کل متن ۱ تا ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جگہ جگہ موضوعات کی وضاحت کے لئے متن میں "پنسل اسکیچ" تصاویر شامل

ہیں۔ جن کی تعداد ۳۵ ہے' اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصاویر انگریزی کتاب میں شامل تصاویر کا چربہ ہیں۔ یہ کسی طرح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کس انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ داخلی و خارجی کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ جس سے کتاب یا مصنف کے نام کا پتہ چل سکے۔ کتاب بہرحال کسی انگریز صحافی کی تصنیف لگتی ہے' کیونکہ مصنف نے جگہ جگہ جاپان اور انگلستان کے ماحول کا سرسری موازنہ کیا ہے۔ اس قدر شہادت بھی ملتی ہے کہ انگریزی تصنیف ۱۹ اپریل ۱۹۰۰ء اور اردو ترجمہ کی اشاعت ۱۹۰۱ء کے درمیانی مختصر مدت میں لکھی گئی اور شائع ہوئی۔ کیونکہ مذکورہ تاریخ کے حوالہ سے ایک جملہ کتاب کے صفحہ ۱۹۱ پر تحریر ہے۔

کتاب کے موضوعات کا اندازہ فہرست ابواب سے ہو سکتا ہے' جو یہ ہے : جاپانیوں کی خانگی زندگی' جاپانی اخبار نویسی' جاپانی معدلت گستری' جاپانی تعلیم' جاپانی بطور ایک مشرقی طاقت کے' جاپانی فنون و حرفت' ٹوکیو کے کاریگروں میں' جاپان کے فنون' صنائع' قدیم و جدید' جاپانی عورت' جاپانی جنگ (تماشے)' دیہاتی جاپان' کوہ آتش فشاں کا منظر پوشی دارہ' جاپانی زندگی کا ایک ایسا باب جو معرض تحریر میں نہیں آیا' جاپان' جاپانیوں کے واسطے' جاپان کی آئندہ حالت۔

یہ ترجمہ زبان کے لحاظ سے خاصہ رواں اور شستہ نثر میں کیا گیا ہے۔ بیشتر مقامات پر یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ نثر بے ساختہ اور اظہار فطری لگتا ہے۔ پھر بھی بعض مقامات پر انگریزی الفاظ یا جاپانی اصطلاحات کے لئے مترجم کو مناسب اردو الفاظ نہ مل سکے' یا خود مترجم کے لئے بعض الفاظ کا تجربہ و تصور محدود تھا' اس لئے بھی وہ ان الفاظ کا مناسب ترجمہ نہ کر سکے۔ مثلاً" معروف انگریزی لفظ سلاد (SALAD) جو' اب اردو میں بکثرت استعمال ہوتا ہے' مترجم کے عہد میں اس کا استعمال عام نہ ہونے کے باعث اس نے

اسے "کچے ساگ کا اچار" سمجھا ہے۔ غالباً اسے کچی سبزیوں کے مخصوص جاپانی "اچار" "Tsukemono" کے لئے مصنف کے اختیار کردہ انگریزی لفظ سلاد کا مناسب اردو ترجمہ سمجھا گیا۔ مغربی اقوام کی مرغوب غذا "Spaghetti" کے مماثل جاپانیوں میں "Udon" مرغوب ہے۔ یہ ہماری سوئیوں کی طرح میدہ کی قدرے موٹی لڑیاں ہوتی ہیں' جنہیں جاپانی مختلف صورتوں میں کھاتے اور شوربوں میں پیتے ہیں۔ مترجم نے انہیں "تار کا ڈھیر" تحریر کیا ہے۔ انگریزی الفاظ "Illiteracy" کے لئے لا علمی "Spirit" (مثلاً تعلیمی اسپرٹ' مذہبی اسپرٹ) کے لئے' اثر خاصہ' جوہر استعمال کئے ہیں۔ انگریزی لفظ "Institution" کے لئے انہیں کوئی موزوں و مکمل ہم معنی لفظ اردو میں نہ مل سکا' چنانچہ انہوں نے اسی انگریزی لفظ کو استعمال کرنا مناسب سمجھا اور اس موضوع پر ایک مختصر حاشیہ میں اپنی رائے دی ہے۔ بعض مقالات پر واحد سے جمع بنانے کا انداز بھی محل نظر لگتا ہے۔ جیسے عورت کے بجائے عورات' جو اس عہد میں مروج تھا' لیکن مترجم نے توپ کی جمع اتواپ اور جہاز کی جمع جہازات لکھی ہیں۔ ان امور سے قطع نظر زبان اور بیان کو مجموعی طور پر سلیس اور شگفتہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں بطور وضاحت چند نمائندہ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

"یہاں تک تو جاپانی کھانا عمدہ اور معقول ہے۔ مگر ایک شے تقسیم کرنے پر اکثر اجنبی بس کرو بس کرو کہنے لگتے ہیں۔ ایک تار کے ڈھیچر پر سفید اور پیازی لقمے دکھائی دیتے ہیں جن کے ہمراہ بہت چھوٹی سالڈ (کچے ساگ کا اچار) اور موہنی صورت چٹنی ہوتی ہے۔ یہ کچی مچھلیاں ہوتی ہیں جن کی صورت تو نہایت عمدہ اور دل فریب ہوتی ہے لیکن وہ از حد بے مزہ ہوتی ہیں۔ ان کے بعد کئی قسم کے کیک (چپاتیاں) اور چائے آتی ہے اور سب سے آخر جب تم علیحدہ ہونا چاہو تو چاول مانگ کر جتا سکتے ہو۔"

(ص: ۸-۹)

"نقاش نے ہم کو بتایا کہ پرانا سنہری لیکر نہایت قیمتی ہوتا ہے کیونکہ مناسب و کار آمد سطح حاصل کرنے کے واسطے سونے کی بہت سی مقدار حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس نے ہم کو سنہری لیکر کے چیری کے پھول اور درختوں کے عجیب و غریب نمونے دکھائے اور کہا "اس صندوق کی قیمت جو میں نے ابھی ختم کیا ہے تین سو ڈالر ہے اور یہ آٹھ ماہ سے بنتا رہا ہے۔ اگر میں اس کو اسی طریقہ سے بناتا جیسا کہ پرانا لیکر بنایا جاتا ہے تو اس کی لاگت چھ سو ڈالر ہوتی' لیکن پھر اس کا کوئی گاہک نہ ہوتا۔"

(ص ۷۷)

"صبح کے آٹھ بجنے پر چند منٹ گزرنے کے بعد یکایک نہایت خوفناک شور ہوا۔ تب ایک منٹ میں پیشتر اس کے کہ آدمی ایک چو (۴۰ گز) دوڑ سکے آدھی رات سے زیادہ تاریکی چھا گئی اور نابینا کر دینے والے گرم خاکستر اور ریگ گرنی شروع ہوئی اور شور کے ساتھ ہی ایسا ہولناک بھونچال آیا کہ ان میں سے اکثر زمین میں گر پڑے اور حیوانوں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں کے بل چلنے لگے اور زمین کی سطح میں سطح بحر کا سا تموج پیدا ہو گیا۔ دھماکہ پر دھماکہ سنائی دینے لگا۔"

(ص ۱۴۰)

(مطبوعہ۔ "قومی زبان" کراچی' مارچ ۱۹۹۴ء)

حواشی

۱۔ مطبوعہ : انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۔ ص ۲۷

۳۔ "اردو اخبار" کے بارے میں یہ مزید اطلاع ملتی ہے کہ یہ اخبار ۱۹۰۳ء میں "فیض عام پریس" لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا اور ۱۹۰۵ء میں خود اپنے مطبع "اردو اخبار پریس" سے چھپنے لگا۔ یہ ہفت روزہ تھا۔ ابتداء میں اس کی اشاعت ۷۰۰ تھی، جو ۱۹۰۵ء میں بڑھ کر دو ہزار ہو گئی۔ اس کے مالک اور طابع منشی رام اگر وال تھے، جن کا پٹیالہ سے تعلق تھا لیکن لاہور میں منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کی عمر ۳۶ برس تھی۔ "فیض عام پریس" کے مالک کا نام عمر دین تھا۔ ۱۹۰۳ء میں "اردو اخبار" کے مدیر لالہ دیا رام عاکف تھے، جن کی عمر ۱۹۰۳ء میں ۵۰ سال تھی۔ ۱۹۰۵ء میں اس کے مدیر سندرداس راجپوت ہو گئے۔ جن کی عمر اس وقت ۲۸ برس تھی۔ احمد دین کا نام اس اخبار کی ادارت میں شامل نہیں رہا۔ سرکاری رپورٹ میں اسے ایک "عام سا غیر اہم اخبار" قرار دیا گیا ہے .... بحوالہ این جی بیرئر (GBARRIER-N) اور پی ویلیس (WALLACE-P) .... "The Punjab Press" ۱۸۸۰ء۔۱۹۰۵ء (مشی گن، ۱۹۷۰ء) ص ۱۵۰

۴۔ اسی طرح کا ایک ذخیرہ جاپان میں "جامعہ اوساکا برائے مطالعات خارجی" کے مرکزی کتب خانہ اور خصوصاً" ذخیرۂ پروفیسر سو اے ایزو (متوفی ۱۹۷۸ء) .... میں بھی موجود ہے۔ ان دونوں کتابوں خانوں کے ذخیرہ گامو اور ذخیرہ سوا میں موجود مطبوعات کی فہرستیں علی الرتیب ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

۵۔ "Area And Culture Studies" (۳۴) (ٹوکیو، ۱۹۸۴ء) اس فہرست میں درج سب سے قدیم کتاب منشی محبوب عالم کی جاپان اور جاپانی" ہے، جو کارخانہ پیسہ اخبار لاہور سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔

اقبال کے دو غیر مدون خط

اقبال کے نادر و غیر مطبوعہ اور غیر مدون خطوط کی تلاش و تحقیق اور دستیابی ایک عرصہ سے اقبالیات کے متعدد نئے گوشے وا کر رہی ہے۔ پھر مکاتیب اقبال کی ترتیب و تدوین کی حالیہ کوششیں بھی عہد جدید کے تقاضوں کے مطابق اقبالیات کے معیار اور اس کے متعلقہ موضوعات کو ان کے بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت میں، قابل استعمال بنانے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔

ذیل میں اقبال کے دو غیر مدون خطوط کے اقتباس نقل کئے جا رہے ہیں، جو اقبال نے سجاد مرزا بیگ دہلوی کے نام تحریر کئے تھے۔ یہ خطوط اب مکمل تو دستیاب نہیں، لیکن ان کا نفس مضمون چونکہ شائع ہو گیا تھا، اس لئے بس یہی دستیاب مطبوعہ متن اقبال کے گمشدہ آثار کی بازیافت کے طور پر اقبالیات کے ذیل میں ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے مکتوب الیہ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں انجمن ترقی اردو کی زیر ہدایت مرتبہ اردو مطبوعات کی اولین ضخیم فہرست "الفہرست" کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

وہ ۱۸۷۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اسلاف میں اہل سیف اور اہل قلم دونوں طرح کے بزرگ شامل تھے اور ۱۸۵۷ء سے قبل قلعہ معلی سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے والد محمد مرزا بیگ نے انگریزی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد سجاد مرزا بیگ تلاش روزگار میں

دہلی سے حیدر آباد دکن منتقل ہو گئے' جہاں ۱۹۱۵ء میں "نظام کالج" میں اردو کے استاد کی حیثیت میں ان کا تقرر ہو گیا۔

اپنے اساتذہ کے زمرے میں سجاد مرزا بیگ نے حافظ اخوند محمد عمر[۲] اور نواب بشیر الدین احمد خاں[۳] کے نام تحریر کئے ہیں[۴]۔ ان کے احباب میں بھی متعدد اہم نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً" مولوی سید احمد دہلوی (مرتب "فرہنگ آصفیہ"[۵]) اور مولانا محمد علی جوہر۔ علی برادران نے جب حرمت و حفاظت حرمین شریفین کے لئے "انجمن خدام کعبہ" قائم کی تو سجاد مرزا بیگ حیدر آباد میں اس کے قیام و فروغ کے لئے کوشاں ہوئے۔ ان کی تصنیف "شمع راہ" میں' جو ان کے خطبات کا مجموعہ ہے' اولین خطبہ ان کے اسی تعلق و جذبہ کا مظہر ہے[۶]۔ اداروں میں سے وہ "نظام کالج" کے علاوہ "جامعہ عثمانیہ" اور "انجمن ترقی اردو" کے رکن رہے[۷]۔

ان کی علمی و تصنیفی خدمات کے صلے میں نظام حیدر آباد نے ۱۹۱۸ء میں انہیں دو سو روپے ماہوار وظیفہ منظور کیا[۸] پھر اپنی تصانیف "تسہیل البلاغت' الاستدلال" اور "الفہرست" چونکہ انہوں نے نظام حیدر آباد کے نام معنون کی تھیں' اس لئے نظام نے ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں انتساب کی اجازت دیتے ہوئے ان کتابوں کی اشاعت کی مد میں ڈھائی ہزار روپے عنایت کئے اور مزید پانچ سال تک دو سو روپے ماہانہ وظیفہ ان کے نام جاری کر دیا۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں اس وظیفے کو اضافے کے ساتھ تاحیات کر دیا گیا[۹]۔

ان کی کئی تصانیف اپنے موضوعات پر اردو میں نصابی کتب کی عدم موجودگی یا کمیابی کے سبب چونکہ طلبہ کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل بھی کرتی تھیں' اس لئے نصاب میں بھی شامل کی گئیں۔ مثلاً" "حکمت عملی" ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ کے نصاب کے لئے منظور کی گئی[۱۰] ان کی تصانیف میں "الفہرست' تسہیل البلاغت' استدلال' شمع راہ" اور "حکمت عملی" کے علاوہ "تمنائے دید" "الانسان" اور "شمع ہدایت" کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان تصانیف کی صراحت

موضوعات کے لحاظ سے درج ذیل ہے۔

۱۔ "تمنائے دید" — اس میں قصہ کے پیرایہ میں زندگی کے نشیب و فراز اور اخلاق و معاشرت کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اسے "مخزن ادب" (دہلی) نے شائع کیا تھا۔ ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے اپنی مرتبہ "مفصل فہرست تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ دہلوی" میں اسے پروفیسر صاحب کی اوائل عمر کی تصنیف بتایا ہے[۱]۔

۲۔ "حکمت عملی" — پہلی مرتبہ "قاسم پریس" حیدر آباد دکن سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ فلسفہ عمل، قومی ترقی اور حصول عزت کے موضوعات پر مبنی اور ایک مقدمے اور تین مقالات پر مشتمل ہے۔

۳۔ "الانسان" — یہ علم اخلاق، مذہب، معاشرت و تمدن کے فلسفہ اور انسان کے قوائے جسمانی و نفسانی اور خصوصیات و مزاج کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ "مکتبہ اختر دکن" حیدر آباد سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ "الاستدلال" — یہ علم منطق پر ہے اور اس میں اس کے مسائل و مباحث کو سلیس زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے "نظام دکن پریس" حیدر آباد نے ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء میں شائع کیا تھا۔

۵۔ "الفہرست" مولوی عبدالحق کی فرمائش پر انجمن ترقی اردو کے ایک منصوبہ کے تحت یہ ایک ضخیم کتابیات مرتب کی گئی تھی، جو مختلف موضوعات اور علوم و فنون پر اردو میں شائع ہونے والی مطبوعات کی فہرست ہے۔ یہ "نظام دکن پریس" حیدر آباد سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ "تسہیل البلاغت" حیدر آباد دکن سے ۱۳۳۹ھ /۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل "نظام کالج" میں دوران تدریس علم بلاغت کی تحصیل میں مدد دینے کے لئے دیئے جانے والے خطبات کا مجموعہ ہے، جو علم معانی، بیان، بدیع اور بلاغت کے تقریباً تمام اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

۷۔ "شمع راہ" مختلف مجالس میں مختلف موضوعات پر دیئے جانے والے خطبات کا مجموعہ ہے، جسے ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے دفتر کتابت "سجاد منزل" دہلی سے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا تھا[۲]۔

سجاد مرزا بیگ نے ۲؍ فروری ۱۹۲۷ء کو بعارضہ فالج حیدر آباد میں انتقال کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے "مفصل فہرست تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ" شائع کرتے ہوئے[۳] اس کے آخر میں اپنے والد کے مکاتیب اور مضامین بھی شائع کرنے کا اعلان کیا تھا، لیکن راقم کو ان کی اشاعت کا علم نہیں۔ یہ "مفصل فہرست تصانیف ...." جو وضاحتی ہونے کے سبب ۲۰x۲۶_۱۶ سائز کے ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے اہم ہے کہ

اس میں جہاں تصانیف کے موضوعات اور مطالب کا مفصل اندراج ہے' وہیں آغاز میں ان کی تصانیف "حکمت عملی' الانسان' تسہیل البلاغت" پر اس وقت کے اکابر علم و ادب کی آراء بطور تقاریظ جمع کی گئی ہیں۔ ان اکابر کے نام یہ ہیں۔ شبلی' حالی' مولوی ذکاء اللہ' علامہ اقبال' عزیز مرزا' ہمایوں مرزا' کپتان نواب ممتاز یار الدولہ بہادر' مولوی محمد محسن فاروقی' ڈاکٹر سید سراج الحسن' عماد الملک سید حسین بلگرامی' پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن' مولوی سید احمد دہلوی اور ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن۔

ان اکابر میں سے بالخصوص شبلی' حالی اور اقبال کی غیر مدون تحریریں ان کی مختلف النوع نگارشات کے مجموعوں یا دیگر صورتوں میں منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ شبلی نے "حکمت عملی" کے بارے میں جو رائے دی ہے[4] وہ ان کے اس طرح کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔ اور اسی طرح اقبال نے "حکمت عملی" اور "الانسان" کے بارے میں مصنف کو جو خط لکھے تھے وہ بھی ان کے ایسے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اقبال نے اپنی یہ آراء سجاد مرزا بیگ کے نام دو مختلف خطوط میں دی ہوں گی۔ ان خطوط کے تحریر کئے جانے کی تاریخوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطوط متعلقہ کتابوں کی اشاعت علی الترتیب ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۷ء میں سجاد مرزا بیگ کے انتقال تک کسی وقت لکھے گئے ہیں۔

اقبال کے ان خطوط کے اقتباس' جو مذکورہ "فہرست ...." میں اسی طرح درج ہیں' ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

(۱)

"حکمت عملی"

"میں نے آپ کی تصنیف "حکمت عملی" کو شروع سے آخر تک پڑھا'

نہایت عمدہ اور دلچسپ کتاب ہے۔ خصوصاً" عورتوں کی تعلیم کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا' نہایت مناسب اور اسلامی اصول تمدن کے عین مطابق ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ شاید اردو زبان میں اس قسم کی ایسی عمدہ اور حکمت آموز کتاب شاید کوئی نہ ہو گی[۵۱]۔

(۲)

"الانسان"

"میں نے آپ کی کتاب "الانسان" کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ میں اس کتاب کو اردو زبان کے علمی لٹریچر میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ سمجھتا ہوں۔ اس سے پہلے "حکمت عملی" لکھ کر آپ نے اردو خواں لوگوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ "الانسان" علمی اعتبار سے بہت زیادہ وقعت رکھتی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اردو زبان میں اس مضمون پر شاید کوئی کتاب موجود نہیں۔ اس اعتبار سے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا۔ اصطلاحات جو آپ نے وضع کی ہیں' نہایت عمدہ ہیں۔ طرز تحریر دلکش ہے اور دقیق مسائل کو سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی قوت جو قدرت نے آپ کو عطا کی ہے' قابل داد ہے۔ کاش اردو خواں لوگوں میں علمی مذاق پیدا ہو اور بہت سے ایسے مصنفین پیدا ہوں' جن کے دماغی مسائل (مساعی؟) سے اردو زبان کا علمی لٹریچر ایسا ہی وسیع ہو جائے' جیسے دنیا کی دیگر مہذب زبانوں کا ہے۔"[۱۲۲]

("اقبال ریویو" حیدر آباد دکن' اپریل ۱۹۹۳ء)

حواشی

۱۔ سجاد مرزا بیگ "تسہیل البلاغت" (حیدر آباد دکن، ۱۳۳۹ھ) ص ۱۰

۲۔ مولانا فریدالدین شہید فرہنگ کے فرزند۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء میں انتقال کیا۔ دہلی کی مقتدر ہستی سمجھے جاتے تھے۔ سلسلہ قادریہ سے بیعت تھے۔ ان کی ایک تصنیف "الاستشفاع و والتوسل" مشہور ہے۔ تفصیلات کے لئے امداد صابری "دہلی کی یادگار ہستیاں" (دہلی، ۱۹۷۲ء) ص ۳۳۲-۳۳۵۔

۳۔ دہلی میں تراہہ بہرام خاں میں رہتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۷ء تک حیات تھے۔ "انجمن خدام کعبہ" سے منسلک اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خاندانی ارادت مند تھے۔ "نقوش" (لاہور)، خطوط نمبر، جلد دوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۱۰-۲۱۱

۴۔ سجاد مرزا بیگ "شمع راہ" (دہلی، ۱۹۳۶ء) ص ۴۳، جنہوں نے ایک خطبہ پر، جو ذکر میلاد النبیؐ پر مبنی تھا، اصلاح بھی دی تھی۔ مشمولہ ایضاً" ۔ ص ۷۱-۱۰۵

۵۔ ایضاً" ص ۱۰۹-۱۱۳

۶۔ ایضاً" ص ۱۴-۳۵

۷۔ بحوالہ ایضاً" سرورق

۸۔ "تسہیل البلاغت" ص ۱۰

۹۔ سید منظر علی "حیدر آباد کی علمی فیاضیاں" (حیدر آباد، ۱۳۵۵ھ) ص ۱۳۹

۱۰۔ سید منظر علی "حیدر آباد کی علمی فیاضیاں" ص ۱۴۱

۱۱۔ ص ۴۹

۱۲۔ "مصنفین اردو" (مطبوعہ ۔ دہلی، ۱۹۳۹ء) کے مرتب سید زوار حسین نے ان کی ایک کتاب "شمع ہدایت" کا حوالہ دیا ہے، لیکن اس کا ذکر اور تفصیلات کہیں اور دستیاب نہیں۔

۱۳۔ مطبوعہ: سجاد منزل، دہلی، سنہ اشاعت موجود نہیں۔

۱۴۔ ص ۵

۱۵۔ ص ۹

۱۶۔ ص ۱۵

دو نوادر ـــــ بسلسلہ اقبال

(۱)

اقبال کی نظم "محنت" ان کے غیر مدون کلام میں ملتی ہے[۱] لیکن اس کا ماخذ اور زمانہ تخلیق معلوم نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے بھی اپنے مرتبہ "ابتدائی کلام اقبال"[۲] میں اسے "روزگار فقیر" اور "باقیات" کے حوالے سے اقبال کے منسوخ کلام کے ذیل میں اسی عذر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ اس کا زمانہ معلوم نہیں[۳]۔

لیکن یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس نظم کا ایک بڑا حصہ منشی محبوب عالم کے زیر ادارت شائع ہونے والے "بچوں کا اخبار" کے شمارہ اول بابت مئی ۱۹۰۲ء کے صفحہ ۳۱ پر شائع ہوا تھا۔ "روزگار فقیر" اور "باقیات" میں شامل نظم کل ۲۱ اشعار پر مشتمل ہے، جب کہ "ابتدائی کلام اقبال" میں یہ شعر درج نہیں:

جہاں میں اگر کیمیا ہے تو یہ ہے
غریبی کے دکھ کی دوا ہے تو یہ ہے

"بچوں کا اخبار" میں اس شعر سمیت اس نظم کے کل ۱۳ اشعار شائع ہوئے ہیں۔ نظم کے آغاز میں مدیر نے ایک مختصر تمہید تحریر کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ نظم اپنے بھتیجے اعجاز احمد کے لئے لکھی تھی۔ اس وقت اعجاز احمد کی عمر، جیسا کہ اعجاز احمد نے ایک مقام پر خود لکھا ہے۔ "۱۹۱۱ء میں ...... میری

عمر ۱۲ سال سے کچھ اوپر تھی"[۴] اس اعتبار سے ۱۹۰۲ء میں تین سال سے کچھ زیادہ تھی۔

"بچوں کا اخبار" میں شائع شدہ تمہید اور نظم ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

محنت

شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے میکلوڈ عربک اسکالر نے یہ چند اشعار اپنے پیارے بھتیجے اعجاز احمد کے لئے لکھے تھے اور چونکہ سب چھوٹے بچوں کو ان کے مطالعے سے یکساں فائدہ حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے بڑی خوشی سے انہیں بچوں کے اخبار میں درج کیا جاتا ہے:

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

کوئی بڑھ کے محنت سے سونا نہیں
کہ اس زر کو چوری کا کھٹکا نہیں

اسی سے ہے آباد نگری جہاں کی
یہ دنیا میں بنیاد ہے ہر مکاں کی

اسی میں ہے عزت خبردار
بڑا دکھ ہے دنیا میں بیکار

ہری کھیتیاں جو نظر آ رہی ہیں
ہمیں کام محنت کے دکھلا رہی ہیں

یہ وہ کل ہے چلتے ہیں سب کام اس سے
نکلتا ہے انسان کا نام اس سے

اسی سے زمانے میں دولت بڑھے گی

جو دولت بڑھے گی تو عزت بڑھے گی
کوئی اس کو سمجھے تو اکسیر ہے یہ
بڑا بن کے رہنے کی تدبیر ہے یہ
جہاں میں اگر کیمیا ہے تو یہ ہے
غریبی کے دکھ کی دوا ہے تو یہ ہے
حقیقت جو محنت کی پہچانتے ہیں
اسے کیمیا سے سوا جانتے ہیں
زمانے میں عزت حکومت یہی ہے
بڑی سب سے دنیا میں دولت یہی ہے
نہیں کرتے دنیا میں نادان محنت
جو سمجھے تو سونے کی ہے کان محنت
میری جان غافل نہ محنت سے رہنا
اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

(۲)

حیدر آباد دکن کے ایک ماہر تعلیم محمد عثمان بھی اقبال کے ایک مکتوب الیہ رہے ہیں۔ ان کے نام اقبال کے کم از کم ایک خط کی شہادت موجود ہے۔

محمد عثمان حیدر آباد میں تدریس اور نظامت تعلیمات سے منسلک تھے[۶] اور تدریس اور نظامت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف سے شغف رکھتے تھے۔ تصانیف میں "رہنمائے سعادت" "اخلاقیات" "اصول تعلیم" (۱۹۳۸ء) "مبادی نفسیات" (۱۹۳۵ء) اور "نفسیات تعلیمی" ان سے یادگار ہیں۔ موخر الذکر پر سن اشاعت درج نہیں' یہ دو مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کی دوسری اشاعت[۷] کے آغاز میں

چند اکابر کی آراء یکجا کی گئی ہیں' انہی آراء میں اقبال کی مختصر رائے بھی شامل ہے[۸]
اقبال کے ساتھ "ہندوستان کے مایہ ناز شاعر و ادیب" کے الفاظ تحریر کئے گئے ہیں۔ اقبال نے اپنی رائے ان الفاظ میں دی:

"کئی سال قبل اسپنسر[۹] کا اردو ترجمہ شائع ہوا تھا"۔ مجھے نہیں معلوم کہ لوگوں نے اس کتاب کو پڑھا' یا اس سے استفادہ کیا۔ لیکن مجھے کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی نفسیات تعلیم ان حضرات[*] کے تخیل کے لئے تازہ غذا بہم پہنچائے گی' جنہیں تعلیم سے دلچسپی ہے۔"

کتاب پر سنہ اشاعت موجود نہیں' لیکن خیال ہے کہ یہ مصنف کی انگلستان سے ۱۹۳۲ء میں واپسی کے بعد لکھی گئی ہو گی"۔ اس لحاظ سے اقبال نے مصنف کے نام یہ خط ۱۹۳۲ء کے بعد لکھا ہو گا۔

(اورینٹل کالج میگزین' لاہور اقبال نمبر ۱۹۸۸ء)

حواشی

۱۔ یہ "روزگار فقیر" مرتبہ فقیر سید وحید الدین' جلد دوم (کراچی' ۱۹۶۴ء) ص ۳۸۱۔۳۸۲ اور "باقیات اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد معینی اور محمد عبداللہ قریشی (لاہور' ۱۹۷۸ء) ص ۳۴۰۔۔۔۳۴۱ میں شامل ہے۔

۲۔ مطبوعہ' کراچی' ۱۹۸۸ء

۳۔ ص ۱۴۱۔۱۴۲

۴۔ "مظلوم اقبال" (کراچی' ۱۹۸۵ء) ص ۱۴۰

۵۔ مذکورہ مجموعوں میں یہ مصرعہ یوں درج ہے:

یہ کل وہ ہے چلتے ہیں سب کام اس سے

۶۔ والد کا نام محمد قاسم تھا' ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے' وہیں ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ گئے جہاں سے ۱۹۱۶ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۲۰ء میں مملکت حیدر آباد

کی سرکاری ملازمت کا آغاز کیا' جہاں سے مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہا۔ اعلیٰ تعلیم انگلستان میں لندن' آکسفورڈ اور لیڈس کی یونیورسٹیوں میں حاصل کی اور واپس آکر عثمانیہ ٹریننگ کالج میں وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔ پھر ضلع رائچور میں مہتمم تعلیمات نامزد ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں ترقی پاکر صوبہ اورنگ آباد میں صدر مہتمم تعلیمات بنے۔ سقوط حیدر آباد سے کچھ عرصہ قبل حیدر آباد کے ایک کالج میں پرنسپل تھے۔

۷۔ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس' حیدر آباد۔

۸۔ دیگر اکابر کے نام یہ ہیں۔ سر رفیع الدین احمد (وزیر تعلیمات' صوبہ بمبئی)' سر فخر الدین احمد (وزیر تعلیمات' صوبہ بہار و اڑیسہ) مسٹر محمد پکتھال (مشہور مستشرق و ایڈیٹر "اسلامک کلچر") مولوی سجاد مرزا (پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدر آباد و ایڈیٹر "المعلم") مولانا عبدالماجد دریا بادی' وغیرہ۔

۹۔ مراد معروف مفکر ہربرٹ اسپنسر (Hĕrbert Spencer) اور تعلیم کے تعلق سے اس کی تصنیف "Education : Intellectual, Physical and Moral." (۱۸۶۱ء) سے ہے' جس کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔

۱۰۔ یہ ترجمہ خواجہ غلام الحسنین نے انجمن ترقی اردو کے لئے کیا تھا اور پہلی مرتبہ مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔ انجمن کی اولین مطبوعہ تصنیف تھی۔ اس کا تیسرا ایڈیشن اورنگ آباد سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ مصنف کے حالات "مشیر عالم ڈائرکٹری" (کون کیا ہیں) مرتبہ صمصام شیرازی' مطبوعہ حیدر آباد' سن ندارد' ص ۷۲۸۔۷۲۹ میں درج ہیں۔ کتاب میں شامل آراء دینے والے دیگر اکابر میں سر رفیع الدین احمد اور سر فخر الدین احمد کی وزارتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ انہیں یہ وزارتیں علی الترتیب ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۸ء میں ملیں۔ ان دونوں اکابر کے حالات بالعموم مل جاتے ہیں۔

بابائے اردو کے دو غیر مطبوعہ خطوط

باباۓ اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے پانچ خط برٹش لائبریری لندن کے اورنٹل کلیکشن' میں نمبر شمار OR ۱۳۵۱۷ کے تحت ایک جلد میں محفوظ ہیں' جو ان ہی خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط مولوی محمد امین زبیری اور ان کے بھائی مولوی محمد حسین خاں زبیری کے نام ہیں[۱]۔

ان پانچ میں سے ابتدائی تین خط' جو مورخہ ۱۵ر جون ۱۹۳۶ء اور ۲۷ر اگست ۱۹۳۶ء اور ۲۵ر جون ۱۹۴۲ء کو لکھے گئے ہیں' محمد امین زبیری کے نام ہیں' جب کہ آخری دو خط محمد حسین خاں زبیری کے نام ہیں۔ یہ مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۵۸ء اور ۲۷ر مارچ ۱۹۵۹ء کو لکھے گئے تھے اور مطبوعہ ہیں[۲]۔

مذکورہ جلد کے ساتھ جو دیگر مجلدات اس ذخیرے میں جمع ہوئے ہیں' ان میں علی گڑھ تحریک کے زعماء و اکابر اور مشاہیر ہند سے متعلق ذاتی و قومی دستاویزات' خطوط اور ایسی ہی نادر تحریریں شامل ہیں' جنہیں دیکھ کر یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ اس سلسلے کا سارا ذخیرہ محمد امین زبیری کا جمع کردہ تھا' جو ان کی حیات ہی میں یا وفات کے بعد غالباً" ان کے لواحقین میں سے کسی کے توسط سے اس کتب خانہ کو حاصل ہوا ہے۔ محمد امین زبیری کے ایک خط' مورخہ ۲۴ر دسمبر مشمولہ "مکتوبات عبدالحق" مرتبہ جلیل قدوائی[۳] سے بھی اس قسم کے ذخیرے کے ان کی تحویل میں ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ANJUMAN-E-TARAQQI-E-URDU

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

AURANGABAD (DN)

۱۵ر جون ۱۹۳۶ء

مشفق و مکرم

میں متواتر سفر میں رہا اور یہاں آیا تو آپ کا پتا یامین صاحب کو لکھ کر پوچھنے والا تھا کہ آپ کا .... افسوس ہے کہ میں آپ کی کتاب پر تنقید نہ لکھ سکا کتاب حیدر آباد .... ضرور لکھ دوں گا۔ .... انٹرمیڈیٹ کے لئے منظور کر لیا تھا"

(۲)

ANJUMAN-E-TARAQQI-E-URDU

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

AURANGABAD (DN)

نادر منزل' سیف آباد

حیدر آباد دکن' ۲۷ر اگست ۱۹۳۶ء

مشفقی و مکرمی

آپ کا خط پہنچا .... بہت شکر گزار ہوں۔ امید ہے کہ آپ اکتوبر تک کام ختم کر لیں گے۔ آپ نے جو حالات تحریر کئے ہیں وہ بہت کچھ صحیح ہیں۔ زبان کے معاملے میں یوں (کذا) غفلت بہت برتی جا رہی ہے۔ میں نے اردو کے تحفظ و ترقی کے لئے ایک بڑی اسکیم تیار کی ہے اور اسے

آئندہ اکتوبر تک ایک نمائندہ مگر منتخب اصحاب کی کانفرنس میں پیش کرنے والا ہوں اور بہت جلد عملی طور پر اس کام کو شروع کروں گا اور غالباً" دہلی اس کا مرکز ہو گا۔

عبدالحق

(۳)

حسینی گوڑہ' حیدر آباد دکن

۲۵ر جنوری ۱۹۴۲ء

مکرم و کرم فرما من

سلام

آپ کا عنایت نامہ مجھے یہاں ملا' جس کے لئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ خیال آپ دل سے نکال دیجئے کہ میں آپ سے خفا ہوں۔ میں تو آپ صاحبوں کا خادم ہوں۔ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ آپ نے عمارت فنڈ کی رسیدیں طلب کی تھیں۔ میں دہلی واپس آنے پر آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ سے تو مجھے بہت سے کام لینے ہیں' خصوصاً" اس نئی تجویز کے متعلق جو جال میں کی گئی۔ اس بارے میں آپ سے مفصل گفتگو کروں گا۔

عبدالحق

حواشی

۱۔ قاضی محمود الحق "Hand List of Urdu and Punjabi Manuscripts,
Acquired by Oriental Collections, Since 1899."
مطبوعہ "برٹش لائبریری، لندن" ۱۹۹۳ء ص ۲۸ و بعدہ،

۲۔ مشمولہ "مکتوبات عبدالحق" مرتبہ جلیل قدوائی، کراچی ۱۹۶۳، ص ۵۵۹-۵۶۰

۳۔ ایضاً" ص ۱۸۸

۴۔ اس خط کی روشنائی اس حد تک اڑ چکی ہے کہ قریب قریب ناقابل مطالعہ ہے۔ مندرجہ بالا عبارت بھی بمشکل اس مشین سے، جو اس مقصد کے لئے استعمال ہوتی ہے، پڑھی جا سکی ہے۔

ضمیمہ:

تقریظ مصباح الہدایت

والیان لکھنؤ اور بعد کے دور میں سنگی مطبعوں کی تاریخ سے متعلق
مستند معلومات

تقریظ نگار: محمد ظہیرالدین بلگرامی
فارسی سے تلخیص و ترجمہ: سید محمد سلیم
تعلیقات: ڈاکٹر معین الدین عقیل

عرض مترجم

تصوف کی مشہور و معروف کتاب "عوارف المعارف"[۱] ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ "مصباح الہدایت"[۲] کے نام سے قدیم زمانے میں محمود بن علی الکاشانی نے کیا تھا[۳]۔ مطبع نول کشور لکھنؤ سے یہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا تھا[۴]۔ اس کے آخر میں "تقریظ المطبع" کے نام سے محمد ظہیر الدین بلگرامی[۵] نے ہندوستان میں مطبع کے ابتدائی دور کی تاریخ بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ تقریظ بہت ہی معلومات افزا ہے۔ افادہ عام کے لئے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ سہولت کے لئے ذیلی عنوانات قائم کر دیئے گئے ہیں۔

تقریظ المطبع:

مطبع اودھ اخبار[۶] کا حال دیکھا۔ مطبع کے تمام کاموں اور کتب دینی کی اشاعت میں خاص و عام کے لئے' دین و دنیا کا نفع (پیش نظر ہے) کسی طرح بھی مطبع کی کفایت یا نفع پیش نظر نہیں ہے۔ شرح کرنے' حاشیہ لکھوانے' عربی سے فارسی میں ترجمہ کرانے' فارسی سے اردو نظم یا نثر میں ترجمہ کرانے' تصحیح' تصنیف' تالیف' رموز کے حل کرنے' صحت اور مصاحف کی تحقیات میں ہزار رقم خرچ کی جاتی ہے اور انتہائی احتیاط کا اہتمام کیا جاتا ہے' اور ہدیہ اور قیمت بہت کم' اور اکثر مصاحف اہل علم کے لئے بلا قیمت کر دیئے ہیں اور جن کا ہدیہ یا قیمت وصول کرتے ہیں' ان کی قیمت کاغذ سے بھی اندازاً" کم ہوتی ہے۔ خیال کیا جائے کہ حاشیہ' ترجمہ' رسم الخط' تصحیح' نظم اور تفسیر.................. ایک ایک نسخے پر کتنا خرچ آتا ہو گا' اور قیمت کتنی ہے۔ لوگوں کا نفع عام ہے' نہ کہ مطبع کا نفع۔ یہی وجہ ہے کہ اس نیت کا ثمرہ اس مطبع کی ترقی کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کتاب پر تقریظ لکھنے کے بجائے کہ وہ مستغنی تقریظ ہے' اس مطبع کی تھوڑی سی تقریظ لکھی جائے' جو بیان واقع ہے' اظہر من الشمس ہے' آپ بیتی ہے' چشم دید ہے' بے اختیار اور بے ارادہ قلم سے ظاہر ہو رہی ہے۔

اردو طباعت کی مشکلات:

جاننا چاہئے کہ طباعت کے حروف' مفردات' پھر مرکبات و موصولات۔ سیسہ پگھلا کر ڈھالنا دانایان فرنگ کے مقتدمین نے عرصہ دراز سے ایجاد کیا ہے[۷] یہ انگریزی حروف کے لئے زیبا تر ہے۔ اس لئے کہ انگریزی حروف کی چھپائی کا رسم

خط طرز و صورت میں جدا ہے۔ یہ انگریزی عبارات کے لئے مخصوص ہے' اور کتابت قلمی کے انگریزی حروف طرز و شکل میں جدا ہیں۔ جو سیسے کے حروف میں ٹھیک طور پر نہیں ڈھلتے۔ اس طرح ایسے مطبع سربی میں فارسی خط نستعلیق کو طبع کرنا کتابت کا خون کرنا ہے۔ قلم خفی کے اکثر حروف مفردات مثل دال و ذال و راء و زاء صفحات مطبوعہ پر واضح نہیں ہوتے۔ مرکبات بھی جوڑوں کی بے ترتیبی کی وجہ سے جیسا کہ ظاہر ہے' بگڑ جاتے ہیں۔ حسن کتابت قبح میں بدل جاتا ہے' حتی کہ اس کا پڑھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے آخری زمانے میں متعارف خط فارسی نستعلیق کا مطابع سربی میں طبع کرنا موقوف ہو گیا اور نسخ' ثلث و خط عربی سے بدل لیا ہے۔ اس لئے کہ خط نستعلیق کے مقابلے میں حروف مفردات دال' راء اس خط میں زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

لیکن عبارت فارسی یا اردو عربی خط میں لکھنا خامے کی آبرو ریزی کرنا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ طلائے احمر پر الماس و یاقوت کے بجائے خزف ریزہ سے مرصع کاری کی جائے۔ پھر پڑھنے کی دشواری اس پر مزید ہے۔ یہ بھی جوڑوں کی بے ترتیبی سے خالی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں کسی مرکب لفظ میں مثلاً" لنبیتنہ میں جوڑوں کو سربی حروف سے ملایا جائے تو پہلے خواہ کاتب خوش نویس ہو یا کوئی اور' تعلیم یافتہ پریس مین کی مدد کے بغیر جوڑوں کی ترتیب نہیں دے سکتا۔ دوسرے' تعلیم یافتہ پریس مین کمیاب بلکہ نایاب ہیں' اور مطبع سربی کی مشین کے بوجھ اٹھانے اور لادنے کا بار بھی اس قدر زیادہ ہے کہ جر ثقیل برائے احمل اثقل مطبع سربی درکار۔

مطبع مرتضوی:

۱۲۳۵ھ (۱۸۲۰ء) میں بادشاہ اول تخت نشین ملک اودھ یعنی شاہ زمن غازی الدین حیدر[۸] خلد مکان انار اللہ برہانہ' نے شیخ احمد یمنی[۹] افصح العرب کو ہزار روپیہ

ماہوار مشاہرہ پر اور کاتب الحروف کے عم مولوی اوحد الدین[۱] صاحب "نفائس اللغات"[۲] اور قاضی محمد صادق خاں اختر[۳] کو پانچ پانچ سو روپیہ مشاہرہ پر، علوم علویہ و وراسیہ، لغویہ کتب تصنیف و تالیف کرنے کے لئے ملازم رکھنے کا حکم دیا۔ ان کے لئے چاہا کہ ایک مطبع بنام "مطبع مرتضوی"[۳] لکھنؤ میں قائم کیا جائے۔ جب تک مطبع سنگی زیر قلم کاپی نویسان نے ترقی نہیں کی تھی، سلطان وقت کے حکم سے کاتب الحروف سامان و آلات اور حروف سربی مملوکہ و مرتبہ شیخ احمد عرب کلکتہ سے لایا[۴]۔ سترہ ہزار روپیہ صرف راستہ کی باربرداری میں دیئے گئے۔

کتاب لغت "ہفت قلزم[۱۵]" "تاج اللغات[۱۶]" "محامد حیدریہ[۱۷]" "مناقب حیدریہ"[۱۸] وغیرہ کتب انہی حروف ثلث عربیہ سے اس کاتب کے والد[۹] کے اہتمام سے طبع ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کا حجم عربی حروف کے بڑے ہونے کے سبب بہت تھا۔ فقط ایک نسخہ "ہفت قلزم" جو سات جلدوں میں، چالیس سطری تھا، اگر ایک شتر بار نہیں تو ایک قاطر سے کم بھی نہیں۔ اس مطبع سربی (سیسہ) کی گراں باری اس قدر تھی۔

آخر ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) میں شیخ یمنی کے تعلقات بادشاہ سے خراب ہو گئے۔ نوبت مطبع کے خاتمے تک جا پہنچی۔ ایک دم زدن میں مطبع، اہل مطبع، تمام عملہ، ملازمین، پریس مین آمدہ کلکتہ، جلا وطن ہو کر کانپور پہنچے۔ کاتب الحروف کے عم[۲۰] و خال[۲۱] اور اکثر عزیزوں نے ناگزیر رفاقت شیخ عرب میں جلا وطنی اختیار کی۔ چند روز بعد حضرت شاہ زمن خلد مکان کو مطبع کے شوق نے بے اختیار کر دیا۔ شیخ عرب سے مطبع سربی خرید کرنے، تعلیم یافتہ پریس مین حاصل کرنے کی التجا کرنے کی اجازت غیرت بادشاہی نے نہ دی۔

حضرت اقدس کے حاضرباشوں میں کسی شخص نے، دشواریوں کے پیش نظر اور ایسے صاحب علم علماء کے حاضر نہ ہونے کے سبب اور تعلیم یافتہ پریس مین کی نایابی کے سبب، از سر نو تمام سامان حروف مطبع لکھنؤ شہر میں تیار کرنے کی جرات

نہیں کی اور کثیر مصارف اور طویل مہلت کی درخواست کی کہ ایسے علماء افصح العرب و العجم، اور ایسا سامان مطبع از سرنو تیار کرنا مدت دراز کی مہلت چاہتا ہے۔

نئے مطبع کا قیام:

اس کے بعد حضرت شاہ زمن کی نازک مزاجی سے اپنے اوپر لرزاں، کہ ایک حرف خلاف طبع جیسا کہ شیخ یمنی سے سرزد ہوا، باوجود تقرب خاص کے، ثریا سے تحت الثری پھینک دیتا ہے، یہاں تک کہ قرعہ فال اس دیوانہ ظلوم و جہول کے نام نکلا۔

یہ ناتجربہ کار، ظلوم و جہول ناکارہ، عنفوان شباب، ۱۹ سالہ اور مرض جنوں زدہ جس کی حکایات ابھی تک زبان زد عام ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ پانچ ہزار روپیہ کے صرف سے ایک ماہ کے اندر مطبع کا سامان پہلے سے بہتر، اور فضلائے زبان دان اور تعلیم یافتہ پریس مین کو انشاء اللہ تعالیٰ مہیا کر سکتا ہوں۔ مجلس میں حاضر لوگ اس مجنوں کی بیہودہ رائے پر ہنسے اور طعن کیا۔ دوست غمگین ہوئے۔ درستی کی خاطر التواء اہمال اور عدم اجرائے امر محال پر گفتگو کی۔ لیکن کام نہیں بنا۔ فوراً" بادشاہ کے حکم سے پانچ ہزار نقد اس فضول گو کے سامنے رکھ دیئے گئے اور تعلیم کے لئے وعدہ کے مطابق عجلت کی۔ اس موقع پر صرف اس بات کے ذکر کرنے سے کہ ایک مناسب مکان مطبع اور سامان مطبع کے لئے دیا جائے، اس سے بھی کوئی مہلت نہ ملی۔ فوراً" کوٹھی خاص[۲۲] جو کوٹھی خمرار کے نام سے مشہور تھی، اس کام کے لئے مخصوص کر دی گئی۔

چونکہ تمام کارخانوں پر پورا اختیار دفتر وزارت کے سیکرتی (کذا) کے ذریعے پہلے ہی حاصل تھا۔ اللہ کی عنایت سے، مدت موعود سے کم عرصے میں، تمام سامان جیسا کہ چاہئے سابق سے بہتر مہیا ہو گیا۔ علماء کے سلسلے میں عم و خال جو ابھی تک کانپور میں تھے مع تعلیم یافتہ پریس مینوں کے، دو تین روز میں لکھنؤ پہنچ گئے، اور

تین علماء نامی گرامی مثل مولوی فضل امام صاحب[۲۳] مولوی جعفر علی صاحب[۲۴] مولوی محمد اسماعیل صاحب[۲۵] جن کے علوم کی تفصیل کے لئے دفتر چاہئیں' وہ دو سو روپیہ مشاہرہ پر خوشی سے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ناکامی کا گمان کر کے سلطان وقت کو وعدے کی مدت ایک ماہ ختم ہونے پر یاد دہانی کی' تو چونکہ مطبع بارگاہ خاص کے قریب تر تھا' اس لئے وہ خراماں خراماں تشریف لے آئے۔ یہاں عنایت الٰہی سے تمام سامان مہیا تھا' پریس مین اور عملہ بروقت حاضر تھا۔ ارشاد ہوا کہ اس وقت کوئی عبارت نثر یا نظم مابدولت کے روبرو طبع ہو۔ تجویز عبارت کے لئے حاضرین میں سے ہر شخص نے مشورہ دیا کہ فی البدیہہ اس مجنون کی زبان پر یہ اشعار آ گئے۔

باد اے شہ عصر طبع طباع تو شاد
در طبع چہ خوش طبع نمودی ایجاد
مطبوع زمانہ است ای طبع جدید
اے بر طبع پاک تو صد رحمت باد

جب تک کہ میں ان چار مصرعوں کو کتابت میں لاؤں فوراً" کہنہ مشق پریس مینوں نے آناً" فاناً" ان کو طبع کر دیا اور حضرت اعلیٰ و اقدس کے حضور میں پیش کر دیا۔ اعلیٰ حضرت نہایت خوش اور راضی ہوئے اور زبان مبارک سے استحسان اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا' حاسد اور عیب جو اپنی عادت سے باز نہیں آئے۔ کہنے لگے کہ یہ رباعی پہلے سے کسی اہل زبان شاعر سے تصنیف کرا کے حافظے میں یاد رکھی تھی۔ ہم کیسے یقین کریں کہ یہ فی البدیہہ کہی گئی ہے۔ حضرت اقدس نے فراست سے جان لیا اور کہا کہ یہ حاسد لوگ نیش زنی سے باز نہیں آئیں گے اور ان حاسدوں کے حسد کے باوجود اس محسود پر نوازش فرمائی۔ وہی پانچ ہزار روپیہ جو روز اول مطبع کی تیاری کے لئے مرحمت ہوئے تھے' اب ماہوار اجراء ہونے لگے۔ علماء اور عملے کے مشاہرے بھی اجراء ہوئے۔ سارا کام اس نالائق کے سپرد کر دیا گیا۔

اس حال میں یہ مصرعہ کسی قدیم استاد کا مناسب ہال پا کر ذہن میں آگیا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

جیسے ہی یہ آہستہ سے میری زبان سے ادا ہوا' حضرت اقدس کے کانوں تک پہنچا۔ حاضرین کو تضمین کا اور کمترین کو طباعت کا حکم ملا۔ حاضرین میں سے ایک نے اس کاتب کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت نے فرمایا چونکہ اس نے کسی زبان داں شاعر سے التجا نہیں کی ہے' یہ کیسے فی البدیہہ کہہ سکتا ہے۔ غرض کہ حاضرین ابھی قافیہ اور ردیف کی فکر میں تھے' کہ کاتب الحروف نے چار مصرعے پریس مینوں کو دیئے جو قریب کھڑے تھے۔ انہوں نے طبع کر کے پیش کر دیئے:

نظیر کعبہ شود دیر گر خدا خواہد
شکستہ پا بکند سیر گر خدا خواہد
بدون پر بپرد طیر گر خدا خواہد
بہ از یگانہ شود غیر، گر خدا خواہد
عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اس پر مزید ایک مصرعہ بے اختیار زبان پر آگیا:

حسود شد سبب خیر از مراحم شاہ

الغرض بادشاہ کا غیر معمولی شغف ترویج و تدوین و تالیفات و تصنیفات و اشاعت کتب علمیہ اس حد تک تھا کہ یک روزہ صحبت کا حال جو خود مجھ پر گزرا تھا وہ درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر عہد میں سلاطین اودھ کا شغف یوماً" فیوماً" مطبع اور طباعت کتب کی ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔

مطبع سنگی:

یہاں تک کہ مطبع سنگی کے آفتاب نے مطلع رنگیں سے طلوع کیا اور مطبع

سربی پر خاک ڈالی۔ اس وجہ سے کہ خوشنویس کاپی نویس کی روز بروز قدر دانی بڑھ رہی ہے' کاتب الحروف نے بھی اول منشی عبدالحق[۲۶] کو جو خط نستعلیق اور ثلث میں میر عماد[۲۷] اور یاقوت[۲۸] کے ہم مرتبہ تھے اپنے مطبع میں مقرر کیا اور اپنے ماموں زاد بھائی کو جس کا نام تاریخی ظہور حسن[۲۹] تجویز کردہ کاتب ہے' مولوی محمد یحیٰ[۳۰] اور مولوی محمد اکرم[۳۱] کے پاس مشق کتابت کے لئے دے دیا۔ یہ مطابع سنگین خوبی' صفائی اور خوشخطی کے باوجود مطبع سربی سے زیادہ مصارف یا بار بوجھ نہیں رکھتے ہیں' نہ تعلیم یافتہ پریس مینوں کے محتاج ہیں۔ اس وجہ سے روز بروز ارزاں و بے قدر ، بازاری ہو گئے ہیں کہ : چو خر مہرہ بازار ہا پر شدند۔

مطبع کے نقصانات :

غایت ارزانی سے ایک بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ سینکڑوں مطابع مٹ گئے اور مطابع کے بانیوں نے نقصانات برداشت کئے۔ مطابع کی کثرت ہو گئی۔ اصل سرمایہ بضاعت کو نفع کی تمنا میں لگا دیا۔ اب نان شبینہ کے محتاج ہو گئے :

بیچارہ خر آرزوے دم کرد
نایافتہ دم دو گوش گم کرد

صورت منافع کثیر کم بضاعت ناکارہ لوگوں کی آبلہ فریبی ظاہر ہے' کہ ایک کاپی کے ہزاروں صفحات' تھوڑی مدت میں مہیا ہو جاتے ہیں۔ جب اس بات کو کم بضاعت بے وقوفوں نے دیکھا' انجام کار پر نظر نہ کی۔ نفع کی طلب میں اصل مال قلیل بضاعت ، بھی برباد کر دیا۔ اس نقصان کی اصل بنا ناکارہ لوگوں کے لئے یہ ہے کہ جو شے صرف کرنے سے اصلی حالت پر باقی نہیں رہتی ہے' اس کا شاہد تمام زمانہ ہے۔ وہ سب کو درکار ہے مثل اقسام ماکولات' ملبوسات۔ ایسی تجارت میں فائدہ بالفعل ہے۔ ابلہ فریبی مثل مطبع سنگین نہیں ہے کہ ایک نسخے سے ہزار ہا رقم

قلیل عرصے میں مہیا ہو مگر نقصان کم تر۔ اور ثبات و ترقی و افزونی بیشتر صرف میں آتی ہے اور عام بندگان خدا کو درکار ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے کہ ایک نسخہ سالہائے دراز تک باقی رہتا ہے اور دیکھنے اور مطالعہ کرنے کے لئے عام بندگان خدا کے لئے مدتوں کفایت کرتا ہے اور خرچ اس پر بس یہی مطالعہ عینی اور آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اس صرف سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی کہ یہ خوردنی یا پوشیدنی نہیں ہے۔

پس اگر ایک کتاب کے' مطبع سنگین کی بدولت ہزارہا نسخے بن گئے۔ سوائے اس کے کہ خرمہرہ کی طرح بازار اس سے پر ہو گئے' اس میں فائدۂ تجارت کہاں۔ اس لئے کہ جس قدر نسخوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر قیمت میں کمی آتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ خرمہرہ (کوڑیاں) تو بہرکیف استعمال میں آتی ہیں اور کام میں آتی ہیں اور نسخہ کتاب جب ایک مرتبہ مطالعہ کر لیا وہ بیکار ہو گیا اور مطالعہ کرنے سے اس میں کمی نہیں آتی۔ وہ بدستور موجود رہتا ہے۔ اس لئے اس شے کی تجارت اگرچہ وہ بڑھ کر ہزار ہو گئی ہے۔ مگر چونکہ خرچ نہیں ہوتی جس قدر زیادہ نسخے ہوتے ہیں' ان کی حفاظت اور احتیاط اہل مطبع کے لئے درد سر بن گئی اور یہ تمام نقصانات سے زیادہ ہے۔ طمع' منافع کی زیادتی' عجلت پر نظر اور کثیر تعداد میں نسخے فراہم کرنے نے اس امر پر آمادہ کر دیا کہ تصحیح' مقابلہ' معائنہ کاپی' پروف پر توجہ خاطر اور صرف کثیر بے دریغ کیا اور مصنف کا وبال تمام نقصانات پر غالب رہا۔ سینکڑوں مطابع تیار ہو گئے' اور ان کے بانی اپنی قلیل متاع کو اپنی حماقت کی نذر کر گئے۔ محتاج ہو گئے۔ پھر نسخہ کتابوں کا بار' کرایہ مکان' سیلاب' آتش' دیمک مزید' یہی وجہ ہے کہ اکثر مطابع نے بعض تازہ' مفید عام اور مقبول عام نسخوں کی اشاعت سے کچھ عرصہ ترقی کی پھر اس بلائے مرض مزمن میں مبتلا ہو گئے اور تباہ ہو گئے۔

یہاں تک کہ سرکار دولت مندان' صاحب ریاست' پہلے بلند حوصلگی' اور

کسی کتاب کے اشتیاق سے خواہ اپنی تصنیف ہو خواہ روزنامچہ' خواہ سوانح عمری اپنی ہو' اگر ولولہ اشتیاق سے پورے اہتمام کے ساتھ اور صرف کثیر کے بعد مطبع قائم ہو گیا۔ لیکن جب مطبوعہ کتب سے ذخیرہ لبریز ہو گیا' تو سارا مطبع اور تمام مطبع کا عملہ معطل اور بیکار ہو گیا۔ بلکہ بار سر ہو گیا۔ اور بیکار کتب کا ہجوم مزید بار۔ اس وجہ سے کہ یہ کارخانہ اول چند روز زور شور سے ترقی پھر روز بروز مائل بہ تنزل۔ پھر ان میں بہت کم فراغ دیکھا گیا۔

اب اس کے خلاف اصل کلام پر آتا ہوں۔ ایسے کارخانے سریع الزوال جو عقلی اور بدیہی دلائل سے روز بروز رو بہ تنزل ہیں مثلاً" مشہور شاہی کارخانے آغاز میں بہت شور و غل کے باوجود اور مصارف خطیرہ کے باوجود جس کا ذکر اوپر ہوا ہے' ان کا نام و نشان چند روز میں باقی نہ رہا۔ سلطنت اودھ کے دور میں' باوجود سلاطین اودھ کے قلبی لگاؤ کے' سوائے کوئی کتاب فرمائش سرکار طبع ہوئی یا مصاحف وقف طبع ہوئے' کمتر جاری دیکھا گیا۔ قدماء کی مشہور کتب احادیث' تفاسیر' شریعت' تواریخ و دینیات' درس حکمت' طب و لغت وغیرہ جو عوام کے لئے مفید اور کار آمد ہیں' کبھی طبع نہیں ہوئیں۔ بس اہل مطبع کی تنخواہ کا خرچ جاری تھا' لیکن طباعت کا کام کم تر۔ تمام اہل مطبع بیکار محض۔ سرکار کے حکم کے منتظر امتیازیوں کے زمرے میں شامل' مجرا گاہ سلطانی میں حاضر ہوتے تھے۔ جب اتنے بڑے شاہی کارخانے کا یہ حال ہوا تو دوسرے کم بضاعت اور ناکارہ لوگوں کا کیا حال ہو گا۔ یہ حال تمام مطابع سنگین کا ہوا' خط کی تمام خوبی اور آسانی کے باوجود۔

مطبع نو لکشور:

ان کے مقابلے میں روز افزوں ترقی اور خاص و عام دور و نزدیک کو افادۂ فیض' مطبع اعظم اودھ اخبار (نو لکشور پریس) انصاف کی نظر سے دیکھنے کے قابل ہے' کہ تمام خاص و عام مطبعوں کے مقابلے میں کیا مرتبہ رکھتا ہے' اور کیا فیض

عام جاری ہے' روز بروز ترقی ہے اور اس مطبع کا یہ فیض عام صرف اس ایک شہر لکھنؤ تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس درخت فیض کی جڑ ضرور لکھنؤ میں ہے۔ لیکن اس کی شاخیں طوبیٰ کی شاخوں کی طرح اکثر دیار و امصار میں پہنچ چکی ہیں[۳۲]۔ ایک دنیا کو فیض یاب کرتی ہیں اور اس کے پھلوں سے' کیا کہوں' کوئی فرد خواہ مبتدی ہو یا منتہی' بے بہرہ نہ رہا ہو گا۔

یکساں ہمہ جاست تاب خورشید منیر

انصاف درکار ہے کہ ابتدائے ایجاد اور رواج مطبع سنگیں سے لے کر آج تک کسی مطبع میں اتنی ترقی اور فروغ نہ دیکھا نہ سنا ہے جو عقلمند کے لئے حیرت اور مطبع کے رشک کا مقام ہے اور رشک و حسد کیوں نہ ہو کہ عام اہل مطبع کو ہر حال میں ترقی آمدنی' کفایت و تخفیف مصارف پر نظر ہوتی ہے نہ افادہ خلایق اور اشاعت علوم پر یہی وجہ ہے کہ اکثر مہملات عامیانہ بازاری مثل "موش نامہ" و "گربہ نامہ" و "اچار موشاں"[۳۳] "اندر سبھا"[۳۴] وغیرہ بار بار طبع کرتے ہیں۔ تاکہ بچے اور عام بازاری خرید کریں' اور مدارس اور کالج والے اس قسم کی مہملات کو اپنے مدرسے میں آنے کی اجازت نہیں دیتے' اور اگر دل مضبوط کر کے' کوئی مشہور یا بڑی کتاب دین کی طبع کی' خواہ مصحف عزیز کی جانب توجہ کی' اس میں بھی نفع قیمت پر تخفیف و کفایت مصارف مطبع مقدم ہوتے ہیں نہ کہ خلائق کا نفع یا آخرت کا ثواب۔

اس صورت میں مصارف کا بوجھ برداشت کرنے' علمائے فاضل فراہم کرنے' اور مصحح و حفاظ کامل حاصل کرنے کے لئے اگر زر بھی کھیسے میں ہو مگر دل کہاں سے لائیں۔ اسی وجہ سے ہزاروں مصاحف اتنے غلطی و تحریف و تصحیف و سہو کتابت سے شائع ہوئے' اور دور دراز مقلمات عرب و عجم میں شائع ہوئے کہ حکام اسلام' بلاد عرب و سلاطین مصر و بغداد و قسطنطنیہ وغیرہ نے عام منادی اور سخت تاکید کر دی کہ ہرگز ہرگز بلاد عجم کے مطبوعہ کے مصاحف کوئی

ہدیہ میں نہ لے، نہ تلاوت کرے نہ کوئی تاجر ہدیہ میں لائے۔ بہت سے لوگوں نے نادانستہ ہدیہ میں لے لئے تھے، وہ سب ضبط سرکار اور ممنوع تلاوت قرار پائے، اس لئے وہ مطابع والے جو قلیل البضاعت اور کم ہمت تھے جو نظر، منافع پر اور مصارف مطبع کی کفایت پر رکھتے تھے، سوائے حسرت و نقصان اٹھانے کے اور خاموشی کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلام کی خدمت کے نام کے ساتھ اس کار خیر میں نیت محض نفع اور کفایت پر تھی نہ کہ اخروی ثواب پر اور اس عالم بذات الصدور (دلوں کا بھید جاننے والے) کی نظر ہر حال میں دلوں کی نیت پر رہتی ہے نہ کہ عبادت ریائی پر۔ پس اس کا نتیجہ دنیا میں یہ کہ طباعت سے ضرر و حسرت اٹھائی اور سینکڑوں مطبع تباہ ہو گئے اور اتنی ساری مطبوعہ کتب کا ذخیرہ بلائے جان بن گیا اور آخرت کا معاملہ بھی ظاہر و واضح ہے۔

اب اصل کلام کی طرف آتا ہوں، کہ پست ہمت، قلیل بضاعت، جو اسلام کا نام رکھتے ہیں اور اسلامی دینیات کے معاملات میں ایسا حال رکھتے ہیں کہ نگاہ منافع دنیوی اور کفایت مصارف مطبع پر ہوتی ہے، نہ کہ انجام کار پر اور مواخذہ اخروی پر۔ پس ایسے مطبعوں میں خیر و برکت، روز افزوں ترقی ثبات و بقا اور ثواب اخروی کی کیسے امید کی جا سکتی ہے:

جو کاشتہ ام، امید گندم دارم
این ہم چہ حماقت و چہ بیجا طلب است

اب اس حال کے مقابلے میں اس مطبع کو اپنی آنکھ سے ایسا پایا۔ بڑے معرکے مصارف عظیم سے اور کوشش بلیغ سے سر کئے اور وہ احکام حکام عرب و بلاد عرب کے یعنی ہدیہ و تلاوت مصاحف، مطبوعہ بلاد عجم ممنوع تھیں، اس کو منسوخ کرایا۔ ہزاروں مصاحف قلم خفی و جلی اور اوسط طبع کرا کے وہاں بھیجے۔ اہل عرب کے شبہات غلطی اس مطبع کی صحت مصاحف نے رفع کر دیئے۔ ان کو وقف عام اور ہدیہ کر دیا کہ حجاج کعبہ زوار مدینہ ان مصاحف کی قدر و منزلت و اعزاز اور صفات

صحت اہل عرب کی زبانوں سے سنی اور دیکھی۔ کاتب الحروف کو مسلسل پسندیدگی کی اطلاع ملی ہے کہ اکثر مصاحف میں تصحیح اور تقریظ اول و آخر چند اوراق اس کے (راقم کے) قلم اور مہر سے لکھے گئے ہیں۔ مضامین واقعی چشم دیدہ قلم بند کئے گئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی طول چاہتی ہے۔ جا بجا تقریظوں میں اکثر مصاحف میں بقدر ضرورت مقالات اور خاص طور پر کتاب "ترغیب الفرقان"[۳۵] میں جو ناظرین کے لئے اور قارئین کی رغبت کے پیش نظر دو مرتبہ طبع ہو چکی ہے[۳۶]۔ اس نامہ سیاہ کے قلم سے لکھے جا چکے ہیں۔ اور وقف عام کر دیئے ہیں۔ وہاں دیکھنا چاہئے۔

پس تھوڑا انصاف چاہئے کہ ایسا نمایاں کارنامہ' مصارف فراواں اور بلند ہمتی اور حمیت اسلام کسی مطبع اہل اسلام میں۔۔۔ جن کے مطبوعہ قرآن مجید ممنوع خرید قرار دیئے گئے تھے' دیکھی نہ گئی۔ بعض اصحاب نے انصاف کا خون بہایا ہے' تعصب مذہبی کے مقام پر آ کر' مصاحف کی تقریظ لکھنے والے اس کاتب کو الزام دیا ہے کہ تقریظ اور مدیح ایسے مطبع کی جس کا کارفرما اہل اسلام سے نہ ہو' اس شد و مد کے ساتھ تحریر کرتا ہے اور اپنے ابنائے جنس کے مطابع کے مصاحف کی تقریظ جو اہل اسلام سے ہیں' توجہ نہیں کرتا۔ اس کے جواب میں بس یہی ایک سخن کافی سمجھا گیا:

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

غضب ہے کہ ہم ابنائے جنس اہل اسلام کو طمع نفع خود' اور کفایت مصارف مطبع کی بنا پر' صحت مصاحف اور مواخذہ اخروی پر نظر نہ ہو' یہاں تک کہ نوبت امتناع ہدیہ بلاد عرب میں پہنچ جائے۔ اس کے مقابلے میں غیر اسلام کی اس ہمت و حمیت کا اندازہ لگایئے کہ قریب پچاس ہزار نسخے مصاحف نو اقسام اقلام خفی و جلی و اوسط و حمائل با ترجمہ حامل متن از شاہ عبدالقادر[۳۷] رحمتہ اللہ علیہ و مولانا رفیع الدین[۳۸] رحمتہ اللہ علیہ و بلا ترجمہ و بہ تحشی رسم الخط و فوائد آں' طبع

کرائے۔ اور عام بلاد عرب میں اتنے ارزاں کرائے کہ کہ حکم امتناع منسوخ کر دیا گیا اور پسندیدگی کی خبر حجاج و زوار سے متواتر سنتے ہیں اور جو کچھ احتیاط و پاس آداب مصاحف اس مطبع میں دیکھا گیا ہے کتابت قلمی میں کم تر شنید کیا گیا ہو گا۔ کاپی نویس مسلمان حافظ الصلوۃ' باوضو مصلے پر بیٹھ کر رو بقبلہ لکھتے ہیں۔ پریس میں بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ مصححین کاملین' حفظ مراتب اور خدمت گزاری ان کی کیا بیان کی جائے کہ ابھی تک کوئی کلام مجید ایسی تصحیح کے ساتھ طبع نہیں ہوا ہے۔ اصل مصحح ذریت مولوی محبوب علی شہید مرحوم یعنی مولوی محمد مخدوم مرحوم[۳۹] اب دنیا میں باقی نہیں ہیں مگر تنخواہ مصحح مغفور کے بیٹوں کو ابھی تک مطبع سے بے شرط خدمت جاری ہے۔

تقریظ نویسی:

اور صاحب مطبع کی احتیاط اس سلسلے میں اس حد تک دیکھی گئی ہے کہ ایک کامل استعداد عالم جو تصحیح مصاحف و کتب فقہ و احادیث میں کافی ذوق رکھتے تھے' مقدار قلیل پر راضی ہو گئے۔ مطبع لکھنؤ اور کانپور تصحیح و تدقیق جیسی کہ چاہئے حاصل کرنے کے لئے' دخل و اختیار رکھتے تھے۔ وہ بزرگ بے گناہ اچانک مطبع سے موقوف ہو گئے۔ دوسرا جو اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا' زیادہ مشاہرہ پر اس کی جگہ مامور ہوا۔ جب بے وجہ موقوفی کا سبب دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس بزرگ کے تقویٰ اور طہارت میں فتور آگیا تھا اور ان کا شمار بل انتم قوم مسرفون میں ہو گیا تھا تو مطبع نے کفایت کے پیش نظر موقوف نہیں کیا بلکہ شبہہ تقویٰ اور آداب تصحیح مصاحف کے منافی محسوس کر کے ملازمت موقوف کر دی۔ اس مضمون کی تقریظ اس مصحف کے ساتھ راقم نے لکھ دی ہے۔

یہ حال احتیاط اور حفظ آداب مصاحف اور مصارف کثیر اس کام میں خوشدلی اور کشادہ قلبی کے ساتھ دیکھ کر' قلم کسی کی درخواست کے بغیر تقریظ

مصاحف پر اٹھایا گیا۔ آج اشاعت، ترویج، توضیح، تشریح، ترجمہ، تالیفات، تحشی، تصحیح، تصریح کتب مبسوط، معتبرۂ قدیمہ، عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو مثل کتب احادیث "صحاح ستہ"[۴۰] و "قسطلانی"[۴۱] و "بحر مواج"[۴۲] و "احیاء العلوم"[۴۳] و "ہدایہ مع ترجمہ و شرح فارسی"[۴۴] و "وفتاویٰ عالمگیری"[۴۵] و "کنز المسائل"[۴۶] و "مدارج النبوت"[۴۷] و "جذب القلوب"[۴۸] و "تفسیر حسینی"[۴۹] و "مشارق الانوار"[۵۰] و "شرح و قایہ فارسی"[۵۱] و "حج الحج"[۵۲] و "تفسیر بیضاوی"[۵۳] و "صحیح مسلم مع شرح نووی"[۵۴] و "صحیح بخاری مع شرح قسطلانی"[۵۵] "دس جلدوں میں طبع ہوئی ہیں[۵۶] اور "مطارق الانوار مع ترجمہ"[۵۷] و "فتوح الشام" و "فتوح المصر" و "فتوح العجم" و "مغازی"[۵۸] و اقدی" رحمتہ اللہ علیہ و "جامع الرموز"[۵۹] "مفصل چار جلدوں میں"[۶۰] و "خلاصہ ا لکشاف"[۶۱] "کہ کلام اللہ کے تمام الفاظ کے اعراب کی تصحیح پر ہے۔ "تفسیر کشاف"[۶۲] و "فتاویٰ کنزالدقائق"[۶۳] و "مجمع بحارالانوار[۶۴] و "ترجمہ کنزالدقائق اردو"[۶۵] و "ترجمہ مدارج النبوت اردو"[۶۶] "عینی شرح ہدایہ"[۶۷] "شرح فتح القدیر مع تکملہ ہدایہ"[۶۸] علی ہذا۔

صرف "فہرست مبسوط دینیات اسلام"[۶۹] جو اجمالی نظر سے دیکھی گئی ہے سات ورق تک صرف اسمائے کتب دینیات لکھے گئے ہیں اور دو سو ستر ان کو شمار کیا گیا ہے۔ وقت کم تھا ورنہ چند کتابوں کے نام نمونے کے طور پر درج کرتا اور بھی ہیں کتب درس وفقہ و تصوف و لغت و تواریخ اسلام کی کہاں تک شرح بیان کی جائے۔ مثلاً یہی کتاب "روضتہ الصفا"[۷۰] جو مشہور ضخیم تاریخ ہے سات جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ یہ سابق زمانے میں مطبع بمبئی[۷۱] میں چھپی تھی۔ یہاں لکھنؤ میں بہ زمانہ حضرت قبلہ عالم و عالمیان جان عالم[۷۲] قدس اللہ سرہ' ساٹھ روپیہ فی نسخہ بصد منت خرید کی گئی تھی۔ اب ایسی ضخیم کتاب ایک جلد اوراق کلاں خط واضح خوشخط میں لکھوا کر اور ارزاں قیمت دس روپیہ پر عام کر دی ہے۔ اس طرح عربی کی بڑی بڑی کتابیں مذکور شدہ' عربی سے فارسی ترجمے میں' حاشیہ متن' مطلب

خیز لائی گئی ہیں۔ کتنے بڑے مصارف ہوئے ہوں گے۔ پھر ان کو ارزاں قیمت پر فروخت کیا۔ سینکڑوں مصاحف بلا قیمت عام کر دیئے ہیں۔ انصاف درکار ہے کہ اس جگہ نظر مطبع کے منافع پر ہے کہ منافع دنیوی و دینی خاص و عام پر ہے۔ بس ایسے مطبع نافع عام کو کیوں نہ روز افزوں ترقی ہو گی۔ نفع عام اس کتاب "روضتہ الصفا" سے ظاہر ہے۔ اس کا حجم مشہور ہے۔ کہاں ساٹھ روپے کہاں دس روپے۔ اسی پر اوروں کو قیاس کرو۔ یعنی دوسری اسلامی کتب مذکورۂ بالا۔ خاص طور پر تصحیح مصاحف ترجمہ شرح تحشی و تفسیر عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو اور اردو سے نظم میں لانا جس کا نمونہ "تفسیر زاد الاخرہ اردو"[۴۳] ہے۔ اور نمونہ نثر ترجمہ اردو "کیمیائے سعادت"[۴۴] "بنام اکسیر ہدایت"[۴۵] و ترجمہ اردو "مدارج النبوت" بنام "مناہج النبوت"[۴۶] ہے۔ اور ایسے بڑے کاموں کے لئے بزرگ علماء اور نادر فضلاء حفاظ و قراء مسلم الثبوت دور دراز علاقوں سے بڑی تلاش و جستجو کے بعد فراہم کئے ہیں۔ ایسے بڑے کاموں میں جن کے لئے مدت درکار ہے۔ مثلاً ترجمہ تفسیر، تشریح و تنظیم و تصحیح۔ ان پر مامور و ملازم رکھنا، غور کیا جا سکتا ہے کتنے مصارف، مشقت اور وقت درکار ہوتا ہے۔ ایک شاہنامے کو فردوسی نے ۳۰ سال میں نظم کیا تھا اس کی مقررہ اجرت محمود جیسے سلطان سے ادا نہ ہو سکی تھی اور فردوسی کو خوش نہ کر سکا پھر اس کی ہجو محمود معروف ہے۔ یہاں ایسے حفاظ مصحح اور ایسے علمائے مترجم و فضلائے شارح و شعرائے ناظم کہ ان کے کمالات انہماک اور استحضار ان کے کلمات سے ظاہر ہے۔ ایسے قحط العلم کے زمانے میں فراہم کرنا اور پھر ان سے ایسے بزرگ کام کرانا اور ان سب کو ایسے راضی و شاکر رکھنا کہ کوئی فردوسی کی طرح ناراض و شاکی نہیں ہے۔ خود یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ کتنے مصارف، کتنی کوششیں اور کتنی خدمت گزاری کی گئی ہے۔ اور مطبع کے معینہ مصارف کاغذ، روشنائی و خوش نویسان برق نگار، اس پر مزید ہے۔ طرفہ تر یہ ہے کہ اکثر شعراء، مورخ، مصححین مصاحف، کاتبان خاص قلم متعلقہ کام کی تکمیل اور فراغ کے بعد بھی

معین مشاہرہ اور پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ان مصارف اور مجاہدات کا ذکر کہاں تک ہو۔ مثلاً" ایک کلام اللہ قلم جلی تکمیل پذیر ہوا۔ اس ایک نسخے پر خرچ اندازا" کتنا ہوا میزان انصاف سے تولو' اور پھر مقدار معینہ ہدیہ مطبع کو دیکھو کہ پانچ روپے سے زیادہ نہیں۔ یہ تو صرف کاغذ کی قیمت کر بھی کفایت نہیں کرتا۔ یقیناً" انصاف درکار ہے۔ یہاں نظر نفع و کفایت مطبع پر ہے یا عام و خاص کے لئے نفع داری پر؟

اگر ہم مسلمانوں کے زمرے میں کچھ لوگ اپنے دین کی تائید اور تقویت کے لئے اس نوع کے اہتمامات' اخراجات اور کوششیں کرتے تو یہ کوئی بڑا کام خیر کا نہ ہوتا' چونکہ اپنے دین کی ترقی و تقویت ہر شخص کو پسند ہوتی ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ایک غیر مسلم ایسی تائید و ترقی اور تقویت اسلام مال اور مجاہدے سے کر رہا ہے جو اہل اسلام کے لئے رشک کا موجب ہے۔ اس لئے ہم سب اہل اسلام کو اس اسلام کے ترقی خواہ کا مداح اور شکر گذار ہونا چاہئے یا یہ کہ مقام رشک و حسد میں آکر شاکی اور بدگو بنیں اور اس کا نام حمیت اسلام رکھیں۔ شان اسلام تو یہ ہے کہ اپنے عیب پیش نظر رکھیں اور دوسرے کے عیب کو ہنر کی نگاہ سے دیکھیں اس لئے کہ اذا مروا باللغو مروا کراما قرآن میں آیا ہے۔ یہ کیا کہ دوسرے کے ہنر کو عیب دیکھیں اور اس پر تہمت باندھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ عالم بذات الصدور و قلوب و نیات قلوب خوب دیکھتا ہے۔ نہ صرف زبانی اسلام خود اس کو معلوم ہے کہ ساحران فرعون کو کفر و سحر کی شدت کے باوجود اور ایک قلبی نیت کے باوجود کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور بلعم باعور کو تمام عبادات و ریاضت کے باوجود ایک قلب کے خطرے کی وجہ سے کہ خود کو دوسروں سے افضل سمجھتا تھا' کہاں سے کہاں گرا دیا۔ پس کس طرح کہ میں خود نیک نہ ہوں اور دوسرے نیکوتر شخص کو اپنے سے کمتر سمجھوں۔ اس کا نتیجہ دنیا میں یہی نظر آتا ہے کہ اکثر مطالع رشک و حسد و خود بینی خویش و بد بینی دیگر اور نیت نفع خود' اخروی ثواب پر غالب

رکھنے کی وجہ سے تباہ ہو گئے اور یہ مطبع حسن نیت کی برکت سے اس نے ان برہم شدہ مطابع کے ذخیرۂ کتب خرید کر لئے۔ ان مطابع کی غیر فروخت شدہ کتب خاطر خواہ قیمت پر فروخت کیں اور منافع کمایا۔ وہی ایک کتاب اور وہی ایک ملک تھا کہ دونوں مطبع کو ایک ملک میں حسب نیت ایسا نفع ایسا نقصان۔

ذلک لعبرۃ للناظرین۔

پس یہ کہ تھوڑا سا نمونہ کتب دینیات عقائد اسلام کا ظاہر و باہر ہے۔ باقی ترقیات مطبع کی صورتیں جو وسیلہ پرورش اور ذریعہ سد رمق ہزاروں بزرگان خدا اور ارباب کمال کا بنا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے:

رسی آنکہ بہ درد من کہ چو من
خامہ گیری و حرف بنگاری

وہ مطبع شاہی اہتمام جو پانچ ہزار روپیہ ماہوار سے اس زور شور سے جاری ہوا تھا اور حروف سربی خانہ ساز مہیا ہونے کے سبب کاپی نویسان کی احسان مندی اور وقت کا محتاج نہیں تھا اور سارے مطبع میں پانچ آلہ طبع جن کو ہندی میں کل کہتے ہیں، سے زیادہ نہ تھے۔ اور پانچ سے کمتر ہی جاری رہتے تھے۔ ترقی نہیں ہوئی اس لئے کہ کتب مطبوعہ مطبع کی خرید و فروخت و تجارت اور نفع اٹھانا سلطنت کے شایان شان نہیں تھا۔ نفع خلائق، بلاقیمت کی نیت دل میں راسخ تھی، بادشاہ وقت کا زمانہ مدت الحیاۃ اس کی بھی مساعدت نہ کر سکا۔ اس کے مقابلے میں اس مطبع خیر میں ستر آلہ طباعت ہیں۔ مختلف علوم کی کتب عربی، فارسی، اردو، ناگری، بنگالی و انگریزی درسی و دینیات و منطق و معقول و فروع و اصول اس مطبع میں طبع ہوتی رہتی ہیں اور ہر دم فیض رسانی عام کی نیت کی برکت سے اور نفع سے عدم التفات کے باعث روز افزوں ترقی ہوتی ہے کہ بہت تھوڑا سا نمونہ کتب دینیات اسلام چشم دیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ورنہ ہزاروں کتب تاریخ و حکایات طب و حکمت و دیگر فنون علمی حکمی عملی دینی اور دنیوی کا کیا ذکر اور یہ حال صرف ایک مطبع واقع شہر لکھنؤ

چشم دیدہ تھا جو قلم سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ورنہ شاخیں اس شجر طیبہ کی کانپور' پٹیالہ اور دور دراز منازل میں درخت طوبیٰ کی شاخوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ مطابع کو رشک بہشت بنا دیا۔ یہ محتاج بیان نہیں ہے۔ چونکہ تمام کتب دینیات شرائع فقہ و حدیث و تفسیر و علوم ادب و اخلاق مفید و مصالح تمام کارہائے دنیا و دین ہیں کہ تمام حور و قصور و رضوان و بہشت و نعمائے بہشت اس کے پھل ہیں۔ اس کی مثال اور نمونہ دنیا میں بھی ہے۔

فیہا فاکھتہ و نخل و رمان' یہ سب لذت نفس اور کام و دہن سے زیادہ نہیں۔ فیہا ما ھیہ الانفس و تلذ الاعین۔ پس یہ عام نعمت ہائے دین و دنیا ان کتب دینیات و کتب اخلاق کا حاصل ہیں۔ یہ بہشت عاشقان و محبوبان دوسری ہے۔ جو کتب الہیات و تصوف میں ہے۔ وہ اس مکان تک پہنچاتی ہے جس کو بہشت رضوان کہتے ہیں اور یہ مکین تک پہنچاتی ہے کہ اس کا نام' نام خدا سب سے بالا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ غیر مسلمان مطبع کی یہ صفات اور خوبیاں اور اہل اسلام کے مطابع مسقوطہ کی توہین و تنقیص و بدگوئی ہو معاذ اللہ' بلکہ نگاہ انصاف سے یہ بیان واقعی ہے جو اہل اسلام کی تنبیہہ اور عبرت پذیری کے لئے ہے تاکہ ظاہر ہو کہ تمام کار تجارت میں اپنے منافع پر نظر رکھنا شرعی طور پر مامور ہے کہ احل اللہ البیع میں وارد ہے۔ اگر مال صد روپیہ خرید کیا ہے۔ ہزار بلکہ دو ہزار قیمت طلب کر دی اور پھر وصول کر لی' اگرچہ کمال کی نگاہ میں ناانصافی ہے اور برا ہے مگر عنداللہ اور عندالشرع ہرگز ممنوع اور ناجائز نہیں ہے اور تجارت میں معیوب نہیں ہے۔ تجارت خرید و فروخت دنیوی محتاج چیزوں کی' بازار میں فروخت کرنا' منافع اٹھانا' تمام اشیاء ضروریات میں رائج ہے مگر سوداگری خرید و فروخت کتب دینیات و علوم علوی و مصاحف وغیرہ بطور بازاری مال کے دوکان دوکان میں کسی زمانے میں سنی نہیں گئی۔ یہ تجارت کوچہ بہ کوچہ انہیں مطابع سنگین کی وجہ سے رائج ہوئی

ہے۔ پس جیسا کہ خرید و فروخت اشیاء میں منافع دنیاوی حاصل کرنا مامور ہے' تجارت کی ترقی ہے۔ اس کے مقابلے میں اس دینی تجارت میں اور کتب علمی میں جو مطابع سنگین کی بدولت علوم' بازاری اشیاء ہو گئے ہیں' منافع دنیاوی کی بجائے مثل مطبع اودھ اخبار' اخروی منافع برائے خاص و عام کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہاں تصحیح' ترجمہ' تشریح و مقابلہ کتب و ارزانی پر نگاہ کر کے دولت دنیا کو دین پر فدا کر دیا۔ خدا سے امید ہے کہ مطالعہ اسلام میں ترقی اور برکت دے۔ پس جو مطابع اسلام ملک کے اطراف و اکناف میں قائم ہیں اور رو بہ ترقی' وہ سب ان صفات میں اور ان نیات میں بلا شک داخل ہیں۔ اس صورت میں کچھ چشم دید حال اودھ اخبار مطبع کا لکھا گیا ہے۔ ہر مطبع جس میں یہ صفات موجود ہوں اس تعریف اور ستائش میں شریک ہے۔

مخففات تعلیقات

نشانات:

ح = حاشیہ

ص = صفحہ، صفحات

ک = کالم

ماخذ:

آربری = آربری، اے ۔ جے (Arberry, A-J) "Catalogue of thhe Library of the India Office, Persian Books" (لندن، ۱۹۳۷ء)

اسٹوری = اسٹوری، سی اے (Story, C.A) "Persian Literature, A Bio-Bibliographical Survey." تین جلدیں (لندن، ۱۹۵۳ء - ۱۹۸۴ء)

اشپرینگر = اشپرینگر، اے (Sprenger, A.) "Report of the Researches Into the Mohammadan Libraries of Oudh." (کلکتہ، ۱۸۹۶ء)

اکرام = محمد اکرام چغتائی، تعلیقات "شاہان اودھ کے کتب خانے" ترجمہ تصنیف محولہ بالا۔ اشپرینگر (کراچی، ۱۹۷۳ء)

بلوم ہارٹ = بلوم ہارٹ، جے ایف (Blumhardt, J.F) "Catalogue of the Library of the India Office, Hindustani Books." (لندن، ۱۹۰۰ء)

بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم) = ایضاً''

of Hindustani Printed Books in the Library of the

"Catalogue

(لندن' ۱۸۸۹ء) British Museum."

بلوم ہارٹ (برٹش میوزم' ضمیمہ) = ایضاً''

Catalogue of Hindustani Books in the Library of

"A Suplementary

(لندن' ۱۹۰۹ء) the British Museum."

رحمان علی = رحمان علی' تذکرۂ علمائے ہند (نو لکشور' ۱۹۱۴ء)

رحمان علی' اردو رحمان علی ''تذکرۂ علمائے ہند'' اردو ترجمہ - محمد ایوب قادری (کراچی' ۱۹۶۱ء)

ترجمہ =

سرکیس = یوسف الیامہ سرکیس ''معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ'' دو جلدیں'

(قم' ۱۴۰۹ھ)

عارف = سید عارف نوشاہی ''فہرست کتابہائے فارسی چاپ سنگی و کمیاب'' کتابخانہ گنج بخش جلد یکم و دوم (اسلام آباد' ۱۹۸۶ء۱۹۸۹ء)

عبدالحیٰ = سید عبدالحیٰ ''نزہتہ الخواطر'' (حیدر آباد ۱۹۵۴ء-۱۹۵۹ء)

عبدالرحیم = مولوی عبدالرحیم ''اللباب المعارف العلمیہ فی مکتبہ دارالعلوم اسلامیہ'' (پشاور)' (آگرہ' ۱۹۱۸ء)

فہرست مشروح =''فہرست مشروح بعض کتب نفیسہ و قدیمہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ'' (حیدر آباد دکن' ۱۳۴۷ھ - ۱۳۵۷ھ)

قاموس = ''قاموس الکتب اردو'' انجمن ترقی اردو (کراچی' ۱۹۶۱ء)

کشف = حاجی خلیفہ ''کشف الظنون'' ٦ جلدیں (بیروت' ۱۹۹۰ء)

منزوی = احمد منزوی ''ادبیات فارسی' برمنای تالیف استوری'' (ترجمہ یو-ا-برگل) دو جلد' (تہران' ۱۳۶۲ھ)

تعلیقات:

۱۔ مصنفہ ۔ شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء ۔ ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) اس کتاب کے متعدد قلمی نسخوں کی نشاندہی اکرام ص ۱۴۲ بہ ذیل ۳۵۴ میں ہے۔ اس کے مختلف تراجم اور اشاعتوں کے لئے: کشف' ک ۱۱۷۷۔۱۱۷۸' اس کا انگریزی ترجمہ W.H. Clarke نے کیا تھا۔ مطبوعہ: کلکتہ' ۱۸۹۱ء' بحوالہ: خلیق احمد نظامی "The Life and Times of Shiekh Nizamuddin Auliya" (دہلی' ۱۹۹۱ء) ص ۲۰۲۔

۲۔ "مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ" کشف' ک ۱۱۷۸۔

۳۔ عزالدین محمود بن علی الکاشی النطیری' متوفی ۷۳۵ھ/۱۳۳۴ء اسماعیل پاشا البغدادی "ہدیتہ العارفین" (اسماء المولفین و آثار المصنفین فی کشف الظنون) جلد ۶ (بیروت' ۱۹۸۲ء) ک ۴۰۸۔

۴۔ اس مطبع سے بعد میں اس کا کم از کم ایک اور ایڈیشن شوال ۱۳۰۷ھ/مئی ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ عارف ص ۳۴۔

۵۔ ۱۲۱۰ھ/۱۷۸۵ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تربیت لکھنؤ میں پائی۔ واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء۔۱۸۵۶ء) کے ہم مکتب تھے۔ غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء۔۱۸۲۷ء) سے واجد علی شاہ تک اودھ کے سب ہی حکمرانوں کے عہد میں اعلیٰ مناصب ۔ "امیرالانشاء" اور "صدرالمانت" کے عہدوں پر فائز رہے۔ ریاست اودھ سے "دبیرالانشاء" اور اپنی علمی و تصنیفی خدمات کے باعث شاہ دہلی ابوظفر بہادر شاہ (۱۸۳۷ء۔۱۸۵۷ء) کے دربار سے "رفیق الدولہ" کا خطاب پایا۔ الحاق اودھ (۱۸۵۶ء) کے بعد "مدرسہ عالیہ کیننگ کالج" (لکھنؤ) میں فارسی کے مدرس ہوگئے۔ اور اپنے انتقال (۱۸۷۱ء) کے وقت تک اسی سے منسلک رہے۔ ان کے انتقال کے بعد اس جگہ پر قدر بلگرامی (۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء ۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء) کا تقرر ہوا تھا۔ سید علی اصغر بلگرامی "فارسی بلگرام" (حیدر آباد دکن' ۱۳۴۷) ص ۵۵' مرزا محمد عسکری "ادبی خطوط غالب" (کراچی' ۱۹۴۳ء) ص ۲۸۱) تقریباً ۲۴ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں سے "ظہیرالانشاء" "ترغیب الفرقان"

"اسرار کربلا" "ظہیر الایمان" "اسرار غفلت" "اسرار محبت" "ہدایت النور" "تقویت الاسلام" "اسرار فریمیشن" "دستور المحبت" "عقل و عشق"
"فوائد النساء" "ظہیر الاسلام" اور "اسرار واجدی" کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے "اسرار محبت" "اسرار غفلت" اور "اسرار فریمیشن" رئیس اعظم شہر سورت کے اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ بحوالہ "فوائد النساء" (لکھنؤ ۱۳۰۰ھ) مقدمہ، ص ۴-۵، ۴۶ (اس تصنیف میں مصنف نے اپنی مذکورہ بالا متعدد تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ص ۳، ۴۰، ۴۶، ۱۰۹، ۱۲۱، ۱۲۵) "فوائد النساء" تعلیم نسواں کے مسئلے پر مصنف نے "سررشتہ تعلیم مغربی شمالی" کی فرمائش پر تحریر کی تھی۔
ان تصانیف میں سے "اسرار واجدی" (غیر مطبوعہ) کا تعلق واجد علی شاہ سے تھا۔ اس کے علاوہ اپنی (غالباً زیر تصنیف) کتابوں "سیر السلطان" اور "سوانح واجدی" کی تصنیف کے لئے ظہیر بلگرامی نے ایک عرض داشت اور ایک قطعہ واجد علی شاہ کی خدمت میں مٹیا برج بھیج کر ان کے حالات زندگی اور تصنیفات کے نام دریافت کئے تھے۔ لیکن واجد علی شاہ نے معذرت کر لی اور تین ہزار روپے نقد انہیں ارسال کئے اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ "ظہیر الانشاء" ص ۶۷، بحوالہ: مسعود حسن رضوی ادیب "سلطان عالم واجد علی شاہ، انسان، مصنف، شاعر" مشمولہ: "نذر مقبول" مرتبہ: خیر بھوروی (لکھنؤ ۱۹۷۰ء) ص ۲۷-۳۸، ظہیر بلگرامی نے ایسا ہی کچھ شاہ دہلی بہادر شاہ ظفر سے بھی ایک طویل فارسی قطعہ "صراط مستقیم" لکھ کر دریافت کیا تھا، جس پر شاہ ظفر نے مثبت جواب ارسال کیا تھا۔ "ظہیر الانشاء" ص ۱۰۰، بحوالہ ایضاً ص ۴۶۔

ظہیر بلگرامی کو نثر کے علاوہ شعر میں بھی دستگاہ تھی۔ تخلص ظہیر تھا۔ تفصیلات کے لئے: سید علی اصغر بلگرامی، ص ۵۵، منشی محمد محمود عثمانی بلگرامی "تنقیح الکلام فی تاریخ خطہ پاک بلگرام" (علی گڑھ ۱۹۶۰ء) ص ز، عبدالغفور نساخ، "سخن شعراء" (لکھنؤ ۱۹۸۱ء) ص ۳۱۲، کلب حسین خاں نادر "تذکرۂ نادر" (لکھنؤ ۱۹۵۷ء) ص ۱۰۵، سید علی حسن خاں "صبح گلشن" (بھوپال ۱۲۹۵ھ) ص ۲۶۴-۲۶۵، سید احمد دیوان بیگی شیرازی "حدیقتہ الشعراء" جلد دوم (تہران ۱۳۶۵ خ) ص ۱۱۳۷، مرزا محمد علی مدرس "

ریحانتہ الادب" جلد چہارم (تہران' ۱۳۴۹ خ) ص ۸۷' رحمان علی "تذکرۂ علمائے ہند" (لکھنؤ' ۱۹۱۴ء) ص ۳۰۔

۶۔ یہ مطبع بعد میں "مطبع نو لکشور" کے نام سے معروف ہوا۔ اس مطبع سے "اودھ اخبار" کا پہلا شمارہ ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو شائع ہوا۔ اس کے اجراء سے چند ماہ قبل یہ مطبع قائم ہوا تھا۔ امیر حسن نورانی "منشی نو لکشور' حالات اور خدمات" (دہلی' ۱۹۸۲ء) ص ۲۹' امداد صابری ("تاریخ اردو صحافت" جلد دوم' دہلی' ۱۹۵۹ء' ص ۵۸) کے مطابق یہ مطبع ۲۳' نومبر ۱۸۵۸ء کو قائم ہوا اور اس مطبع سے "اودھ اخبار" جنوری ۱۸۵۹ء سے جاری ہوا۔ جب کہ امیر حسن نورانی (ص ۲۹ ح) نے اس کے پہلے شمارۂ مذکور کو اپنی ملکیت میں بیان کیا ہے۔ منشی نو لکشور (۱۸۳۶ء-۱۸۹۵ء) جو اس مطبع کے قیام سے قبل لاہور کے "کوہ نور پریس" میں ملازمت کرتے تھے' ایک آزاد مطبع قائم کرنے کے ارادے سے لکھنؤ پہنچے اور یہاں ایک ایسا مطبع قائم کر ڈالا' جس نے بہت جلد نہ صرف لکھنؤ اور ہندوستان بلکہ اپنے وقت میں ایشیا کے سب سے بڑے مطبع کی حیثیت حاصل کر لی۔ وینا اولڈن برگ (Veena Olden Burg)

"Making of Colonial Lucknow"

(نیو جرسی' ۱۹۸۴ء' ص ۲۳۶' پھر اس مطبع سے "اودھ اخبار" کا اجراء اور پھر کچھ ہی عرصے میں "Lucknow Iron Works" "Upper India Paper Mill" اور بعد میں دو جدید بنکوں کا قیام اور "نول کشور آئس فیکٹری" ان کی اور ان کے خاندان کی مزید کامیابیاں تھیں۔ پراگ نرائن بھارگو' مرتب "Who's Who in India" (لکھنؤ ۱۹۱۱ء) جلد دوم ص ۲۱۹' ۱۹۴۰ء کے بعد اس مطبع نے اپنے خاندانی تنازعات کے باعث اپنا طباعتی کاروبار محدود کر لیا اور "نو لکشور بک ڈپو" کا نام اختیار کیا۔

۷۔ یوں تو طباعت چین میں آٹھویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی اور متحرک ٹائپ سے وہاں گیارہویں صدی میں کام لیا جانے لگا تھا' لیکن یورپ میں پندرہویں صدی میں طباعت شروع ہوئی۔ پہلا پریس لندن میں ۱۴۷۶ء میں قائم ہوا "Collins Encyclopaedia" ۱۹۷۷ء ص ۴۵۸' ہندوستان میں متحرک حروف کے ذریعے طباعت کی تاریخ پر متعدد سالیہ جائزے موجود ہیں' ایک مفصل اور معلوماتی

تاریخی جائزہ نذیر احمد "Oriental Presses in the World" (لاہور، ۱۹۸۵ء) میں ہے۔ و نیز گراہم شا (Graham Shaw) "Printing in Calcutta to 1800" (لندن، ۱۹۸۱ء) بالخصوص باب اول۔

۸۔ نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء-۱۸۱۴ء) کے بیٹے تھے۔ ۱۸۱۴ء میں مسند نشین وزارت ہوئے پھر ۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو انگریزی حکومت کی ایما پر بادشاہت کا اعلان کیا۔ ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء کو انتقال کیا۔ نجم الغنی "تاریخ اودھ" جلد چہارم (لکھنؤ، ۱۹۱۹ء) ص ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۴۴، ۲۰۴۔

۹۔ احمد بن محمد بن علی بن ابراہیم یمنی شروانی ۔ یمن سے فراغت علم کے بعد نوجوانی میں ہندوستان آئے اور کلکتے میں قیام کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی اور مدرسہ عالیہ، فورٹ ولیم کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد استعفیٰ دے کر لکھنؤ چلے گئے اور غازی الدین حیدر کی ملازمت اختیار کی۔ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر مختلف مقامات کا سفر کیا۔ دوران سفر پونا میں ۲۱ مئی ۱۸۴۰ء / ۱۹ ربیع اللاول ۱۲۵۶ھ کو رحلت پائی۔ عربی میں کامل دستگاہ تھی۔ اپنے وقت کے متبنی (۳۰۳ھ/۹۱۵ء ۳۵۵ھ/۹۶۵ء) اور حریری (۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء- ۵۱۶ھ/۱۰۲۲ء) تسلیم کئے گئے۔ قیام کلکتہ کے دوران کئی کتابیں تصنیف کیں اور "الف لیلیٰ" کو دو جلدوں میں مرتب کیا۔ لکھنؤ میں "مناقب حیدریہ" تصنیف کی۔ "تاج الاقبال فی تاریخ ملک بھوپال" بھی ان سے یادگار ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد

The Contribution of Indo Pakistan to Arabic Literature

(لاہور، ۱۹۶۸ء) ص ۲۱۹، ۲۵۰، ۴۷۶ میں ان کی ۶ عربی تصانیف کے نام درج ہیں۔ سرکیس، ک ۱۱۳۰-۱۱۳۱، مزید معلومات کے لئے منزوی، ص ۱۰۰۵-۱۰۰۷، غالب کے شاگرد محمد عباس شروانی رفعت (۱۸۲۹ء-۱۸۹۸ء) ان کے فرزند تھے۔ تفصیلات کے لئے عبدالحیٔ ص ۳۴، رحمان علی "تذکرۂ علمائے ہند" اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری (کراچی، ۱۹۶۱ء) ص ۱۰۵، مالک رام "تلامذۂ غالب" (دہلی، ۱۹۸۴ء) ص ۲۰۹-۲۱۰، تلوم سیتا پوری "خیابان غالب" (کراچی، ۱۹۷۰ء) بالخصوص ص ۲۲۸-۲۳۰۔

۱۰۔ قاضی علی احمد (۱۷۵۶ء-۱۸۲۴ء) کے فرزند ۱۷۷۹ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم کلکتے میں حاصل کی۔ پھر یمن جا کر شیخ احمد یمنی کے شاگرد ہوئے اور ان کی دختر سے نکاح کیا۔ وہاں سے لکھنؤ آئے اور طباعت کے کام سے منسلک ہوئے۔ فاضل اور جید ادیب تھے۔ تصانیف میں "نفائس اللغات" کے علاوہ "روضتہ الازہار" "مفتاح اللسان" "تذکرۂ شعرائے عرب" "شرح قصیدہ بانت سعاد" "شرح دیوان متبنی" "شرح مقامات حریری" ان سے یادگار ہیں۔ آخر عمر میں "نسب نامہ خاندانہ" شرح و بسط کے ساتھ لکھا۔ ۱۸۴۵ء میں انتقال کیا۔ تفصیلات کے لئے بلگرامی، ص ۲۱۱، عبدالحیٔ، ص ۸۸۔۸۹، رحمان علی، اردو ترجمہ، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۱۱۔ اردو فارسی لغت، جو ۷ رجب ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء کو مکمل ہوئی۔ اولاً یہ لکھنؤ سے دو جلدوں میں ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں (فہرست مشروح، حصہ سوم، ص ۳۱۰) پھر ۱۲۸۱ھ/ ۶۵۔۱۸۶۴ء میں اور پھر مطبع نو لکشور، کانپور سے اگست ۱۸۶۹ء میں مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں اور پھر مطبع نو لکشور کانپور سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ تفصیلات کے لئے: آربری، ص ۳۴۹، بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم، ضمیمہ) ک ۷۷۰، شہر یار نقوی "فرہنگ نویسی فارسی در ہندو پاکستان" (تہران، ۱۳۴۱) ص ۲۲۵۔۲۲۷، رحمان علی (ص ۳۰) کے مطابق اس میں عربی مترادفات بھی دیئے گئے ہیں۔ عارف، ص ۳۲۱ یہاں ایک "انفس النفائس" انتخاب نفائس اللغات کا ذکر بھی ہے، جس میر حسن بن میر حسین عرف میر کامل ساکن محلہ محمود نگر لکھنؤ نے ۷ رجب ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۵ء کو لکھا تھا اور اس پر حواشی قدرت احمد گوپاموی (متوفی ۱۸۹۲ء) ولد عنایت احمد فاروقی نے تحریر کئے تھے۔ "نفائس اللغات" مطبع مصطفائی لکھنؤ (۱۲۸۱ھ) صفحات ۴۹۰، اور اسی کے اختصار "منتخب النفائس" مرتبہ محبوب علی رامپوری مطبوعہ مطبع مصطفائی صفحات ۱۷۲ کا ذکر "فہرست کتب عربی و فارسی و اردو ۔ ۔ ۔ کتب خانہ سید علی بلگرامی (حیدر آباد دکن، ۱۹۰۱ء) ص ۱۰۶ اور اسٹوری، جلد سوم حصہ اول ص ۱۱۵، میں ملتا ہے۔ اس لغت میں موجود تسامحات کی تصحیح "نقس اللغتہ" کے نام سے سید علی اوسط رشک (متوفی ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸ء) شاگرد ناسخ (متوفی ۱۸۳۷ء) نے کی تھی، جو کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ "فہرست مشروح" حصہ دوم، ص ۳۰۵ (نقس اللغتہ کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے ذخیرۂ مخطوطات میں بھی موجود ہے)۔

۱۲۔ فرزند قاضی محمد لعل ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء کو ہوگلی میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں وفات پائی۔ ان کے بزرگ قاضی اور صدر الصدور کے عہدوں پر فائز رہے۔ اختر لکھنؤ میں اودھ کے ریذیڈنٹ کے منشی رہے، پھر وطن واپس چلے گئے۔ غازی الدین حیدر نے انہیں طلب کر کے تصنیف و تالیف کی خدمت پر فائز کیا اور ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ غازی الدین حیدر کے انتقال (۱۸۲۷ء) کے بعد ۱۹ برس کانپور میں تحصیل دار رہ کر لکھنؤ واپس آئے۔ اکثر علوم میں مہارت اور نظم و نثر پر عبور رکھتے تھے۔ تصانیف میں مثنوی "سراپا سوز" "صبح صادق" "حدیقتہ الارشاد" "بہار اقبال" "مفید المستفید" "ہفت اختر" "لوامع النور" "بہار بے خزاں" "گلدستہ محبت" "محامد حیدری" "نقود الحکم" "مخزن الجواہر" "تذکرۂ آفتاب عالمتاب" ملتے ہیں۔ تفصیلات کے لئے۔ مظفر حسین صبا "تذکرۂ روز روشن" (تہران، ۱۳۴۳) ص ۴۰-۴۱، صدیق حسن خاں "شمع انجمن" (بھوپال، ۱۲۹۳ھ، ص ۴۳، سعادت خاں ناصر "تذکرۂ خوش معرکہ زیبا" (لاہور، ۱۹۷۰ء) ص ۳۰۱-۳۰۲، قاضی عبدالودود، تعلیقات "تذکرۂ ابن طوفان" مولفہ ابن امین اللہ طوفان (پٹنہ، ۱۹۵۴ء) ص ۶۰-۶۵، منزوی، ص ۶۷۹-۶۸۰

۱۳۔ ممکن ہے اس وقت سرکاری اہتمام سے قائم ہونے والے مطبع کا یہی نام تجویز ہوا ہو، لیکن بعد میں اس کا نام "مطبع سلطانی" رکھا گیا۔ ہاں عہد شاہی میں "مطبع مرتضوی" نام کا ایک مطبع لکھنؤ میں محمد نصیر الدین دہلوی نے قائم کیا تھا، جو ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء تک کام کرتا رہا۔ سید آغا مہدی "تاریخ لکھنؤ" (کراچی، ۱۹۷۶ء) ص ۹۲-۹۳۔

لکھنؤ میں مطابع کے قیام کی پہلی اور قریبی شہادت دیتے ہوئے اشپرینگر (A. Sprenger)

"A Catalogue of the Arabic Persian and Hindustan Manuscripts of the Libraries of the King of Oudh."

جلد اول (کلکتہ، ۱۸۵۴ء) نے اس کے قیام کا سہرا غازی الدین حیدر کے سر باندھا ہے۔ مقدمہ، ص ۵، غازی الدین حیدر ہی آرچر (Archer) نامی ایک انگریز کو، جو کانپور میں ایک لیتھو پریس چلا رہا تھا، لکھنؤ آنے اور وہاں ایک پریس کے قیام کی دعوت دیتا ہے، جو ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۰ء میں لکھنؤ سے "بہجتہ مرضیہ شرح الفیہ" شائع

کرتا ہے۔ ایضاً" لیکن "Bengal Political Consultations" مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۲۹ء، نمبر ۱۳۰ کے مطابق آرچر، غازی الدین حیدر کے مطبع میں محض ملازمت اختیار کرتا ہے۔ جونز، آر ایل (Jones, R.L)

"A Fatal Friend-ship, the Nawabs, the British and the city of Lucknow."

(دہلی، ۱۹۸۵ء) ص ۱۳، اور ایک شہادت کے مطابق منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں (متوفی دسمبر ۱۸۳۷ء) نے آرچر کو پانچ سو روپے ماہوار قسطوں پر دیئے تھے۔ کمال الدین حیدر "قیصر التواریخ" جلد اول (لکھنؤ، ۱۹۰۷ء) ص ۳۱۰۔ اسی زمانے میں اودھ کا اسسٹنٹ ریزیڈنٹ کرنل لاکٹ (Col. Lockett) بھی شاہی مطبع کا مہتمم رہا، لیکن چونکہ منتظم الدولہ سے اس کی موافقت نہ تھی اس لئے انہوں نے اس کو موقوف کروا دیا۔ ایضاً" ص ۲۹۹۔

اشپرینگر کے بیان کے مطابق، اس کے قیام لکھنؤ (تقریباً" ۱۸۵۰ء) تک وہاں بارہ نجی سنگی مطابع موجود تھے۔ تصنیف مذکور ص مقدمہ، ص ۵، لیکن جونز کے مطابق اس وقت ۱۷ مطابع کام کرتے تھے۔ مگر واجد علی شاہ نے ۱۸۴۹ء میں کمال الدین حیدر (مصنف۔ "قیصر التواریخ" محولہ بالا) کی تصنیف میں اپنے لئے ایک دو ناگوار عبارتوں کی موجودگی (اور خوشامدانہ جذبات کی عدم موجودگی) کے باعث غضبناک ہو کر طباعت کو ممنوع قرار دے دیا تاکہ یہ کتاب پھر کہیں شائع نہ ہو سکے۔ جونز، ص ۴۷، چنانچہ مالکان مطابع لکھنؤ سے کانپور منتقل ہو گئے۔ اشپرینگر، تصنیف محولہ بالا، مقدمہ، ص ۶۔ حالیہ محققین میں سے مسعود حسین رضوی ادیب اس واقعے کو درست نہیں سمجھتے۔ "لکھنؤیات ادیب" (اسلام آباد، ۱۹۸۸ء) ص ۱۱-۱۲، واجد علی شاہ کی جانب سے اس وقت مطابع کی بندش اور کمال الدین حیدر کے مذکورہ عمل کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے جونز نے خیال ظاہر کیا ہے کہ کمال الدین حیدر سرکاری رصدگاہ کے انگریز مہتمم کرنل ول کاکس (Col. R. Wilcox) کے زیر اثر تھا اور ول کاکس نے رصد گاہ کے بارے میں (غالباً") کئی مخالفانہ رپورٹیں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھیجی تھیں۔ ص ۴۷

۱۴۔ عثمانی بلگرامی "تنقیح الکلام" ص ۲۱۱، میں یہ خدمت اوحد الدین بلگرامی سے

منسوب ہے۔

۱۵۔ "مطبع سلطانی" سے یہ دو جلدوں میں ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء میں طبع ہوئی۔ ص ۳۵۴ اور ۲۴۲ آربری، ص ۱۸۱، اس پر مصنف کے طور پر غازی الدین حیدر کا نام تحریر ہے (نجم الغنی "تاریخ اودھ" جلد چہارم، لکھنؤ، ۱۹۱۹ء، ص ۲۰۷۔۲۰۹ میں اس سے اختلاف کیا گیا ہے) لیکن اس کا دیباچہ اور اس کی تنظیم و ترتیب مقبول محمد نے انجام دی، جو قبل ازیں مثنوی "سحر حلال و ورود اشعار" لکھ چکا تھا۔ اسٹوری، جلد دوم، حصہ اول، ص ۹۶، جلد سوم، حصہ اول، ص ۱۹۷۔۱۹۸، یہ لغت مکمل سات جلدوں میں مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ ص علی الترتیب ۲۴۷، ۲۱۸، ۱۷۰، ۲۲۳، ۲۳، ۲۲۸، ۲۴۴، آربری، ص ۱۸۱، پھر اس کا ایک ایڈیشن ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں ۱۱۷۰ صفحات پر مشتمل شائع ہوا۔ شہریار نقوی تصنیف مذکور، ص ۲۱۷۔۲۲۰، ونیز مسعود حسن رضوی ادیب "شاہان اودھ کا علمی و ادبی ذوق" مشمولہ "نذر ذاکر" مرتبہ مجلس نذر ذاکر (دہلی ۱۹۶۸ء) ص ۱۷۹۔

۱۶۔ یہ عربی فارسی لغت مطبع سلطانی سے سات جلدوں میں کل ۲۹۱۷ صفحات پر مشتمل شائع ہوئی تھی۔ مسعود حسن رضوی ادیب "لکھنؤیات ادیب" (اسلام آباد، ۱۹۸۸ء) ص ۹۔۱۱، اشپرینگر کے مطابق اس میں غازی الدین حیدر کے حکم سے بیشتر اضافے کیے گئے۔ صفحات کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ ص ۲، مزید معلومات کے لئے مسعود حسن رضوی ادیب "شاہان اودھ کا علمی و ادبی ذوق" ص ۱۷۹۔

۱۷۔ قاضی محمد صادق اختر (حوالہ مذکور ۱۲) کی تصنیف، جو مطبع سلطانی سے ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۳ء میں شائع ہوئی، صفحات ۳۸۸+۳۵ آربری، ص ۲۷۷

۱۸۔ یہ عربی میں شیخ احمد یمنی (حوالہ مذکور ۹) کی تصنیف ہے، جو غازی الدین حیدر کی مدح میں ہے۔ ۱۲۳۵/۱۸۲۰ء میں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل مطبع سلطانی سے شائع ہوئی۔ سرکیس، ک ۱۱۲۱۔

۱۹۔ منشی محمد مسعود بلگرامی۔ اسٹوری (ص ۵۶) نے ان کا نام محمد مسعود خاں بطور تحریر کیا ہے۔ ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ امام الدین، نبیرۂ نظام الدین احمد صانع بلگرامی (۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء۔۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء)۔ تفصیلات کے لئے متعدد ماخذ،

بالخصوص علی ابراہیم خلیل "صحف ابراہیم" مشمولہ "خدا بخش لائبریری جرنل" پٹنہ' شمارہ ۶' ۱۹۷۸ء ص ۹۱' نقش علی "باغ معانی" مشمولہ (ایضاً' شمارہ ۲' ۱۹۷۷ء' ص ۱۲۰-۱۲۱)
فارغ التحصیل ہو کر نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۸-۱۸۱۴ء) اور پھر غازی الدین حیدر کے عہد میں نوابین اودھ سے منسلک رہے۔ ۲۱ جماوی الاول ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء کو انتقال کیا۔ محمد ظہیر الدین بلگرامی "ترغیب الفرقان" (کانپور' ۱۲۹۱) ص ۳' عثمانی بلگرامی "تنقیح الکلام" ص ز۔

۲۰۔ اوحدالدین بلگرامی' دیکھیے محولہ بالا ۱۰۔

۲۱۔ ان کا ذکر نہ مل سکا۔

۲۲۔ ویسے ایک "ٹیڑھی کوٹھی" کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جسے نواب سعادت علی خاں نے انگریز ریزیڈنٹ کے لئے بنوایا تھا اور اس میں امور مملکت انجام دیئے جاتے تھے۔ نجم الغنی "تاریخ اودھ" جلد چہارم ص ۸۸' سید آغا مہدی نے "کلاں کوٹھی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس میں "سلطان المطابع" قائم تھا اور یہ مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں قبول کے زیر اہتمام تھا۔ "تاریخ لکھنؤ" ص ۲۴۱' واجد علی شاہ نے اپنی تصنیف "بنی" (کلکتہ ۱۲۹۴) میں چھاپہ خانہ اور کتب خانہ کو مقبول الدولہ کے زیر انتظام بتایا ہے۔ ص ۲۴۰۔

۲۳۔ فضل امام خیر آبادی' والد کا نام شیخ محمد ارشد ہرگامی' علوم عقلیہ میں مشہور زمانہ تھے۔
"رسالہ میر زاہد" اور "میر زاہد ملا جلال" پر تفصیلی حواشی لکھے۔ "آمد نامہ" اگرچہ قواعد فارسی میں ان کی کتاب ہے۔ لیکن میں جوار لکھنؤ کے علما کا ذکر ہے۔ فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۷ - ۱۸۶۱ء) ان کے فرزند' اور صدرالدین آزردہ (۱۷۸۹ء - ۱۸۶۸ء) ان کے ممتاز تلامذہ میں ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں انتقال کیا۔ تفصیلات کے لئے بزمی انصاری "تراجم الفضلا" (انگریزی ترجمہ) مطبوعہ کراچی' ۱۹۵۶ء مقدمہ ص i - iii و نیز ص ۳۵' ۳۶ مزید ماخذ کے لئے رحمان علی' اردو ترجمہ' ص ۳۷۷ - ۳۷۸

۲۴۔ شیخ باقر علی کے فرزند' دلسو (معنافات لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ علوم معقول کی تحصیل مولانا فضل امام خیر آبادی (بہ ذیل بالا ۲۳) سے کی۔ صالح بزرگ تھے۔ عبدالحی'

ص ۱۶ - ۱۷۔

۲۵۔ غالباً" مولوی محمد اسمٰعیل لندنی' والد کا نام محمد وجیہہ الدین تھا۔ مراد آباد قدیم وطن تھا۔ پھر لکھنؤ میں قیام رہا۔ عربی زبان و ادب پر عبور حاصل کیا تھا۔ نصیرالدین حیدر نے اپنی سفارشات پر انہیں لندن بھیجا تھا' اس لئے لندنی مشہور ہو گئے تھے۔ تصانیف میں "حاشیہ شرح تہذیب یزدی" اور "حاشیہ میبذی" مشہور ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔ عبدالحی' ص ۶۱ - ۶۵' رحمان علی اردو ترجمہ ص ۴۱۳ - ۴۱۴

۲۶۔ سندیلہ کے باشندے اور منشی عبدالستار خوش نویس کے فرزند۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ کے مثالی خوش نویس مانے جاتے تھے۔ دربار سے منسلک تھے اور واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے۔ احترام الدین شاغل "صحیفہ خوش نو۔یساں" (علی گڑھ' ۱۹۶۳ء) ص ۲۵' عبدالحلیم شرر' "گزشتہ لکھنؤ" (دہلی ۱۹۷۱ء) ص ۱۷۲۔

۲۷۔ عمادالحسن نام۔ قزوین میں پیدا ہوا۔ خطاطی میں ملا محمد حسین تبریزی کا شاگرد تھا۔ مبصرین کا فیصلہ ہے کہ اس کے زمانے تک فارس میں اس سے بہتر خطاط پیدا نہیں ہوا۔ مسلک کے لحاظ سے اہل سنت و الجماعت تھا اور عقائد میں متشدد ہونے کے باعث عباس شاہ صفوی نے ۱۶۱۵ء میں اسے قتل کرا دیا تھا۔ احترام الدین شاغل' تصنیف مذکور' ص ۱۳۹ - ۱۴۰' و نیز مولوی محمد شفیع "مقالات شفیع" جلد اول (لاہور' سنہ ندارد) ص ۱۷۴' ۱۷۵' ۲۰۷

۲۸۔ یاقوت مستعصمی۔ جمال الدین نام۔ اپنے کمالات فن کے باعث بے حد مشہور تھا۔ ۱۲۶۸ء میں انتقال کیا۔ ایضاً" ص ۲۱۱' ۱۸۷' ۱۸۸ و نیز شاغل' تصنیف مذکور' ص ۱۸۵ - ۱۸۷۔

۲۹۔ ان کے بارے میں تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔

۳۰۔ وطن لکھنؤ تھا' خط نسخ کے استاد مانے جاتے تھے۔ روایت ہے کہ لکھنؤ میں طباعت کے لئے قرآن حکیم پہلے پہل انہی نے کتابت کیا تھا۔ ایضاً" ص ۱۶۸' شرر' تصنیف مذکور' ص ۱۷۴۔

۳۱۔ ان کے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔

۳۲۔ ۱۸۹۵ء میں منشی نو لکشور کے انتقال تک' "مطبع نو لکشور لکھنؤ" کی شاخیں کانپور'

جبل پور' پٹیالہ' اجمیر اور لاہور میں قائم ہو چکی تھیں۔ امیر حسن نورانی' تصنیف مذکور' ص ۴۷۔

۳۴۔چوہے اور بلی کے حوالے سے ایسے جو متعدد قصے لکھے گئے اور شائع ہو کر مقبول ہوئے' ان کا ایک اندازہ خلیل الرحمٰن داؤدی "اردو کی قدیم منظوم داستانیں" (بارہ قصے)' جلد اول (لاہور' ۱۹۶۷ء) ص ۲۷۳۔ ۲۷۸' ڈاکٹر نجم الاسلام "مطالعات" (حیدر آباد' ۱۹۹۰ء) ص ۲۳۹ ۔ ۲۴۲' ۲۵۴ ۔ ۲۵۵' سے ہو سکتا ہے۔ ان قصوں کی درج ذیل اشاعتوں کا ذکر عام ملتا ہے۔

(i) "گربہ نامہ"

(الف) مصنفہ۔ منی لال رفعت' مطبوعہ مراد آباد' ۱۸۷۳ء' صفحات ۲۸۔ بحوالہ بلوم ہارٹ (انڈیا آفس) ص ۱۵۵۔

(ب) مصنفہ ۔ غلام علی آزاد' دہلی ۱۸۴۷ء' صفحات ۳۰۔ بحوالہ ایضا" ص ۱۳۸۔

(ج) معہ "چوہے نامہ" اور "الیونی نامہ" ہمصنفہ۔ غلام علی آزاد' مطبوعہ لکھنؤ' ۱۸۹۰ء' صفحات ۲۳ بحوالہ ۔ بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم) ک ۱۳۱' مطبوعہ کانپور' ۱۸۶۸ء' صفحات ۲۶' لکھنؤ' ۱۸۷۰ء ' صفحات ۲۶۔ بحوالہ۔ بلوم ہارٹ (انڈیا آفس)' ۱۵۴ مطبوعہ کانپور' ۱۸۷۴ء صفحات ۲۶۔ بحوالہ بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم) ک ۱۳۱۔

(د) "قصہ چوہا د بلی" بمبئی' ۱۸۷۵ء صفحات ۲۴۔ بحوالہ۔ بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم) ک ۱۳۱۔

(ii) "چوہے نامہ"۔ ـ ـ ـ ـ "معہ الیونی نامہ"

(الف) مصنفہ ۔ واحد' اور "بلی نامہ" مصنفہ : غلام علی آزاد "معہ اجار چوہوں کا" مصنفہ : ولی محمد نظیر' مطبوعہ کانپور' ۱۸۸۱ء ' صفحات ۲۴۔ بحوالہ : بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم) ک ۱۳۱۔

(ب) مصنفہ : ارم' لکھنؤ ۱۸۴۷ء' صفحات ۲۵ بحوالہ بلوم ہارٹ (انڈیا آفس)ص ۱۵۴' مطبوعہ لکھنؤ' ۱۸۶۰ء صفحات ۲۳۔ بحوالہ ایضا"۔

(iii) "اجار چوہوں کا" ۔ "معہ بنجارہ نامہ"

(الف) مصنفہ : ولی محمد نظیر' مطبوعہ لکھنؤ' ۱۸۶۰ء صفحات ۸۔ بحوالہ : بلوم ہارٹ (برٹش

میوزیم) ک ۲۴۹۔

(ب) "معہ چوہے نامہ" مصنفہ : ولی محمد نظیر' مطبوعہ دہلی' ۱۸۷۷ صفحات ۴۔ بحوالہ : بلوم ہارٹ (انڈیا آفس) ص ۱۵۴۔

(ج) "چوہوں کا اچار" مصنفہ : ولی محمد نظیر' مطبوعہ دہلی ۱۸۵۱ء صفحات ۸۔ بحوالہ : ایضا" ان تینوں کی مزید اشاعتوں کے لئے : ایضا" ص ۱۵۷۔

۳۴۔اس کی متعدد قدیم اشاعتوں کا ذکر مسعود حسن رضوی ادیب۔ "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" (لکھنؤ' ۱۹۶۷ء) ص ۵۸ ۔ ۶۸ میں ہے۔

۳۵۔قرآن و تجوید پر محمد ظہیر الدین بلگرامی کی تصنیف جسے انہوں نے ۱۲۸۴ھ ر ۸ ۔ ۱۸۶۷ء میں لکھا' منزوی' ص ۱۷۱۲' آربری (ص ۵۱۸) نے اس کے مصنف کا نام محمد ظہیر الدین خان تحریر کیا ہے۔ یہ لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء میں اور کانپور سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی۔ اسٹوری' ص ۵۶۔

۳۶۔ اشاعت اول : مطبع نو لکشور' لکھنؤ' ۱۲۸۷ھ ر ۱۸۷۰ء۔

اشاعت دوم : مطبع نو لکشور' کانپور' ۱۲۹۱ھ ر ۱۸۷۴ء بحوالہ ایضا" و نیز عارف نوشاہی' ص ۱۹۶۔

۳۷۔۱۱۶۷ھ ر ۱۷۵۳ء ۔ ۱۲۳۰ھ ر ۱۸۱۵ء ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ ر ۱۷۰۳ء ۔ ۱۱۷۶ھ ر ۱۷۶۲ء) سے ماخوذ ہو گا۔

۳۸۔۱۱۶۳ھ ر ۱۷۴۹ء ۔ ۱۲۳۳ھ ر ۱۸۱۷ء' شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند جن کا ترجمہ قرآن پہلی مرتبہ اسلام پریس کلکتہ سے ۱۲۵۴ھ ر ۱۲۵۶ھ میں شائع ہوا۔ مولوی عبدالحق "پرانی اردو میں قرآن کے ترجمے اور تفسیریں" مشمولہ "اردو" (اورنگ آباد' جنوری ۱۹۳۷ء) ص ۱۸۔

۳۹۔ ان دونوں حضرات کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔

۴۰۔ معروف مجموعہ احادیث' جن میں "بخاری' مسلم' موطا' جامع ترمذی' سنن ابوداؤد اور نسائی" شامل ہیں۔

۴۱۔ شہاب الدین احمد بن علی الخطیب' قسطلانی (۸۵۲ھ ر ۱۴۴۸ء ۔ ۹۲۳ھ ر ۱۵۱۷ء) شافعی عالم۔ یہاں ان کی عربی شرح "صحیح بخاری' ارشاد الساری" سے مراد ہے' جو پانچ

جلدوں میں نو لکشور لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ عبدالرحیم، ص ۴۲۔

۴۲۔ شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۹ھ / ۱۴۴۵ء) کی ضخیم تفسیر قرآن، جو ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اسٹوری جلد اول ص ۱۰، قلمی نسخوں اور ماخذ کے لئے منزوی، جلد ۱ ص ۱۳۶ - ۱۳۷۔

۴۳۔ امام غزالی (۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء - ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) کی تصوف میں معروف تصنیف ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں یہ لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی سرکیس، ک ۱۴۰۹۔ "مذاق العارفین" کے نام سے اس کا اردو ترجمہ محمد احسن نانوتوی (متوفی ۱۸۹۵ء) نے کیا تھا، جسے مطبع نو لکشور لکھنؤ نے چار جلدوں میں ۱۸۶۴ء - ۱۸۷۹ء میں شائع کیا تھا۔ محمد ایوب قادری "مولانا محمد احسن نانوتوی" (کراچی، ۱۹۶۶ء) ص ۱۳۵ - ۱۳۶، یہ ترجمہ ۱۸۷۵ء میں بھی شائع ہوا۔ خلیق احمد نظامی، تصنیف مذکور ص ۲۰۲۔

۴۴۔ برہان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی (متوفی ۵۹۳ھ / ۱۱۹۷ء) کی فقہ حنفی میں معروف تصنیف۔ مطبع نو لکشور کی اشاعت کلکتے کے مطبوعہ نسخے سے منقول تھی۔ عارف، ص ۱۰۹۹ - ۱۱۰۰ء۔

۴۵۔ اورنگ زیب عالمگیر (۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۸ء - ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء) کی ایما پر فقہاء کی ایک جمعیت کا مرتبہ مجموعہ فتاوی، جسے فقہ حنفی میں اعتبار حاصل ہے۔ یہ ۱۰۷۵ھ / ۱۶۶۴ء اور ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء کے عرصے میں مرتب ہوا۔ تفصیلات کے لئے: زبید احمد تصنیف مذکور، ص ۷۲- ۷۳، محمد اسحاق بھٹی "برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ" (لاہور، ۱۹۷۳ء) ص ۳۴۵ - ۳۶۴، و نیز J. SCHACHT
"ON THE TITLE OF FATAWA AL - ALAMGIRIYYA."
مشمولہ "IRAN AND ISLAM" مرتبہ C.E. BOSWORTH (ایڈنبرا، ۱۹۷۱ء) ص ۴۷۵- ۴۷۸۔

۴۶۔ اس کتاب کی صراحت نہیں ہوتی۔ اس نام کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کا ذکر عبدالقادر سروری "فہرست اردو مخطوطات کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ" (حیدر آباد، ۱۹۴۹ء) ص ۵۹- ۶۰ اور ایک اور کتاب کا ذکر "قاموس" ص ۲۷۸ میں ملتا ہے۔

۴۷۔ سیرت رسول اکرم پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ / ۱۵۵۱ء - ۱۰۵۲ھ

۱۴۴۲ء) کی تصنیف۔ یہ اولاً" مطبع مظہر العجائب لکھنؤ سے ۱۲۷۱ھ - ۱۲۷۴ھ ر ۱۸۵۴ء - ۱۸۵۸ء میں (بحوالہ : آربری ص ۲۷۵) اور پھر مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۸۶۷ء اور پھر ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ بحوالہ : اسٹوری ص ۱۹۵' اس کے قلمی نسخوں اور مزید اشاعتوں کے لئے منزوی' ص ۸۲۸ - ۸۲۹۔

۴۸۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف' جس کا بڑا حصہ مدینہ منورہ کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۲۸۶ھ ر ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ قبل ازیں یہ کلکتے سے ۱۲۶۳ھ ر ۱۸۴۷ء اور ۱۲۷۳ھ ر ۱۸۵۷ء نیں بھی چھپ چکی تھی۔ بحوالہ : عارف ص ۸۳۸۔

۴۹۔ اصل نام "مواہب العلیہ"" کمال الدین حسین واعظ کاشفی (متوفی ۹۱۰ھ ر ۱۵۰۴ء) کی تفسیر قرآن حکیم' جو ۸۹۷ھ ر ۱۴۹۱ء اور ۹۰۲ھ ر ۱۴۹۶ء کے دوران تصنیف ہوئی۔ فارسی کی متعدد اشاعتوں کے لئے : عارف ص ۱۹۲ - ۱۹۳' ۱۰۶۵ - ۱۰۶۷' اس کا غالباً" اولین اردو ترجمہ بعنوان "تفسیر قادری" دو جلدوں میں مطبع نو لکشور سے ۱۲۹۶ھ - ۱۲۹۸ھ ر ۱۸۷۹ء - ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۴۳۹' ۶۵۸۔ بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم' ضمیمہ) ک ۱۷۷' مزید اردو تراجم کے لئے : ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین " قرآن حکیم کے اردو تراجم" (کراچی' سنہ ندارد) ص ۲۱۵۔

۵۰۔ مجموعہ احادیث' جسے رضی الدین حسن بن محمد صغانی (۵۷۷ھ ر ۱۱۸۱ء - ۶۵۰ھ ر ۱۲۵۲ء) نے مرتب کیا تھا۔

۵۱۔ اصلاً" وقایتہ الروایہ فی مسائل الہدایہ" مصنفہ : عبید اللہ المحبوبی (متوفی غالباً" ۶۳۰ھ ر ۱۲۳۲ء کی شرح' جسے اس کے پوتے عبیداللہ بن مسعود (متوفی ۷۴۷ھ ر ۱۳۴۶ء) نے تحریر کیا۔ یہ مطبع نو لکشور لکھنؤ سے دو جلدوں میں ۱۲۹۰ھ ر ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ عارف ص ۲۴۹۔ ۲۵۰ یہاں دیگر اشاعتوں کا ذکر بھی ہے۔

۵۲۔ مسائل و مناسک حج پر مشتمل تصنیف' جس کا اصل نام غایتہ الشعور بحج الحج المبرور" ہے مصنف نامعلوم ' لیکن کلکتے سے ۱۲۸۳ھ ر ۱۸۶۶ء میں اس کی اولین اشاعت کے وقت وہ زندہ تھا۔ مطبع نو لکشور لکھنؤ سے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۹۰ھ ر ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ جس پر تقریظ محمد ظہیرالدین بلگرامی نے تحریر کی۔ تفصیلات کے

لئے: آربری، ص ۱۳۲، عارف ص ۴۰، عبدالرحیم ص ۱۵۸۔

۵۳۔ تفسیر القرآن جسے عبداللہ بن محمد البعناوی (متوفی ۲۶۱ھ ر ۸۷۴ء) اور نے تحریر کیا تھا۔ یہ "انوار التنزیل و اسرار التاویل" کے نام سے بھی معروف ہے۔ لکھنؤ و بمبئی سے ۱۲۷۷ھ ر ۱۸۵۹ء اور ۱۲۸۲ھ ر ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔ سرکیس ک ۶۱۸۔

۵۴۔ مجموعہ احادیث۔ متن کے مرتب مسلم بن حجاج قشیری (متوفی ۲۶۱ھ ر ۸۷۴ء) اور شرح "المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج" کے مصنف ابو زکریا یحیٰی بن شرف النوی (متوفی ۶۷۶ھ ر ۱۲۷۷ء) ہیں۔ مطبع نو لکشور کی اشاعتوں کی تفصیلات دستیاب نہیں، ویسے "صحیح مسلم" کلکتے سے دو جلدوں میں مولوی عبدالرحیم بن عبدالکریم صفی پوری کے تحشیہ و تصحیح کے ساتھ ۱۲۶۵ھ ر ۱۸۴۸ء میں اور دہلی سے مع "شرح نووی" ۱۳۰۱ھ ر ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی "فہرست مشروح" حصہ اول ص ۴۹۷، ۵۳۰ ۔ ۵۳۱

۵۵۔ محمد بن اسمٰعیل بخاری (۱۹۴ ر ۸۱۰ء ۔ ۲۵۶ ر ۸۷۰ء) کا مرتبہ معروف مجموعہ احادیث:

"صحیح بخاری الجامع الصحیح"۔۔۔ یہ بمبئی سے ۱۲۶۹ھ ر ۱۸۵۳ء میں اور دہلی سے ۱۲۷۰ھ ر ۱۸۵۴ء اور ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔ سرکیس، ک ۵۳۵، ان کے علاوہ بمبئی سے اس کے نصف اول کی اشاعت ۱۲۶۸ھ ر ۱۸۵۲ء میں مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۶۸ھ ر ۱۸۵۲ء میں مولوی احمد علی سہارنپوری (متوفی ۱۲۹۷ھ ر ۱۸۷۹ء) کی تصحیح کے ساتھ اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ میرٹھ سے ۱۲۸۳ھ ر ۱۸۶۷ء میں اور بعد ازاں دو جلدوں میں لکھنؤ (غالباً" مطبع نو لکشور) سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں شائع ہونے کی تفصیلات ملتی ہیں۔" فہرست مشروح ۔ ۔ ۔ "جلد اول، ص ۵۰۱ ۔ ۵۰۲ اس کی شرح "ارشاد الساری" کی اشاعت کا ذکر درج بالا ۴۱ کے تحت ہو چکا ہے۔

۵۶۔ دس جلدوں میں اس اشاعت کی سند نہیں مل سکی۔

۵۷۔ "مشارق الانوار" بہ ذیل بالا ۵۰، و نیز اس کا اردو ترجمہ خرم علی بلہوری (متوفی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) نے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں کیا تھا، جو متعدد بار شائع ہوا۔ اس کی اولین اشاعت مطبع محمدی لکھنؤ سے ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں ہوئی۔ بحوالہ محمد ایوب قادری "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" (لاہور، ۱۹۸۸ء) ص ۱۵۹، پھر یہ کانپور سے

۱۸۵۲ء میں اور مطبع محمدی بمبئی سے ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں اور ۱۸۷۵ء میں اور مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔ تفصیلات اور مزید اشاعتوں کے لئے ۔ بلوم ہارٹ (انڈیا آفس) ص ۲۵۹' ایضا" (انڈیا آفس' ضمیمہ) ص ۱۰۷' بلوم ہارٹ (برٹش میوزیم' ضمیمہ) ک ۱۹۷' "قاموس" ص ۱۳۸۔۱۳۹۔

۵۸۔ یہ دراصل "مجموعہ و اقدی" ہے' جو یہاں مذکور تین کتب بشمول "مغازی الرسول" پر مشتمل ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی (۱۳۰ھ/۷۴۷ء ۔ ۲۰۷ھ/۸۲۲) سے منسوب ہے۔ تفصیلات کے لئے ۔ حاجی خلیفہ "کشف الفنون" جلد دوم (استنبول' ۱۹۴۳ء) ک ۱۹۰۸ء ان کی مشترکہ اشاعت مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ "فہرست مشروح ۔ ۔ " حصہ اول' ص ۲۸۶' ان کے تراجم اردو میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئے۔ "قاموس" ص ۷۸۰' ۷۸۶' ۷۸۸ بعد میں یہ مجموعہ "فتوحات و اقدی" کے نام سے جعفر علی نگینوی کے ترجمہ و تصحیح کے بعد شائع ہوئے۔ "فہرست کتب کلاں' تیج کمار بک ڈپو' یعنی نو لکشور پریس لکھنؤ و کانپور کا نایاب علمی ذخیرہ کتب" (لکھنؤ' ۱۹۵۲ء) ص ۱۸۔

۵۹۔ "مختصر الوقایہ" (ملاحظہ فرمایئے' درج بالا ۵۱) کی شرح' جسے شمس الدین محمد خراسانی القوہستانی (متوفی ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء) نے ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں تصنیف کیا۔ سرکیس' ک ۱۵۳۳' یہ کلکتہ سے ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۷ء میں اور لکھنؤ سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ ایضا"' نیز فہرست مشروح ۔ ۔ ۔ حصہ دوم ص ۱۵۰۔

۶۰۔ اس اشاعت کی تفصیلات دستیاب نہیں۔

۶۱۔ علامہ جاراللہ زمخشری (۴۶۷ھ/۱۰۷۴ ۔ ۵۳۸ھ/۱۱۴۳ء) کی تصنیف "حقائق التنزیل کا خلاصہ' جو لکھنؤ (مطبع نو لکشور) سے ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں شائع ہوا۔ سرکیس' ک ۹۰۳۔

۶۲۔ "الکشاف عن حقائق التنزیل" زمخشری (مذکورہ بالا) کی تفسیر قرآن' جو قبل ازیں کلکتے سے دوو جلدوں میں ۱۸۵۶ء۔۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ ایضا"' ک ۹۷۵' مطبع نو لکشور سے اس کی اشاعت کی تفصیلات دستیاب نہیں۔

۶۳۔ فقہ حنفی کا مشہور و متداول متن' جسے ابوالبرکات نسفی (متوفی ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) نے

مرتب کیا تھا۔ اولاً" یہ کتاب مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں، اور مطبع محمدی دہلی سے ۱۸۷۰ء میں اور پھر مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ آربری، ص ۲۴۰ و نیز "فہرست مشروح" حصہ دوم۔ ص ۱۸۲۔

۶۴۔ جمال الدین محمد طاہر پٹنی (۹۱۳ھ/۱۵۰۱ء۔۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء) کی آیات قرآن اور احادیث کی تشریحات پر مشتمل مشہور تصنیف "مجمع بحارالانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار" جو لکھنؤ (مطبع نو لکشور) سے اولاً" ۱۲۶۸ھ/۱۸۶۱ء اور پھر ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ سرکیس، ک ۱۷۱۔

۶۵۔ " تحفۃ العجم" کے نام سے یہ ترجمہ سلطان محمد خاں نے کیا تھا، جو مطبع نو لکشور لکھنؤ سے کئی بار شائع ہوا۔ "فہرست کلاں" ص ۹۰، اس کا ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء کا ایڈیشن " کتب خانہ آصفیہ" حیدر آباد دکن میں موجود تھا۔ "قاموس" ص ۲۵۳، بعض دیگر تراجم کا ذکر محمد ایوب قادری "مولانا احسن نانوتوی " ص ۶۱، ۷۸، ۱۳۷-۱۳۹ میں ہے۔ اس کے فارسی تراجم کے لئے۔ عارف ص ۲۳۸-۲۳۹، ۱۰۹۳-۱۰۹۴۔

۶۶۔ یہ ترجمہ خواجہ عبدالمجید نے "منہاج النبوۃ" کے نام سے کیا تھا، جو مطبع نو لکشور لکھنؤ سے ۱۸۸۹ء میں بھی شائع ہوا۔ "قاموس" ص ۱۳۷ اصل فارسی متن کی اشاعتوں کا ذکر درج بالا ۴۷ کے تحت کیا گیا ہے۔

۶۷۔ تصنیف کردہ علامہ بدرالدین عینی (متوفی ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء) سات جلدوں پر مشتمل "ہدایہ" (تفصیل کے لئے درج بالا ۴۴) کی شرح۔ تفصیلات کے لئے عبدالرحیم، ص ۸۲-۸۳، ۸۷، "فہرست مشروح" حصہ دوم، ص ۱۷۲-۱۷۴ یہ چار جلدوں میں لکھنؤ (مطبع نو لکشور) سے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ "فہرست کتب" عربی و فارسی و اردو، مخزونہ کتب خانہ آصفیہ" (حیدر آباد دکن، ۱۳۴۷ھ) ص ۴۳۶۔

۶۸۔ علامہ ابن ہمام (۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء - ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء) کی فقہ حنفی پر تصنیف۔ تفصیلات کے لئے عمر رضا کحالہ "معجم المولفین" جلد ۱۰ (بیروت، ۱۹۵۷ء) ص ۲۶۴۔ اس کی اشاعت لکھنؤی کی تفصیل دستیاب نہیں۔

۶۹۔ اس فہرست کی تفصیلات نہ مل سکیں۔

۷۰۔ خاوند شاہ ایرانی معروف بہ میر خوند (۸۳۶ھ / ۱۴۳۲ء - ۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء) کی تاریخ

انبیاء و خلفاء و سلاطین ۔ مطبع نو لکشور لکھنؤ سے یہ ۱۸۷۴ء اور ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخوں اور مزید اشاعتوں کے لئے اسٹوری، ص ۹۴-۹۵، منزوی، ص ۵۲۲-۵۳۵، آربری ص ۴۲۵، ۴۲۶، واجد علی شاہ کے حکم سے سعادت خاں ناصر (مصنف "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" نے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں اس کا ترجمہ "روضۃ الصفا" کے نام سے اردو میں کیا تھا۔ تفصیلات کے لئے مسعود حسن رضوی ادیب "شاہان اودھ کا علمی و ادبی ذوق" ص ۱۹۹، نیز مشفق خواجہ، مقدمہ "تذکرۂ خوش معرکہ، زیبا" جلد اول (لاہور، ۱۹۷۰ء) ص ۳۲۔

۷۱۔ قبل ازیں یہ بمبئی سے ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۰ء میں آربری، ص ۴۲۵ اور پھر ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی۔ اسٹوری، ص ۹۵۔

۷۲۔ مراد واجد علی شاہ سے ہے، جو اودھ پر ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۶ء تک حکمراں رہے۔ امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء - ۱۸۴۷ء) کے فرزند تھے۔ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔ ۱۸۵۶ء میں الحاق اودھ کے بعد کلکتے میں بحیثیت وظیفہ یاب رہے اور وہیں فوت ہوئے۔ اردو و فارسی میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ شاعر بھی تھے۔ تخلص اختر تھا۔ حالات اور ادبی و علمی خدمات پر متعدد ماخذ میں سے مسعود حسن رضوی "سلطان عالم واجد علی شاہ۔ ایک تاریخی مرقع" (لکھنؤ ۱۹۷۷ء) زیادہ ہمہ جہت و معلوماتی ہے۔

۷۳۔غالباً "تفسیر زاد الآخرہ منظوم" مراد ہے، جو قاضی عبدالسلام عباسی محدث بدایونی (۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء - ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے نظم کی تھی۔ مطبع نو لکشور لکھنؤ سے یہ ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ "قاموس" ص ۶۷، و نیز محمد رضی الدین بسمل "تذکرۃ الواصلین" (بدایوں، ۱۹۰۰ء) ص ۲۵۲-۲۵۳۔

۷۴۔امام غزالی کی تصنیف "احیاء العلوم" کا خلاصہ ۔ مطبع نو لکشور لکھنؤ سے یہ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ "فہرست کتب سید علی بلگرامی" ص ۸۰۔

۷۵۔یہ ترجمہ مولانا فخر الدین فرنگی محلی (متوفی ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) نے کیا تھا، مطبع نو لکشور لکھنؤ سے یہ ۱۸۹۰ء میں بھی شائع ہوا۔ سجاد مرزا بیگ "الفہرست" (حیدر آباد دکن، ۱۹۲۳ء) ص ۶۸۔

۷۶۔ ان دونوں کا ذکر درج بالا ۷۴ اور ۶۹ کے تحت کیا گیا ہے۔

(مطبوعہ "تحقیق" شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی
شمارہ ۷، ۱۹۹۳ء)

اضافات

تعلیق نمبر (۵) کے ذیل میں ظہیر الدین بلگرامی کی تصانیف کے ضمن میں "فہرست کتب موجودۂ مطبع نو لکشور واقع لکھنؤ کانپور" (مطبوعہ ۱۸۷۴ء) سے یہ مزید اطلاع ملتی ہے۔

"اسرار کربلا" منشی محمد ظہیر الدین خان بہادر بلگرامی نے اس کتاب میں حالات معرکہ کربلائے معلّٰی بروایت احادیث معتبرہ درج کیے ہیں۔ ص ۳۸۔

"اسرار محبت" کتاب پاکیزہ خیالات من تصنیفات دبیر الانشاء مولوی محمد ظہیر الدین صاحب بہادر سے ہے۔ ص ۴۳۔۴۴

"اسرار غفلت" تصنیف فاضل اجل دبیر الانشاء جناب منشی محمد ظہیر الدین خان بہادر بلگرامی۔ حسب فرمائش جناب نواب میر غلام بابا خان صاحب رئیس سورت و بتحریک مشفق منشی میاں داد خاں سیاح رفیق جناب ممدوح ایشان۔ ص ۴۵۔

مذکورہ بالا "فہرست کتب" میں ظہیر بلگرامی کی ان مزید تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔

"مرامعہ قضا و قدر" از منشی محمد ظہیر الدین بلگرامی حال رئیس لکھنؤ و مدرس اول کیننگ کالج نے مناظرۂ روح و نفس نہایت خوب بیان کیا ہے، ص ۳۱۔

"مرثیہ ظہیر" ص ۴۵۔

"مرثیہ ظہیر فارسی" مصائب اہلبیت میں منشی محمد ظہیر الدین صاحب نے تصنیف فرمایا ہے۔ ص ۴۷۔

"فہرست کتب ردیف وار نو لکشور پریس لکھنؤ" میں کالم "زبان و فن کتاب" کے تحت "اسرار غفلت" (فارسی) "اسرار محبت" (فارسی، تصوف مذہب اسلامیہ) "اسرار کربلا" (اردو) درج ہے۔ ص ۱۹، ۲۱۔

دیگر تصانیف میں فن موسیقی کے تعلق سے ایک تصنیف "ماہیت الغنا" کا نام بھی ملتا ہے، جو مسعود حسن رضوی کے مطالعہ میں رہی، بحوالہ "سلطان عالم واجد علی شاہ" (لکھنؤ ۱۹۷۷ء) ص ۱۳۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے "تاریخ لکھنؤ" بھی تحریر کی تھی، جس کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ رضا لائبریری رامپور میں نمبر شمار ۱۵۲۳ کے تحت موجود ہے۔ اوراق ۲۲۳۔ بحوالہ فہرست مخطوطات اردو رضا لائبریری رامپور "مرتبہ۔ شعائر اللہ خاں وجیہی، مشمولہ۔ رامپور رضا لائبریری جرنل" شمارہ ۲ (۱۹۹۵ء) ص ۳۵۸۔

(۷) کے تحت گراہم شا کی اہم تصنیف "Printing In Calcutta to 1800" (مطبوعہ۔ لندن، ۱۹۸۱ء) کا حوالہ دیا گیا تھا، لیکن اسی فاضل محقق نے اس موضوع کو بے حد وسعت دے کر ایک بہت ضخیم اور نہایت وقیع کتابیات

"South Asia, A Retrospective Biblio graphy- Vol 1" مرتب کی ہے، جو لندن سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۴۵) کے ذیل میں مولوی محمد شفیع "مقالات شفیع" جلد چہارم (لاہور، ۱۹۷۲ء) کا حوالہ مبیضہ میں کسی وجہ سے شامل نہیں ہو سکا تھا، یہ اس لئے اہم ہے کہ اس میں معاصر اسناد پیش کی گئی ہیں۔

(۵۲) کے تحت تصنیف "غایۃ الشعور بج الحج المبرور" کا مصنف نامعلوم لکھا گیا تھا، لیکن یہ مولوی محمد شاہ کی تصنیف ہے۔ مذکورۂ بالا "فہرست کتب" (۱۸۷۴ء) کے مطابق "حج الحج مسمی بہ غایت الشعور" تصنیف مولوی محمد شاہ صاحب بزبان شستہ محاورات پاکیزہ تاریخ و حالات معتبرہ میں نہایت مستند ہے۔ ایک مرتبہ یہ کتاب کلکتہ میں چھاپہ حروف ٹیپ طبع ہوئی تھی۔ اب بار دیگر اس طرح طبع ہوئی۔ ص ۴۸۔ "فہرست کتب ردیف وار" میں "زبان و فن کتاب" کے ذیل میں "فارسی، متفرقات" درج ہے، ص ۲۲۳، اس کتاب کے مصنف،

وہی مولوی محمد شاہ (متوفی ۱۸۸۱ء) ہیں جو صدر الدین آزردہ کے شاگرد' نواب صدیق حسن خاں کے معتمد دوست' شاہ اودھ واجد علی شاہ کے متوسل اور ان کے فرزند شاہزادہ فریدوں قدر میرزا محمد ہزبر علی کے استاد سخن ہیں' جن کے بارے میں ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں' لیکن جو دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں۔ مثلاً " وزیرنامہ" تعلیم العبادات" برہان الہ فی تحقیق امرالذبائم" "دیوان ہزبر علی" بھی انہی کا تخلیق کردہ ہے۔ "تذکرہ نگارستان سخن" مصنفہ نورالحسن خاں فرزند نواب صدیق حسن خاں بھی ان ہی کا تصنیف کردہ ہے۔ ان کے حالات و آثار پر راقم نے ایک علیحدہ مقالہ "تذکرۂ نگارستان سخن کا ایک مولف" تحریر کیا ہے۔

("تحقیق" مجلہ شعبہ اردو' سندھ یونیورسٹی
شمارہ ۔ ۸۔۹' ۱۹۹۵ء)

بیتی کہانی

اردو کی اوّلین نسوانی خود نوشت اور تاریخِ پاٹودی کا ایک بنیادی مأخذ

مصنفہ

شہر بانو بیگم

(دختر نواب اکبر علی خاں، رئیس پاٹودی)

مقدمہ اور تعلیقات

معین الدین عقیل

IQBAL:
FROM FINITE TO INFINITE

Evolution of the Concept of Islamic Nationalism in India

Moinuddin Aqeel

پاکستان میں اُردو ادب

محرکات اور رُجحانات کا تشکیلی دور

ڈاکٹر مُعینُ الدّین عقیل

اقبال اور جدید دُنیائے اسلام

مسائل، افکار اور تحریکات

ڈاکٹر معین الدین عقیل

ڈاکٹر مُعین الدین عقیل کی چند علمی و اَدبی کُتب :

- ”کلام رنجور عظیم آبادی“ (رنجور عظیم آبادی کے نادر و غیر مطبوعہ کلام کی اولین اشاعت) مطبوعہ : پٹنہ (بھارت)
- ”بپتی کہانی“ (اُردو کی اولین نسوانی خود نوشت)، مطبوعہ : حیدر آباد
- ”پاکستان میں اُردو تحقیق : معیار اور موضوعات“، مطبوعہ : کراچی
- ”پاکستان میں اُردو اَدب : محرکات اور رجحانات کا تشکیلی دور“، مطبوعہ : کراچی
- ”کلامِ نیرنگ“ (میر غلام بھیک نیرنگ کے حالات و کلام)، مطبوعہ : کراچی
- ”پاکستان میں اُردو غزل“، مطبوعہ : رانچی (بھارت)
- ”اقبال اور جدید دُنیائے اسلام : محرکات، رجحانات اور مسائل“، مطبوعہ : لاہور
- ”تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ“، مطبوعہ : کراچی
- ”مسلمانوں کی جدوجہد آزادی : محرکات، رجحانات اور مسائل“، مطبوعہ : لاہور
- ”دکن اور ایران : سلطنت بہمنیہ اور ایران کے علمی و تمدنی روابط“، مطبوعہ : کراچی
- ”ایک نادر سفر نامہ : دکن کے اہم مقامات کے احوال و کوائف“، مطبوعہ : کراچی
- ”تحریکِ آزادی اور مملکت حیدر آباد“، مطبوعہ : کراچی
- ”تحریکِ پاکستان کا تعلیمی پس منظر“، مطبوعہ : لاہور

الوقار پبلیکیشنز کی اہم مطبوعات

1 - مجموعہ تنقیدات از : پروفیسر آل احمد سرور	مرتبہ : عاصمہ وقار	650/-
2 - نقد غالب	مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد	250/-
3 - کلیات ولی	مرتبہ : پروفیسر نورالحسن ہاشمی	325/-
4 - کلیات ممنون	مرتبہ : ڈاکٹر صدیقہ ارمان	430/-
5 - اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم	از : ڈاکٹر حنیف کیفی	430/-
6 - نقد عبدالحق	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	290/-
7 - بابائے اردو - خدمات اور فرمودات	از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	295/-
8 - لطائف غیبی از غالب	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	90/-
9 - غزل، غالب اور حسرت از : رشید احمد صدیقی	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	120/-
10 - نقوش غالب	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	280/-
11 - فورٹ ولیم کالج از : پروفیسر سید وقار عظیمؒ	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	180/-
12 - اردو ڈرامہ - تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ	از : پروفیسر سید وقار عظیم	395/-
13 - انجمن پنجاب کے مشاعرے	از : عارف ثاقب	290/-
14 - بیسویں صدی کے منتخب افسانے	مرتبہ : ڈاکٹر معراج نیر	280/-
15 - اب دریچوں کو نہ بند رکھنا کبھی (شاعری)	از : جمیل صبا	120/-
16 - اقبال سب کے لئے	از : ڈاکٹر فرمان فتح پوری	380/-
17 - اردو نثر کا فنی ارتقاء	از : ڈاکٹر فرمان فتح پوری	295/-
18 - اردو شاعری کا فنی ارتقاء	از ڈاکٹر فرمان فتح پوری	395/-
19 - اردو افسانہ اور افسانہ نگار	از : ڈاکٹر فرمان فتح پوری	295/-
20 - ادبی جائزے	از : پروفیسر نظیر صدیقی	150/-
21 - نوادرات ادب	از : معین الدین عقیل	
22 - نظیر حسنین کی علمی ادبی خدمات	از : سعدیہ ناز	
23 - حرف سرور (آپ بیتی پروفیسر آل احمد سرور)	مرتبہ : زہرا معین	
24 - فرحت اللہ بیگ کے مضامین (انتخاب)	مرتبہ : ڈاکٹر اسلم پرویز	

معین الدین عقیل

پیدائش اود گیر حیدر آباد میں ہوئی۔ لیکن تعلیم کے تمام مراحل پی ایچ ڈی تک کراچی میں طے کیے۔ "شعبہ اردو جامعہ کراچی" سے منسلک ہیں اور ان دنوں مہمان پروفیسر کی حیثیت میں "جامعہ ٹوکیو برائے مطالعات خارجی" (جاپان) میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قبل ازیں ان کا یہ تعلق "جامعہ علوم شرقیہ" (نیپلز، اٹلی) سے بھی رہا۔ اب تک ۱۷ کتب اور موقر علمی و تحقیقی مجلوں میں ۱۰۰ سے زائد اہم مقالات و مضامین شائع ہو چکے ہیں۔